جنوبی پنجاب اور سرائیکی خطے کے درد کو بیان کرتا ایک
ناول
سرائیکی ٹرمپ
امریکی صدر کے اغوا کی داستان
دہشت گردی کی فضا میں محبت کو بیان کرتا ایک خوبصورت ایکشن اور ایڈونچر ناول
رضوان علی گھمن

کرکٹ کے شائقین کے لئے لاہور میں ہونے والے دوسرے
سپر لیگ کے فائنل میچ پر ایک بہترین ایڈونچر ایکشن ناول

سرائیکی ٹرمپ

پاکستان آرمی، پولیس اور خفیہ اداروں کے ان ہزاروں جوانوں کے نام
جو وطن عزیز کی حفاظت کی خاطر شہید ہو گئے۔۔۔
دھرتی ماں کے ان بیٹوں کے نام جو دھرتی پر قربان ہو گئے۔

رضوان علی گھمن

پیش لفظ

سرائیکی ٹرمپ ناول ایک مکمل طور پر فکشن ناول ہے۔اس میں کسی فرد ادارے یا ملک کی تذلیل نہیں کی گئی ہے۔ ناول میں امریکی اور افغان فورسز کا بھی کافی ذکر ہے۔اس کے علاوہ امریکی صدر کے اغوا کی کاروائی اور کچھ سیاسی معاملات بھی زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ یہ صرف ناول کی دلچسپی کے لئے ہیں۔

سرائیکی ٹرمپ میرا پہلا فکشن ناول ہے اس لئے کافی جگہوں پر غلطی کی گنجائش متوقع ہے۔شاید کچھ پیراگراف سے قارئین متفق نہ ہوں اس کے لئے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔انٹرنیشنل معیار کے ناول لکھنا کافی مشکل کام ہے۔ میری تعلیم بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ چونکہ باپ دادا مزدور تھے اور خود بھی ایک مزدور ہوں۔گھر کے حالات کچھ ایسے تھے کہ زیادہ پڑھ تو نہیں سکا البتہ لکھنے کا شوق تھا اور اسی شوق نے مجھ سے دوسرا خدا، مہاجر، کالا چاند اور چانسلر جیسے ناول لکھوائے جو خلافِ توقع بہت زیادہ مقبول ہوئے اور قارئین میں انٹرنیشنل سطح پر پسند کئے گئے۔

غربت کا یہ عالم تھا کہ کاروں کے شیشے صاف کرنے سے لے کر پلاسٹک اور شیشے کی بوتلیں اٹھانے تک کا کام کر چکا ہوں۔صبح اٹھتا تھا اور سٹیشن پر جا کر دوسرے مزدوروں کے ساتھ مزدوری کی تلاش میں بیٹھ جاتا تھا۔غریب بندے کے لئے پچاس ساٹھ سال تک سسک سسک کر زندگی گزارنا اور پھر خاموشی سے مر جانا، شاید یہی زندگی کی حقیقت ہے اور یہی اس کا مستقبل ہے۔خود غریب ضرور ہوں لیکن ذہن غریب نہیں ہے، خیالات غریب نہیں ہیں۔ لکھنے کا شوق ہے اور اسی لئے ہزار پریشانیوں کے باوجود کبھی لکھنا نہیں چھوڑا۔

سرائیکی ٹرمپ ناول اٹلی کے ایک مہاجر کیمپ میں بیٹھ کر لکھا گیا۔ناول کس قدر اچھا اور معیاری ہے اس کا فیصلہ تو قارئین پڑھنے کے بعد ہی کریں گے۔ ایکشن ناول لکھتے ہوئے بہت سے پیراگراف ایسے بھی لکھنے پڑتے ہیں جن میں سیکورٹی اداروں کو حقیقت کے برعکس کچھ کمزور دکھایا جاتا

ہے۔ یہ صرف ناول کی خوبصورتی کے لئے اور کہانی کو آگے بڑھانے کے لئے ہوتا ہے۔ فتح آخر میں ہمیشہ سچ کی ہی ہوتی ہے۔

میں پاکستانی ہوں اور مجھے اپنے ملک اور اس کے اداروں سے اتنا ہی پیار ہے جتنا کہ ایک عام پاکستانی کو۔۔۔۔۔ناول میں اگر کہیں کوئی بات بری لگے تو میں تہہ دل سے اس کی معافی چاہتا ہوں۔ ناول پسند آئے تو اپنے دوستوں اور چاہنے والوں سے ضرور شیئر کریں اور مجھے اپنے مفید مشوروں سے ضرور نوازیں۔

آپ کی حوصلہ افزائی کا شکریہ!

بشکریہ خبردار ٹیم!

میں خبردار ٹیم کے کپتان آفتاب اقبال اور ان کی پوری ٹیم، خاص طور پر ناصر چنیوٹی کا شکرگزار ہوں۔ انہی کو دیکھ کر مجھے سرائیکی ٹرمپ لکھنے کا خیال آیا۔

رضوان علی گھمن

Facebook: Rizwan Ali Ghuman

Whatsapp: 0049 1122 9099

زندگی جب چھیننے پر آتی ہے تو کبھی کبھی سب کچھ ہی چھین کر لے جاتی ہے۔ میرے پاس تو اس وقت کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ماں، باپ، بہن، بھائی، سب کو ہی طالبان نے مار دیا تھا۔ مجھے گولیوں کا ایک برسٹ لگا تھا اور اس وقت میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا۔ مجھے مارنے والے دہشت گرد نے بہت لمبا برسٹ مارا تھا۔ زیادہ تر گولیاں میرے دائیں بائیں سے گزر گئیں تھیں اور اس برسٹ میں سے صرف پانچ گولیاں ہی میرے حصے میں آئی تھیں۔ ان پانچ گولیوں نے مجھے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ طالبان اپنی طرف سے مجھے اور میرے پورے خاندان کو مار کر واپس چلے گئے تھے لیکن شاید مجھے کچھ سانسوں کی مہلت مل گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ اس بچانے والے نے واقعی اپنی طاقت دکھائی تھی۔ میں تو ابھی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔ میرے علاوہ میری بہن بھی بچ گئی تھی۔ خدا نے اسے بھی بچا لیا تھا۔

ہم تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بنیادی طور پر ہم سرائیکی تھے اور بہاولپور کے ایک دور دراز گاؤں میں رہتے تھے۔ میرے والد گاؤں کے نمبر دار کے ہاں ملازم تھے۔ وہ ان کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ میں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ میری عمر بیس سال اور مجھ سے چھوٹی سولہ سال کی تھی۔ جبکہ دونوں بھائی ابھی چودہ سال کے تھے۔ وہ دونوں جڑواں بھائی تھے۔ سات لوگوں کی اس فیملی کے واحد کفیل ابو تھے۔ نمبر دار کا گاؤں میں ایک احاطہ تھا جس میں اس نے چار دیواری کر کے دو کچے کمرے بنا دیے تھے۔ ہماری فیملی نمبر دار کے اسی گھر میں رہتی تھی۔

میرے والد اَن پڑھ تھے اور انہیں کھیتی باڑی کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا تھا۔ دنیا کی تیز رفتار ترقی میں وہ پیچھے رہ گئے تھے۔ انہوں نے زندگی میں کچھ بھی نہیں بچایا تھا۔ جو کمایا وہ خرچ کر دیا۔ ویسے بھی گاؤں کے کھیتی باڑی کے کام میں کہاں کمائی ہوتی ہے۔ نمبر دار مہینے کا تین ہزار روپیہ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ گندم اور سبزی وغیرہ اس کے ڈیرے سے ہی مل جاتی تھی۔ گھر بھی چونکہ نمبر دار کا تھا اس لئے ہمارا گزارہ آسانی سے ہو جاتا تھا۔ گندم کی کٹائی اور کپاس کی چنائی کے موسم میں ہمارا پورا گھرانہ ہی کام کرتا تھا۔ اسی سے ہمیں اضافی آمدنی ہو جاتی تھی جس سے سبھی بچوں کے سکول کے اخراجات نکل آتے تھے۔ ابو سب کو تعلیم دلا رہے تھے۔ وہ تو حالات کی وجہ سے پڑھ نہیں سکے تھے لیکن انہوں نے اپنی اولاد کو اس چیز سے محروم نہیں رہنے دیا تھا۔

ہائی سکول ہمارے گاؤں سے تین کلومیٹر دور تھا۔ یہ ہمارے علاقے کی یونین کونسل تھی اور یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کا علیحدہ علیحدہ ہائی سکول تھا۔ میری دونوں بہنوں اور میں نے ادھر سے ہی ہائی سکول کا امتحان پاس کیا تھا۔ کالج شہر میں تھا اور شہر ہمارے گاؤں سے بہت دور تھا۔ میں روزانہ بس پر آنے جانے کا کرایہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اور میری بہن دونوں نے گھر میں بیٹھ کر پرائیویٹ ہی انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد میں تو گریجویشن کی تیاری کرنے لگا جبکہ میری بہن کسی اچھے رشتے کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ باپ کسی کے کھیتوں میں مزدوری کرتا ہو، اس کے پاس اپنا ذاتی گھر تک نہ ہو تو پھر بیٹی کی خوبصورتی اور تعلیم کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میں اب بڑا ہو گیا تھا اور گھر کے حالات اور بہن بھائیوں کی خواہشات کو سمجھنے لگا تھا۔ اس لئے گھر کے اخراجات کے لئے ابو کا ہاتھ بٹانے کے لئے کوئی کام کرنا چاہتا تھا۔ ابو مجھے منع کر رہے تھے، ان کا ارادہ تھا کہ میں پہلے گریجوایشن کر لوں اس کے بعد کوئی سرکاری نوکری مل جائے گی۔

پاکستان میں سرکاری نوکری سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ دنیا میں اگر جنت کا مزہ اٹھانا ہو تو سرکاری نوکری کر لو۔ آپ جنت میں آ جاؤ گے۔ میرے والد صبح چھ بجے ڈیرے پر چلے جاتے تھے اور پھر وہاں سے ان کی واپسی رات کو آٹھ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ چودہ گھنٹے کی اس جان توڑ مشقت کے بعد انہیں تین ہزار روپیہ ملتا تھا۔ جبکہ ایک پرائمری سکول کا استاد صبح نو بجے سکول جاتا تھا اور سارا دن کرسی پر بیٹھ کر اپنے باقی استادوں سے گپ شپ لگا کر تین بجے واپس گھر آ جاتا تھا۔ چھ گھنٹے کی ڈیوٹی اور ہفتے میں صرف پانچ دن کا کام، اس کے علاوہ سرکاری چھٹیاں، غیر سرکاری چھٹیاں (بیماری، شادی بیاہ) گرمی کی چھٹیاں، سردی کی چھٹیاں، یہ ساری سہولتیں اور تنخواہ تیس ہزار (30,000) پچیس سال مزے کی نوکری کرو اور پھر ساری زندگی گھر میں بیٹھ کر پنشن کھاتے رہو۔ ایک بار بھرتی ہو جاؤ تو پھر ساری زندگی کا آرام۔۔۔ مستقبل کا کوئی فکر نہیں۔

ہماری گورنمنٹ نے سرکاری نوکری کو اس قدر پرکشش بنا دیا ہے کہ بڑے بڑے زمیندار اور دکانوں اور فیکٹریوں کے مالکوں کے بیٹے بھی کاروبار کی بجائے ان نوکریوں کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس پیسہ ہوتا ہے اس لئے بڑی آسانی سے یہ سرکاری نوکری خرید لیتے ہیں۔ فصل خراب ہو سکتی

ہے، کاروبار ڈوب سکتا ہے لیکن سرکاری نوکری میں کوئی نقصان نہیں۔ ایک بار بھرتی ہو گئے تو ملک کے وزیر اعظم کے پاس بھی اتنا اختیار نہیں کہ آپ کو اس نوکری سے فارغ کر سکے۔ کبھی سوچا ہے کہ ایک پولیس کمشنر یا جج کے پاس اتنا پیسہ ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس کا بیٹا کوئی کاروبار کرنے کی بجائے پولیس میں ASI ہی کیوں بھرتی ہوتا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے افسروں کے بیٹے کیوں سرکاری نوکری کرتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ پاکستان میں صرف سرکاری نوکری ہی جنت ہے۔ ہر سال بجٹ میں ان لوگوں کی تنخواہ 30 فیصد ضرور بڑھ جاتی ہے۔

دنیا کا کوئی بھی ملک کبھی بھی سرکاری نوکریوں سے ترقی نہیں کرتا بلکہ ملک ہمیشہ کاروبار سے ترقی کرتے ہیں اور کاروبار ہمیشہ پیسے سے ہوتا ہے۔ اگر پیسے والے یہ لوگ پیسے دے کر سرکاری نوکری کریں گے تو کاروبار کون کرے گا؟ مزدور آدمی کے پاس کھانے کے پیسے نہیں ہوتے وہ کاروبار کیا کرے گا۔ ایک چھوٹی سی کپڑے کی فیکٹری بھی 50 گھروں کا چولہا جلا دیتی ہے۔ جبکہ ایک انسپکٹر 50 گھروں کا ٹیکس کھا جاتا ہے۔ یہی انسپکٹر کسی بڑے گھر کے پیسے والے خاندان کا چشم و چراغ ہوتا ہے۔ جسے رشوت لیتے ہوئے کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسے اپنے خاندان کی طاقت کا پتہ ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خاندان ان بڑے افسروں کو خرید لے گا جو اسے سزا دینے کے مجاز ہوتے ہیں۔ تنخواہیں بڑھانے سے رشوت نہیں رکے گی بلکہ تنخواہیں گھٹانے سے یہ لوگ ہی ختم ہو جائیں گے۔

اگر ایک سرکاری افسر کی تنخواہ ایک مزدور کی تنخواہ کے برابر ہو گی تو یہ بڑے لوگ خود بخود سرکاری ملازمتیں چھوڑ کر کاروبار کی طرف چلے جائیں گے اور ملک سے بے روزگاری بھی ختم ہو جائے گی۔ میری میرے ملک کے وزیر خزانہ سے عرض ہے کہ وہ ایک بجٹ ایسا بھی بنائیں جس میں 30 فیصد تنخواہ بڑھانے کی بجائے 30 فیصد گھٹائیں۔ دو تین سالوں میں ساٹھ ستر فیصد تنخواہ کم ہو گی تو سرکاری نوکری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے لاکھوں بے روزگار نوجوان کاروبار کی طرف جائیں گے اور خود نوکری مانگنے کی بجائے دوسروں کو نوکری دیں گے۔

سرکاری تنخواہوں سے جو ساٹھ ستر فیصد کی کٹوتی ہو گی اسے ملک کے سبھی بوڑھوں کو پنشن دو۔ جو بھی بوڑھا 65 سال سے اوپر ہو جاتا ہے اس کا کھانا پینا گورنمنٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کا بنایا ہوا قانون ہے جسے پورا یورپ فالو کرتا ہے اور پورا یورپ ہی بڑھاپے کی فکروں سے آزاد مزے سے زندگی گزارتا

ہے۔ یہ گورنمنٹ کا کام ہے۔ بینظیر انکم سپورٹ پروگرام، لیپ ٹاپ سکیم، نیلی ٹیکسی اور پیلی ٹیکسی سے غربت ختم نہیں ہوتی۔ آپ ملک کے سبھی 65 سال سے اوپر بوڑھوں کا اندراج کریں اور انہیں ماہانہ پنشن دیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ان کو ماہانہ دس ہزار دینا شروع کردیں بلکہ آپ صرف قانون بنائیں اور بے شک ماہانہ 100 روپیہ ہی دیں۔ اس میں برکت خود بخود ہی آ جائے گی۔ جیسے جیسے ملک ترقی کرے گا یہ پنشن بھی ترقی کرتی جائے گی اور خود بخود ہی سو سے بڑھ کر ہزار دو ہزار سے بھی اوپر چلی جائے گی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے شاید روڈ اور پل بھی بنائے ہوں، ان کا کسی کو نہیں پتا لیکن ان کا بنایا ہوا آئین اور قانون انہیں آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ستر سال سے زیادہ ہو گئے ہیں ملک کو بنے ہوئے اور بیسیوں اس ملک میں صدر اور وزیراعظم ہو کر گزر گئے ہیں۔ عوام ان میں سے کتنوں کو جانتی ہوگی؟ مشکل سے دس بارہ کو۔۔ اور بھٹو کو پورا پاکستان جانتا ہے۔ میٹرو اور پلوں کو لوگ بھول جاتے ہیں۔ یہ اچھے قانون ہی ہوتے ہیں جنہیں عوام صدیوں تک یاد رکھتی ہے۔

میری اس ملک کے حکمرانوں سے اپیل ہے کہ وہ لیڈر بنیں۔ حکمرانی تو آج ہے کل چلی جائے گی، لیڈر کبھی نہیں مرتے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور اسے حضرت عمرؓ کے اس قانون کی سخت ضرورت ہے۔ اگر یورپ اس قانون کو اپنا سکتا ہے تو پاکستان کیوں نہیں۔ مدینہ کے اندر بنا ہوا یہ قانون مدینۂ ثانی میں کیوں نہیں لاگو ہو سکتا؟ میں اب دوبارہ کہانی کی طرف آتا ہوں۔

گھر میں میری ایک بہن شادی کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی تھی تو دوسری بہن بھی تیزی سے جوان ہو رہی تھی۔ پاکستان میں تو سولہ سال کی لڑکی جوان ہو چکی ہوتی ہے۔ میری دونوں بہنیں ہی جوان ہو چکی تھیں لیکن ہمارے گھر کی غربت ان کی شادیوں میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ یہاں بہاولپور میں تو کوئی فیکٹری یا کارخانہ وغیرہ بھی نہیں تھا۔ یہاں صرف کھیتی باڑی کا ہی کام تھا اور اس کی بھی زیادہ سے زیادہ تنخواہ پانچ ہزار تک تھی۔

میں کراچی جا کر کسی فیکٹری میں کام کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہاں مزدوری زیادہ ملتی تھی۔ کسی بھی فیکٹری کی سنگل شفٹ میں کام کی تنخواہ تقریباً پندرہ ہزار کے قریب بن جاتی تھی۔ پانچ ہزار میں کمرے کا کرایہ اور کھانا وغیرہ نکل آتا تو پیچھے آرام سے 10 ہزار روپیہ بچ جاتا تھا۔ ہمارے گاؤں کے دولڑکے کراچی میں کام کر رہے تھے اور وہ دس دس ہزار روپیہ ماہانہ گھر بھیج رہے تھے۔ دس ہزار بہت بڑی رقم ہوتی ہے، خاص طور پر ہم جیسوں

کے لیے جنہوں نے زندگی میں کبھی دس ہزار اکٹھا نہیں دیکھا تھا بلکہ میں نے آج تک اپنے گھر میں پانچ ہزار بھی نہیں دیکھا تھا۔

میری امی کے پاس بہت چھوٹی چھوٹی سونے کی بالیاں تھیں۔ یہ میری دادی کی تھیں جو شادی کے وقت امی کو پہنائی گئی تھیں۔ ہمارے گھر میں یہی سب سے قیمتی چیز تھی۔ میں کراچی جا کر مزدوری کرتا تو ہمارے گھر کے حالات تھوڑے ٹھیک ہو جاتے۔ بہنوں کی شادیوں کے لیئے تھوڑے پیسے اکھٹے ہو جاتے تو ان کی شادیاں آسانی سے ہو جاتیں اور وہ اپنے اپنے گھروں کی ہو جاتیں۔ باقی ہم تینوں بھائی تھے۔ ہماری زیادہ پرابلم نہیں تھی۔ سوچ تو میری ٹھیک تھی لیکن ابو نہیں مان رہے تھے۔ وہ مجھے کراچی جیسے بڑے شہر میں بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ میں پہلے گریجوایشن کرلوں اس کے بعد ادھر ہی کسی دکان پر بیٹھ جاتا اور کام بھی کرتا رہتا اور ساتھ ساتھ نوکری کے لیئے بھی اپلائی کرتا رہتا۔ میں نے ابو کی بات مان لی تھی اور پوری جانفشانی سے گریجوایشن کی تیاری کرنے لگا۔

حالات ٹھیک ٹھیک چل رہے تھے۔ انسان بہت کچھ سوچتا ہے، مستقبل کے لمبے لمبے پلان بناتا ہے لیکن قسمت کے آگے ہار جاتا ہے۔ جبکہ قدرت کچھ اور ہی پلان بنا رہی ہوتی ہے۔ قدرت کا پلان جب بنتا ہے تو انسان کی سبھی تدبیریں اور پلان فیل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے گھرانے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

کپاس کی فصل پچھلے دو سال سے نقصان میں جارہی تھی۔ یہی حال سبزی کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ فصل پک کر تیار ہوتی تھی تو ریٹ انتہائی نیچے گر جاتا تھا۔ کم پانی کی وجہ سے کپاس کی فصل ویسے ہی بہت کم ہوتی تھی اور اوپر سے گورنمنٹ کا کوئی بھی کنٹرول ریٹ نہ ہونے کی وجہ سے جب فصل پک کر تیار ہوتی ہے تو فصل کا ریٹ اچانک نیچے گر جاتا ہے اور اگلے چار مہینے تک نیچے ہی رہتا ہے۔ کپاس کی چنائی سردیوں میں ہوتی ہے۔ سردیوں میں اوس پڑنے کی وجہ سے کپاس میں نمی ہوتی ہے۔ اس نمی کی وجہ سے کپاس کو گھر میں زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ یہ گل جاتی ہے اور آگ لگنے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے کسان کم ریٹ پر ہی اسے بیچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

سات مہینے میں پک کر تیار ہونے والی اس فصل کو تین بار کھاد اور سات بار سیرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بار پودوں کو اکھاڑنا (ورلی کرنا) اور دوبارہ گوڈی ہوتی ہے۔ فصل جب پک جاتی ہے تو اس کی چنائی کے لئے مزدور کم پڑ جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کپاس کی چنائی کا سیزن تقریباً تین مہینے

رہتا ہے اور ان تین مہینوں میں بہاولپور کے تقریباً سبھی گاؤں دن کو خالی ہی ملتے ہیں۔ کسان لوگوں کے گھروں میں جا کر منتیں کر کے عورتوں اور بچوں کو لے کر جاتے ہیں اور کپاس کی چنائی کرواتے ہیں۔ صرف تین مہینے اس سیزن سے پورے سال کا خرچہ نکل آتا ہے۔

امریکہ کی آبادی کا چودہ فیصد حصہ افریقی کالوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ کالے ہیں جو سترہویں اور اٹھارویں صدی میں غلام بنا کر امریکہ میں لا کر بیچے گئے۔ ان غلاموں سے کپاس کی چنائی کروائی جاتی تھی۔ اس دنیا میں صرف کپاس ہی وہ واحد فصل ہے جسے سب سے زیادہ مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیجائی سے لے کر چنائی تک اسے ہر مرحلے پر مزدور کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ ملک میں بے روزگاری کی شرح کو کم کرتی ہے۔ گورنمنٹ کا کنٹرول ریٹ نہ ہونے کی وجہ سے فیکٹری مالکان کپاس کا ریٹ گرا دیتے ہیں۔ کسان کو منافع کی بجائے نقصان ہو جاتا ہے اور وہ کپاس کی بجائے کوئی اور فصل بیجنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس بار پھر کپاس کا ریٹ نیچے گرا تو نمبر دار کے پاس اگلی فصل بیجنے کے پیسے بھی نہ رہے۔ اس نے ساری زمین ٹھیکے پر (کرایہ پر) دے دی اور ابو کو کام سے جواب دے دیا۔ ٹھیکے دار کو ملازم کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ خود ہی زمین پر کام کرتا تھا۔ نمبر دار کو پچھلے دو سال سے مسلسل نقصان ہو رہا تھا۔ اس کے اوپر کافی قرضہ چڑھ گیا تھا۔ اس نے قرضہ چکانے کے لئے وہ گھر بیچ دیا جس گھر میں ہم رہ رہے تھے۔ ہم لوگ اچانک ہی سڑک پر آ گئے۔ ابو دس پندرہ دنوں تک آس پاس کے دیہاتوں میں جا کر کام کا پوچھتے رہے لیکن کہیں بھی کام نہ ملا۔

ابو کے ایک بہت پرانے دوست وزیرستان ایجنسی میں رہتے تھے۔ ابو جب جوان تھے تو انہوں نے کچھ عرصہ پشاور (Peshawar) میں کام کیا تھا۔ یہ دوست ابو کے ساتھ ادھر ہی کام کرتے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ اور دوست بھی تھے جو بعد میں وزیرستان چلے گئے تھے جبکہ ابو واپس بہاولپور آ گئے۔ فیکٹری میں سارے پٹھانوں کے ساتھ صرف ایک ابو ہی اکیلے سرائیکی تھے اور سبھی ابو کے نہ صرف دوست تھے بلکہ ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ یہ دوستی ابھی تک موجود تھی۔ ہمارا کوئی رشتے دار نہیں تھا نہ باپ کی طرف سے اور نہ ہی ماں کی طرف سے۔۔۔ بس ایک ماموں تھے جو حیدر آباد میں کہیں رہتے تھے۔ امی کی شادی کے بعد انہوں نے کبھی بھی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ غربت چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ یہ سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو ہی کھا جاتی ہے۔ ابو کے یہ پٹھان دوست ہی ہمارے رشتہ دار تھے۔ کبھی کبھی سال میں ایک بار ان میں سے

کوئی بہاول پور کا چکر لگا لیتا تھا۔ دو تین بار ابو بھی وزیرستان کا چکر لگا آئے تھے۔

مشرف حکومت سے پہلے حالات ٹھیک تھے۔ افغانستان میں جنگ شروع ہوئی تو اس کے اثرات سے وزیرستان اور دوسری ایجنسیاں بھی متاثر ہوئیں لیکن آہستہ آہستہ پھر زندگی معمول پر آ گئی۔ انڈیا کے ساتھ پاکستان کی دشمنی نے دونوں ملکوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ دونوں ملکوں کے کروڑوں لوگ غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس جنگ نے دونوں ملکوں کا چھینا تو بہت کچھ ہے لیکن یہی نفرت پاکستان کو عسکری طور پر بہت مضبوط بنا گئی ہے۔

پاکستان میں حالات جتنے بھی خراب ہوں، دہشت گردی جتنی بھی زیادہ ہو، مستقل نہیں رہتی۔ آرمی کا کنٹرول ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ آرمی نہ صرف دہشت گردی پر قابو پا لیتی ہے بلکہ پورے علاقے کو کلئیر بھی کرا لیتی ہے۔ پاکستان کے دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن کبھی بھی یہ ملک افغانستان، عراق یا شام کی طرح نہیں بنا۔ طالبان آکے دھماکہ کرتے ہیں۔ طالبان کبھی بھی پاکستان کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں پر بھی اپنا قبضہ نہیں کر سکے۔ یہ پاکستان آرمی کے جوانوں کی بہادری ہے جو ان طالبان کو کبھی بھی آگے نہیں بڑھنے دیتی۔

وزیرستان کے حالات ٹھیک ہو گئے تھے۔ ابو ایک مہینے تک مسلسل کام کی تلاش کرتے رہے لیکن انہیں کہیں بھی کام نہیں مل سکا۔ وہ اکیلے نہیں تھے جو کراچی چلے جاتے اور کسی فیکٹری میں ملازمت کر لیتے بلکہ ان کے ساتھ پورا خاندان تھا۔ ہم سب کو ایک گھر کی ضرورت تھی۔ ملک کے حالات دن بدن خراب ہو رہے تھے اور کام اتنی آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ ہمیں سر چھپانے کے لئے ایک گھر کی ضرورت تھی اور ابو کے پاس کھانے کے پیسے بھی نہیں تھے، مکان کے کرایے کے پیسے کدھر سے آتے؟

ابو نے اپنے دوست کو فون کر کے انہیں اپنے حالات بتائے تو انہوں نے ابو کو وزیرستان آ جانے کا کہا۔ ان کی وانا (Wana) میں قریباً 100 کے قریب بکریاں تھیں اور وہ ان بکریوں کو وانا کے مضافات میں چراتے تھے۔ پاکستان میں 100 بکریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ قربانی کی وجہ سے ایک ایک بکرا بیس بیس ہزار کا بکتا ہے۔ وہ سال میں پندرہ لاکھ سے زیادہ کما لیتے تھے۔ ابو کے دوسرے دوست بھی وانا میں ہی مختلف کام کرتے تھے۔ وہاں بہت پیسا تھا لیکن جان کا خطرہ بھی تھا۔ ابو اسی وجہ سے اتنا عرصہ وہاں نہیں گئے تھے۔ یہاں اب چونکہ کام بالکل ختم ہو گیا تھا اور کوئی بھی آسرا نہ بچا تو آخر کار انہوں نے وزیرستان جانے کا فیصلہ کر

لیا۔انہوں نے اپنے دوست کو آنے کی اطلاع دی اور دوسرے ہی دن ہم صبح صبح بہاولپور شہر آ گئے۔

ہمارے پاس سامان کے نام پر تین سوٹ کیس تھے اور اسی میں ہمارا پورا گھر کا سامان تھا۔ چار پائیاں، بستر ے اور کھانے کے برتن وغیرہ سبھی نمبردار کے تھے اور وہ اس نے لے کر گھر کے سٹور روم میں رکھ لئے۔ جب وہ دوبارہ کبھی فصل بیچتا اور نیا نوکر رکھتا تو یہ چیزیں اس نوکر کے کام آنی تھیں۔ ہم سے پہلے ان اشیاء کو کوئی اور نوکر استعمال کرتا تھا۔ ہم آئے تو یہ چیزیں ہمیں ملیں اور ہمارے بعد یہ نئے آنے والے نوکر کے پاس جانی تھیں۔

بہاولپور سے ہم نے ڈی آئی خان (Dera Ismail Khan) کی بس پکڑی۔ اس بس نے ملتان اور بھکر (Bhakkar) سے ہوتے ہوئے سات گھنٹے میں ہمیں ڈیرہ اسماعیل خان پہنچا دیا۔ ڈی آئی خاں سے ہم پہلے ٹانک (Tank) اور پھر ٹانک سے ہم وانا پہنچ گئے۔ ٹانک پاکستانی صوبہ (KPK) کا آخری بڑا شہر ہے۔اس کے بعد جنوبی وزیرستان (South Waziristan) شروع ہو جاتا ہے۔ یہ وانا جنوبی وزیرستان ایجنسی کا سب سے بڑا اور مرکزی شہر ہے۔ ہم صبح پانچ بجے بہاولپور سے نکلے تھے اور شام سات بجے سے پہلے پہلے وانا پہنچ گئے۔

ابو کے دوست وانا شہر کے اندر نہیں رہتے تھے بلکہ وہ شہر سے قریباً دس کلو میٹر دور انگور اڈا کی طرف جانے والی مین روڈ کے اوپر ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ ابو کے دوست اپنی گاڑی پر وانا آئے اور ہمیں اڈے سے لے کر گاؤں آ گئے۔ یہ بہت چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس میں تقریباً چالیس کے قریب گھر تھے۔ سبھی لوگ یا تو بکریاں چراتے تھے یا پھر جنگل میں لکڑیاں کاٹ کر انہیں بیچتے تھے۔اس کے علاوہ گاؤں میں دو دکانیں بھی تھیں۔ گاؤں وانا سے دس کلو میٹر جب کہ انگور اڈا سے تقریباً 35 کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ انگور اڈا افغانستان کے باڈر پر پاکستان کا آخری گاؤں تھا۔ جس کے دوسری طرف افغانستان کا گاؤں شکین تھا۔ یہاں پر سرحدی چیک پوسٹ تھی اور دونوں ملکوں کے درمیان تجارت بھی ادھر سے ہوتی تھی۔

ہم نے رات ابو کے دوست کے گھر میں ہی گزاری۔ اس نے ابو کی آمد کی خوشی میں سپیشل بکرا ذبح کر کے بنایا تھا۔ ابو کے دوسرے دوست بھی دعوت پر آ گئے تھے۔ آدھی رات تک ایسے ہی جشن ہوتا رہا اور اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جبکہ ہم لوگ ابو کے دوست کے پاس ہی رک گئے۔ رات ہم نے ان کے ساتھ ہی گزارنی تھی اور دوسرے دن صبح صبح وہ ابو کو لے کر گاؤں کے سردار کے پاس چلے گئے۔

سردار نے ابو سے تھوڑی دیر بات کی اور پھر انہیں گاؤں کے باہر گھر تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔

یہاں گورنمنٹ کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے کیونکہ ساری زمین سرکار کی ہوتی ہے جس پر سرداروں نے قبضہ کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں جو طاقت ور ہوتا ہے زمین اسی کی ہوتی ہے۔اس علاقے میں کوئی کھیتی باڑی وغیرہ تو ہوتی نہیں ہے کیونکہ پہاڑی علاقہ ہے۔سرسبز پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے صرف بھیڑ بکریاں چرائی جاتی ہیں یا پھر جنگل سے لکڑی کاٹ کر بیچی جاتی ہے۔ یہاں پر زمین کی کوئی ویلیو نہیں ہے۔صرف رہائش یا پھر بکریوں کے باڑے کے لئے زمین چاہیے ہوتی ہے۔باقی بکریاں سارا دن پہاڑوں پر چرتی رہتی ہیں۔

ابو کے دوست گاؤں کے سردار سے گھر اور بکریوں کے باڑے کے لئے جگہ مانگنے گئے تھے۔سردار نے اجازت دے دی تو وہ ابو کو لے کر گاؤں سے باہر آ گئے۔سردار کا ایک ملازم بھی ان کے ساتھ آیا تھا۔اس نے جگہ کی نشاندہی کی تو ابو اور ان کے دوست نے پتھروں کی چھوٹی چھوٹی کنکریاں لگا کر نشان لگا لئے۔یہ کم از کم دو کنال کی جگہ تھی۔ہم اس جگہ کی چاردیواری کر کے ایک کونے پر دو کمرے گھر کے لئے بنا لیتے ،دوسری طرف ایک بڑا شیڈ بکریوں کے لئے بن جاتا اور باقی گھر کے اندر سارا صحن ہوتا۔۔۔ جہاں ہم اور جانور اکٹھے ہی پھرتے۔

جگہ کی نشاندہی کے بعد ابو گھر آئے اور ہم تینوں بھائیوں کو بلا کر لے گئے۔ابو کے دوست بھی آ گئے تھے۔ہم سب چاردیواری کے لئے بنیادیں کھودنے لگے۔چار تو ہم لوگ ہی تھے جبکہ پانچ ابو کے دوست تھے۔ہم کل ملا کر 9 لوگ تھے۔ہم نے تین تین فٹ کے قریب بنیاد کھودنی تھی۔دو کنال کی چاردیواری کے لئے تین فٹ کی بنیاد ہم نے دو دن لگا کر کھود ڈالی تھی۔ہم نے چاردیواری کے علاوہ دو کمروں اور بکریوں کے احاطے کے لئے بھی بنیاد کھود لی تھی۔

پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں پتھروں کی بہتات تھی۔پورے کے پورے پہاڑ تھے۔یہاں مکان اور دیواریں اینٹوں کی بجائے پتھروں سے بنائی جاتی ہیں اور ان کو کچی مٹی سے لیپ دیا جاتا ہے۔سیمنٹ اور پکی اینٹیں صرف وانا شہر میں استعمال ہوتی ہیں۔جبکہ وانا شہر سے باہر جتنے بھی گھر ہیں وہ سب انہی پتھروں سے بنے ہوئے ہیں۔ہمیں اپنا گھر بنانے میں ایک ہفتہ لگ گیا۔چاردیواری تو ہم نے پتھروں سے کر کے اوپر سے مٹی کا لیپ کر دیا۔اندر کمروں کی دیواریں بھی اسی طریقے سے لیپ دی گئیں جبکہ چھت ڈالنے کے لئے ہم نے جنگل سے درخت کاٹے اور ان کے بڑے بڑے ٹہنوں کو شہتیر کے طور پر استعمال کر

لیا۔شہتیر کے اوپر چھوٹی ٹہنیاں اور پھر پتے ڈال کر مٹی کا لیپ کیا گیا۔ لیپ کے بعد اوپر پلاسٹک کا بڑا شاپر ڈالا گیا۔ یہ پہاڑی علاقوں میں چھتوں پر ڈالا جاتا ہے۔ یہ بالکل ترپال کی طرح بہت بڑا اور مضبوط ہوتا ہے اور ایک ہی شاپر پوری چھت پر آ جاتا ہے۔ہم نے یہ شاپر ڈالا اور ایک بار پھر اوپر مٹی ڈال کر لیپ دی گئی۔ یہاں مکانوں کی چھتیں ہموار ہونے کی بجائے یورپی طرز کی بیضوی ہوتی ہیں۔ بارش یا برف باری کی صورت میں برف چھت پر گرتے ہی ڈھلان کی وجہ نیچے گر جاتی ہے اور اوپر جمتی نہیں ہے۔ ہر دو تین سال کے بعد چھت پر مٹی سے مزید لیپ کر دیا جاتا ہے۔ یہ چھت اگلے بیس سال تک کے لئے محفوظ ترین ہوتی ہے اور پانی کا ایک قطرہ بھی نیچے نہیں آتا۔ چھت کبھی بھی نہیں ٹپکتی ۔گھر مکمل ہو گیا تو ہم ادھر شفٹ ہو گئے ۔ابو کے دوست نے اپنے ریوڑ سے بیس بکریاں اور دو بکرے ہمیں دے دیئے۔ابو وادی میں بکریاں چرانے لگے جبکہ میں گریجوایشن کی تیاری کرنے لگا۔

کہانی کو مزید آگے بڑھانے سے پہلے اپنا تعارف کرواتا چلوں۔ میرا نام علی (Ali) ہے اور میری عمر اٹھارہ سال ہے۔ والد کا نام محمد عابد تھا اور ان کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ جبکہ امی کی عمر 45 سال کے قریب تھی۔ میرے دونوں بھائیوں کا نام اسد علی اور عارف علی تھا۔ وہ دونوں جڑواں اور چودہ سال کے تھے۔ بہنوں میں ایک سولہ سال کی امبر اور بڑی بہن کا نام عریج تھا۔ جبکہ امی کا نام فاطمہ بی بی تھا۔ یہ ہمارا کل کنبہ تھا۔

اب ابو کے دوست کا بھی تعارف کروادوں۔۔ ان کا نام نصیر خان تھا اور وہ ابو کے ہی ہم عمر یعنی پچاس کے قریب تھے۔ پٹھانوں کی بہت زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ یہ بچوں کے معاملے میں کافی سے زیادہ خوش قسمت ہوتے ہیں۔لیکن نصیر خان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ان کا صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ 22 سالہ گبھرو جوان جس کا نام جاسم خان تھا۔اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہوئی تھی اور کافی سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ یہ عام پٹھانوں کی طرح سخت مزاج اور روایتی نہیں تھا بلکہ نرم دل اور کافی حد تک روشن خیال تھا۔گوری رنگت اور سنہری بال تھے۔داڑھی مونچھوں کے بال بھی سنہری تھے۔

پاکستان میں جتنے بھی پٹھان ہیں وہ سب ہی گورے ہوتے ہیں۔ پٹھانوں کا رنگ قدرتی طور پر ہی سفید ہوتا ہے۔ بالکل یورپی لوگوں کی طرح۔۔ لیکن ان بے چاروں کی قسمت یورپی لوگوں کی طرح نہیں ہوتی۔ اسلحے کی فراوانی، آپس میں جنگیں اور کوئی بھی قانون نہ ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ جہنم بنا ہوا ہے۔ ہم

لوگ اس چیز کا ذمہ دار پٹھانوں کو قرار دیتے ہیں۔ وہ غصے والے ہوتے ہیں اور بات بات پر اسلحہ نکال لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ صدیوں تک بدلے کی جنگ لڑتے رہتے ہیں۔ ہم لوگ یہ سب کچھ سوچتے ہیں اور پٹھانوں کو ہی اس چیز کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے۔ اصل قصوروار قانون نافذ کرنے والے ادارے اور گورنمنٹ ہوتی ہے۔ قانون اور سزا معاشرے کو مہذب بنانے کے لئے ہی بنائے جاتے ہیں۔ اگر ریاست قانون کو نافذ کرنے میں ناکام رہتی ہے، قانون کے مطابق سزا نہیں دے سکتی تو ہر شخص ہی مجرم بن جاتا ہے اور اسے ہم بہادری کہتے ہیں۔ یہ بہادری نہیں ہوتی بلکہ صرف قانون کی کمزوری ہوتی ہے جو افریقہ، عرب ممالک، برما، انڈیا، افغانستان اور پاکستان کے لوگوں کو بہادر بناتی ہے اور یہ لوگ دوسرے نہتے لوگوں پر ظلم کر کے اپنے آپ کو بہادر کہتے ہیں۔

''پٹھان قوم دنیا کی سب سے بہادر قوم ہے۔'' جب کوئی پٹھان مجھ سے یہ کہتا ہے تو مجھے بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ یہ کونسی بہادر قوم ہے جس کی حفاظت کے لئے امریکہ اور یورپی ممالک کی افواج (Nato) لڑ رہی ہے۔ امریکہ اور یورپ آپ کے گھر میں بیٹھ کر آپ کی حفاظت کر رہا ہے اور آپ اپنے آپ کو بہادر کہہ رہے ہو۔ بہادر تو یورپ والے ہیں جنہوں نے پوری دنیا پر حکومت کی ہے۔ یورپ میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے دنیا میں آنے کے لئے بہترین ہسپتال ملتا ہے، زبان سیکھنے کے لئے کنڈر گارٹن (Kinder Gartan) ملتا ہے، فری سکول اور کالج ملتا ہے، نوکری ملتی ہے، بے روزگاری فنڈ ملتا ہے، شادی، بچے، ایک اچھا مستقبل، بڑھاپے میں پنشن اور صحت کے لئے ڈاکٹر اور اچھا ہسپتال ملتا ہے۔ بڑھاپے میں ایک ایسی سٹیج آجاتی ہے جب ہمارا دل جواب دے جاتا ہے تو وہ لوگ اسے نکال کر وہاں بیٹری ڈال دیتے ہیں۔ وہ لوگ زیرو سے لے کر سو سال تک جیتے ہیں اور اس زندگی کا پورا لطف اٹھاتے ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے بچے آدھے تو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں اور باقی بڑے ہو کر مر جاتے ہیں۔ آٹھ سال کے بچے ہوتے ہیں تو مزدوری شروع کر دیتے ہیں۔ گھسٹ گھسٹ کر ساٹھ سال پورے کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اگر نہ مر سکیں تو سڑک کے اوپر کھڑے ہو کر بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں۔ کیا یہ بہادری ہے؟ اگر بہادری اس کو کہتے ہیں تو میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی بہادری پر جو اپنی اور اپنی اولاد کو اچھی اور محفوظ زندگی نہیں دے سکتی۔

نصیر چاچا کا بیٹا جاسم مجھ سے چار سال بڑا تھا۔ پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا لڑکا تھا اس لئے بہت جلد میری اس

سے دوستی ہوگئی۔ جاسم موبائل ریپیئرنگ کا کام سیکھ رہا تھا۔ وہ صبح صبح وانا چلا جاتا تھا اور وہاں ایک موبائلوں کی دوکان پر کام کرتا تھا۔ اس کا ارادہ وانا میں اپنی موبائلوں کی دکان ڈالنے کا تھا۔ وہ نئے اور پرانے دونوں موبائل رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بہت پیسے والا کام تھا۔ یہاں گورنمنٹ کا کوئی ٹیکس سسٹم نہیں تھا۔ افغانستان پاکستان کے مقابلے میں بہت غریب ملک تھا۔ یہ چائنا، امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک کے لئے بہترین منڈی تھی۔ کسٹم اور ڈیوٹی ٹیکس کا کوئی باقاعدہ سسٹم نہیں تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سسٹم تھا ہی نہیں، سسٹم تھا لیکن دونمبری زیادہ تھی۔ کراچی سے سامان کینڈا آتے تھے اور افغانستان میں سپلائی ہوجاتے تھے۔ پاکستان پر اسی الیکٹرونکس کے سامان پر 35 سے لے کر 70 فیصد تک درآمدی ڈیوٹی ہوتی تھے۔ دو ہزار کا موبائل ڈیوٹی ٹیکس، انکم ٹیکس، شپنگ فیس اور کرایہ موبائل کی قیمت دس ہزار روپے تک پہنچا دیتی تھی۔ جبکہ افغانستان کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ دو ہزار کا موبائل کرایہ ڈال کر تین ہزار روپے کا ہوجاتا تھا۔ اس موبائل کی افغانستان کی بجائے پاکستان میں ویلیو تھی۔ وہاں تو اسے تین ہزار میں بھی کوئی نہیں خریدتا تھا جبکہ پاکستان میں یہی موبائل پانچ چھ ہزار میں آسانی سے بک سکتا تھا۔ اس لئے یہ الیکٹرونکس کا سامان پشاور سے ہی ڈراپ ہونا شروع ہوجاتا ہے۔

پشاور سے آگے ٹرک ایجنسیوں (علاقہ غیر) میں داخل ہوتے ہیں اور غائب ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ گورنمنٹ صرف نیٹو سپلائی پر ہی زیادہ توجہ دیتی ہے اور وہ بھی اسلحے کے کنٹینرز اور دوسرے فوجی سامان کے کنٹینرز پر۔۔۔ تجارتی سامان پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی اور یہ سامان بلیک مارکیٹوں میں پہنچ جاتا ہے۔ ایجنسیوں کے علاقہ میں کوئی فیکٹری یا کارخانے وغیرہ تو ہیں نہیں جہاں مزدوری ہوسکے۔ یہاں کھیتی باڑی بھی نہیں ہوتی۔ آخر پیٹ پالنے کے لئے کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے گورنمنٹ بھی زیادہ سختی نہیں کرتی کیونکہ اس سے تقریباً اسّی (80) فیصد سے زائد پٹھانوں کا روزگار منسلک ہے اور گورنمنٹ انہیں روزگار سے محروم نہیں کرنا چاہتی۔ یہ وہی سامان ہے جو پٹھان گھڑیاں، ٹارچ اور دوسری چھوٹی موٹی الیکٹرونکس کی چیزیں لاکر پنجاب میں بیچ رہے ہوتے ہیں۔ ایک ہزار مانگتے ہیں اور سو روپے میں ہی دے کر چلے جاتے ہیں۔ یہ گلی گلی گھوم کر سامان لے کر جاتے ہیں اور پنجاب میں بیچتے ہیں۔

جاسم کا ارادہ وانا میں ایک بڑی موبائل شاپ کھولنے کا تھا اور وہ اسی لئے یہ کام سیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس موٹر سائیکل تھی اور وہ صبح وانا چلا جاتا اور شام کو واپس آجاتا۔ میں نے بھی ابو سے اجازت لی اور اس کے

ساتھ ہی موبائل ریپئیرنگ کا کام سیکھنے لگا۔ مجھے ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر دونوں سے دلچسپی تھی۔ ہارڈ ویئر تو میں دکان سے سیکھ رہا تھا جبکہ سافٹ ویئر بھی دکان پر کام کرنے والے ایک لڑکے سے سیکھنے لگا۔ اس نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کر رکھا تھا۔ وہ لاہور کی کسی یونیورسٹی سے پڑھ کر گیا تھا۔ ہمارے گھر کے حالات ٹھیک ہو گئے تھے۔ ابو نے بکریاں چرانے کے علاوہ لکڑی کاٹنے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اس سے اضافی آمدنی ہونے لگی اور گھر میں خوشحالی آنے لگی۔ ہمیں وزیرستان ایجنسی راس آ گئی تھی۔ ابو گھر کی معاشی حالات سے آزاد ہوئے تو امبر کی شادی کی فکر ہونے لگی۔

یہاں اس پورے علاقے میں شاید ہم ہی ایک پنجابی فیملی تھے جبکہ باقی سبھی پشتون تھے۔ ابو امبر کی شادی بہاولپور میں کرنا چاہتے تھے لیکن حالات دوسری سمت میں پلٹا کھا رہے تھے۔ امبر اور جاسم کے درمیان محبت کا جذبہ پروان چڑھ چکا تھا۔ وہ بلا روک ٹوک ہمارے گھر آتا تھا۔ نصیر چاچا اور ہماری فیملی کے درمیان کوئی پردہ نہیں تھا۔ میرے دونوں چھوٹے بھائی اور بہنیں انہی کے گھر میں گھسے رہتے تھے۔ ہمارے گھر میں کوئی ٹی وی وغیرہ نہیں تھا جبکہ چاچا نصیر کے گھر میں ڈش بھی لگی ہوئی تھی اور سی ڈی بھی تھی۔ مجھے تو ٹی وی یا فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن باقی سبھی گھر والے ٹی وی اور فلموں سے تقریباً عشق کرتے تھے۔ مجھے صرف کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ پڑھنے کا اس قدر شوق تھا کہ میں اخبار کی خبریں اور اشتہار تک پڑھ ڈالتا تھا۔ دونوں فیملیاں ایک دوسرے کے گھر میں بلا تکلف آتی جاتی تھیں۔

جاسم 22 سال کا ایک خوبصورت جوان تھا۔ سلجھا ہوا اور سلیقے سے بات کرنے کا انداز اسے کسی بھی لڑکی کے خوابوں کا شہزادہ بنا سکتا تھا۔ امبر بھی اسے پسند کرنے لگی تھی اور جاسم بھی امبر سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جاسم نے اپنے ماں باپ سے بات کی لیکن وہ ابو سے امبر کا رشتہ مانگنے سے انکار کر رہے تھے۔ امبر کو چاچا نصیر اور ان کی بیوی دونوں ہی پسند کرتے تھے لیکن انہیں یہ ڈر تھا کہ ابو انکار نہ کر دیں۔ ہم سرائیکی لوگ اپنے خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے تھے۔ ہمارا کوئی خاندان تو نہیں تھا لیکن پھر بھی پشتون گھرانے میں شادی تھوڑا مشکل کام تھا۔

وزیرستان کے حالات کبھی بھی مستقل ٹھیک نہیں رہتے تھے۔ یہاں طالبان کا اکثر اثر نظر آتا رہتا تھا۔ ہمارے سرائیکی معاشرے میں مرد اور عورت برابر تو نہیں تھے لیکن پھر بھی عورت کو کافی آزادی ہوتی ہے۔ ابو نے بیٹی اور بیٹے میں کبھی فرق نہیں کیا تھا۔ جبکہ پشتون گھرانہ ہم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہاں عورت کو اتنی

آزادی نہیں ہوتی ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عورت کو بالکل ہی آزادی نہیں ہوتی ہے۔ میں پردے کے خلاف نہیں ہوں، مسلمان ہوں اور تسلیم کرتا ہوں کہ اسلام میں عورت کو پردے کا حکم دیا گیا ہے۔ پردے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آپ عورتوں کو قیدی ہی بنا لیں، مرد کو ہر قسم کی پابندی سے آزاد کر دیں اور اسلام کے سارے قوانین کو عورت پر ہی لاگو کرنے کی کوشش کریں؟

نصیر چاچا کا گھر ایسا نہیں تھا۔ وہ لوگ بہت اچھے تھے اور جاسم تو ویسے ہی مجھے اچھا اور شریف لڑکا لگتا تھا۔ ہم دونوں صبح سے شام تک اکٹھے ہی رہتے تھے اور میں اسے بہت اچھے طریقے سے جانتا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں پر زور دیتا رہا لیکن نصیر چاچا نے بالکل ہی انکار کر دیا۔ انہیں جاسم پر اس بات کا ہی بہت غصہ تھا کہ اس نے امبر کو دوسری نظر سے کیوں دیکھا۔ انہوں نے جاسم اور اپنی بیوی کو بھی دھمکی دی کہ وہ کبھی بھی کسی سے امبر کا رشتہ نہیں مانگیں گے۔ اگر ان کے دوست کو پتہ چل جائے کہ جاسم ان کی بیٹی پر نظر رکھتا ہے تو وہ ادھر ہی شرم سے مر جاتے کہ ان کا دوست کیا سوچتا ہوگا۔ ہمارا گھر ان سب چیزوں سے بے نیاز اپنا کام کر رہا تھا جبکہ دوسری طرف وہ لوگ اندر ہی اندر گھل کر مر رہے تھے۔ مجھے جاسم کے رویے میں تھوڑا فرق محسوس ہوا تو میں اس سے خیریت پوچھتا رہا۔

”جاسم! خیر تو ہے نا؟ میں کافی دنوں سے تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں۔ تم کام پر بھی زیادہ دھیان نہیں دے رہے ہو۔“ وہ ایک ٹوٹے ہوئے موبائل کی نئی سکرین لگا رہا تھا۔ میں اس کے کانپتے ہاتھوں کو دیکھ کر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

”نہیں! علی بھائی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہونا ہے؟“ اس کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے لیکن پھر وہ دوبارہ کام پر لگ گیا۔ میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کام پر لگ گیا۔ شام کو چھٹی کر کے ہم دونوں گھر کی طرف جانے والے راستے پر جا رہے تھے۔

”جاسم! موٹر سائیکل روکنا، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ ہم ابھی گاؤں سے تھوڑا پیچھے ہی تھے جب میں نے موٹر سائیکل رکوا کر اسے سڑک سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں کھڑا کیا اور خود اس کو لے کر پہاڑی کے اوپر آ گیا۔ ابھی صرف چار ہی بجے تھے۔ رات کا اندھیرا ہونے میں پورے تین گھنٹے باقی تھے اس لئے ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔

”ہاں! تو جاسم بھائی اب بتاؤ! کیا بات ہے؟ کیوں تم اتنے دنوں سے پریشان ہو؟“ میں اس کے

برابر بیٹھ گیا۔

''علی بھائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' وہ اب بھی انکار کر رہا تھا۔

''جاسم! مجھے لگتا ہے کہ تم مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھتے ہو؟ میں تم سے چار سال چھوٹا ضرور ہوں لیکن ایک انسان کے جذبات تو پڑھ ہی سکتا ہوں۔تم خوش نہیں ہو!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''علی بھائی! کچھ باتیں بھائیوں سے بھی نہیں کی جاتیں۔اس پریشانی کو مجھے خود ہی جھیلنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''جاسم بھائی! سب کچھ ہی بھائیوں سے شیئر کیا جاسکتا ہے۔میں بھائی بھی ہوں اور دوست بھی۔۔۔ بھائی سمجھ کر شیئر نہیں کر سکتے تو دوست سمجھ لو! شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''دوست؟ اگر وہ بات آپ کو بری لگے۔۔۔ بہت زیادہ بری لگے تو کیا کرو گے؟'' اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

''یار جاسم! کیا کررہے ہو؟ تم تو رو رہے ہو یار! تم اتنے پریشان ہو اور مجھے اس کا پتہ ہی نہیں ہے۔'' میں اسے روتے ہوئے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''علی بھائی! میں سب کچھ آپ سے شیئر کرسکتا ہوں لیکن یہ بات نہیں کرسکتا۔ مجھے معاف کر دینا!'' وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور جانے لگا تو میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''نہیں جاسم! میں کبھی بھی تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ مجھے بتاؤ آخر ایسی کیا بات ہے جو مجھ سے چھپائی جا رہی ہے؟'' میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''علی بھائی! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے نیچے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ اچھا! یہ بات ہے۔اس میں پریشانی کی کونسی کی بات ہے؟ یہ تو خوشی کی بات ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''علی! کیا ایک جوان لڑکا اپنی مرضی سے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرسکتا ہے؟'' اس کی آنکھیں ایک بار پھر زمین کی طرف جھک گئیں۔

''ہاں! تو اس میں کونسی نئی بات ہے۔اگر تمہیں نصیر چاچا سے ڈر لگتا ہے تو مجھے بتاؤ میں خود چاچا سے

بات کرتا ہوں۔'' میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

''علی بھائی! میں شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن لڑکی کا نام شاید میں۔۔۔شاید میں ساری زندگی بھی اپنی زبان پر نہ لاسکوں۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔

مجھے ایک شاک سا لگا، میں اس کی بات سمجھ گیا تھا۔وہ میرے ہی گھر کی بات کر رہا تھا۔میں کچھ لمحوں تک پہاڑی پر ہی کھڑا رہا۔جاسم نیچے اتر کر موٹر سائیکل کو لے کر روڈ پر چلا گیا تھا اور ادھر ہی کھڑا ہو کر میرا انتظار کر رہا تھا۔ایک لمحے کے لئے تو مجھے غصہ آیا لیکن دوسرے ہی پل اس کی سچائی اور ایمانداری اس غصے کو کھا گئی۔وہ کوئی گناہ نہیں کر رہا تھا بلکہ جائز طریقے سے شادی کرنا چاہتا تھا۔اچھا خاصہ خوبصورت اور پڑھا لکھا لڑکا تھا۔چاچے نصیر کے پاس بہت پیسہ تھا اور جاسم ان کا اکلوتا وارث تھا۔مجھے تو اس رشتے میں کوئی بھی کمی نہیں لگ رہی تھی تو پھر غصہ کس بات کا؟ ہماری چاچے نصیر کے ساتھ رشتہ دار بن جاتی تو اس سے بڑی اور کیا بات ہوتی۔میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔

''جاسم!'' میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہی ہوا تو اس نے میری بات درمیان سے کاٹ دی۔

''سوری علی بھائی! میں بہت مجبور ہو گیا تھا۔

''کوئی بات نہیں یار! یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔تم امبر سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی بھائی! اگر آپ لوگوں کو منظور ہو تو۔۔۔'' اس نے اپنے سر کو جھکا لیا۔

''میں آج شام کو ہی ابو سے بات کرتا ہوں۔مجھے تم دونوں کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ ابو کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور ہم دونوں گھر آ گئے۔

ابو بھی بکریاں لے کر گھر آ گئے تھے۔ہم سب نے مل کر کھانا کھایا اور اس کے بعد میں ابو سے بات کرنے لگا۔ابو بھی جاسم کو پسند کرتے تھے اور وہ بھی اس دوستی کو رشتے داری میں بدلنا چاہتے تھے۔انہیں صرف وزیرستان میں رہنے پر اعتراض تھا اور وہ امبر کو وزیرستان ایجنسی سے باہر پنجاب کے کسی علاقے میں بیاہنا چاہتے تھے۔

''ابو! جاسم اگر وانا میں دکان بنانے کی بجائے لاہور یا کراچی میں دکان بنا لے اور ادھر ہی رہائش

اختیار کر لے تو پھر تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟'' میں نے ابو سے کہا تو وہ مان گئے۔

دوسرے ہی دن میں نے جاسم سے یہ ساری باتیں کہہ دیں۔ انہیں ابو کے اعتراض کا بھی بتا دیا اور لاہور یا کراچی میں سیٹل ہونے کی شرط بھی بتا دی۔

''جاسم بھائی! اس چیز کو تم بھی جانتے ہو کہ یہاں وانا میں پیسہ ضرور ہے، کام بھی مل جاتا ہے لیکن جان کا خطرہ ضرور رہتا ہے۔ یہاں کے حالات کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوتے۔ پنجاب میں تھوڑی مشکل ضرور ہوتی ہے لیکن وہاں طالبان کا خطرہ نہیں ہے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جی علی بھائی! جیسے آپ کہتے ہو میں ویسے ہی کروں گا۔ بڑی عید (عیدالاضحیٰ) کو ابھی آٹھ مہینے رہتے ہیں۔ قربانی کے جانوروں سے جو پیسہ بنے گا اس سے ہم دونوں لاہور میں ایک اچھی سی دکان بنائیں گے۔ دکان چل نکلی تو آہستہ آہستہ باقی گھر والوں کو بھی ادھر ہی بلوا لیں گے۔ ویسے بھی ابو نے لاہور کے ایک ہاؤسنگ پلازے میں دو پلاٹ رکھے ہیں۔ ہم وہاں سادہ سے سنگل سٹوری دو مکان بنوا لیں گے۔ تھوڑا ٹائم تو لگے گا لیکن بہر حال ہم سب سیٹل ہو جائیں گے۔'' میں اس کی باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ بائیس سال کا وہ نوجوان اپنی عمر سے کہیں بڑی باتیں کر رہا تھا۔

کام سے چھٹی کر کے ہم گھر گئے تو اس نے اپنے ماں باپ سے بات کی اور شام کو ہی وہ سب ہمارے گھر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ امبر کا باقاعدہ رشتہ مانگنے کے لئے آئے تھے۔ ابو کو اب اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں رہا تھا اس لئے ہم نے ہاں کر دی۔ شادی دس دن بعد پہلے جمعہ کو چھوڑ کر اس سے اگلے جمعہ کے دن کو طے کر دی گئی۔ ہم غریب لوگ تھے شادی کے لیے کوئی لمبا چوڑا فنکشن تو نہیں تھا۔ چاچا نصیر نے ابو کو بول دیا تھا کہ انہیں صرف امبر ہی چاہیے، ان کو جہیز کی مد میں کچھ بھی نہیں چاہیے۔ انہوں نے بارات لے کر جانے سے بھی منع کر دیا تھا۔ وہ چار پانچ لوگوں کے ساتھ آتے اور سادگی سے نکاح کر کے لے جاتے۔ انہوں نے ابو کے گھر سے پانی تک پینے سے انکار کر دیا تھا۔ شادی کے دوسرے دن انہوں نے ولیمے کا انتظام کیا تھا۔ جس میں انہوں نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو بلانا تھا۔ شادی کے دن رکھ دیئے گئے تو جاسم کا ہمارے گھر میں داخلہ بند ہو گیا۔

دن ایک ایک کر کے گزرنے لگے۔ ہمارے گھر میں چار پیسے بھی آ گئے تھے اور بہن کی شادی بھی ہو رہی تھی۔ غربت اور مفلسی سے باہر نکل کر ہم ایک خوشحال زندگی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا

تھا لیکن اچانک حالات نے پلٹا کھانا شروع کر دیا۔ ملک کے اندر آرمی چیف جنرل کیانی تھے۔ یہ ان کا آخری سال چل رہا تھا۔ ان کے ساتھ پیپلز پارٹی کا بھی آخری سال تھا۔ میں مشرف کے حق میں تو نہیں ہوں بلکہ میں کسی بھی فوجی حکومت کے حق میں نہیں ہوں۔ اس کی حکومت جیسی بھی تھی، ملک کے اندر دہشت گردی بھی اسی کے دور میں شروع ہوئی اور اس نے دہشت گردی کے خلاف جنگ بھی بہادری سے لڑی۔ مشرف نے ان دہشت گردوں کو کہیں بھی اکٹھا نہیں ہونے دیا۔ سوات سے لے کر بلوچستان تک اس نے پورے ملک میں جنگ لڑی اور کہیں بھی ان دہشت گردوں کو مضبوط نہیں ہونے دیا۔ جبکہ ان کے مقابلے میں جنرل کیانی نسبتاً کمزور جرنیل تھے۔ وہ ان دہشت گردوں کے خلاف لڑنے سے کتراتے رہے۔ اگر وہ مشرف کے جانے کے بعد اسی تسلسل سے لڑتے رہتے تو دہشت کا ناسور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہی ختم ہو جاتا۔ لیکن وہ جنگ سے دور بھاگتے رہے اور اسی وجہ سے طالبان کو دوبارہ پاؤں جمانے میں مدد مل گئی۔

طالبان ایک بار پھر فاٹا اور سوات میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کر چکے تھے۔ ان کے قدم ہمارے گاؤں میں بھی پہنچ گئے۔ یہ گاؤں چونکہ وانا سے باہر انگوراڈے والی مرکزی سڑک کے اوپر واقع تھا۔ اگر اس پہاڑی پر چڑھو تو اس کے پیچھے مزید بلند پہاڑیاں اور گھنے جنگل کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ طالبان کے لئے آئیڈیل جگہ تھی۔ آرمی کے کسی بھی اٹیک کی صورت میں وہ پہاڑی پر چڑھتے اور اس کے پیچھے گھنے جنگل میں غائب ہو جاتے۔ یہ جنگل آگے افغانستان تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک بار جنگل میں داخل ہو گئے تو آرمی کے ہیلی کاپٹر بھی نہیں ڈھونڈ سکتے تھے۔

انہوں نے ہمارے گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ ان کی تعداد تیس کے قریب تھی۔ انہوں نے گاؤں کے دس بڑے گھروں کا انتخاب کیا اور تین تین ہو کر ان گھروں میں مقیم ہو گئے۔ ان گھروں میں نصیر چاچا کا گھر اور ہمارا گھر بھی شامل تھا۔ نصیر چاچا گاؤں کے امیر لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور ان کی فیملی بھی بس تین افراد پر مشتمل تھی۔ جبکہ ہم چونکہ گاؤں سے باہر اور پہاڑی کے نزدیک تھے اس لئے وہ ہمارے گھر میں بھی آ گئے۔ میری دونوں بہنیں اور امی پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ہمارا تعلق سرائیکی فیملی سے تھا اور بہاولپور کے تقریباً سبھی دیہات میں آپ کو کہیں بھی برقع نظر نہیں آئے گا۔ کیونکہ ہماری عورتیں مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔

طالبان گھر میں آئے تو ابو نے سختی سے سبھی کو پردے میں رہنے کا کہا۔ انہیں امبر اور عریج دونوں کی فکر

تھی۔ طالبان صرف باہر سے ہی مسلمان نظر آتے تھے۔ ان کے اندر کے بھیڑیے بہت خطرناک تھے۔ انسانی جان اور عورت کی عزت کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ دیہات کے گھروں میں کوئی اٹیچ کچن یا اٹیچ باتھ روم نہیں ہوتا۔ کچن، برتن اور کپڑے وغیرہ دھونے کا انتظام صحن میں ہی ہوتا ہے۔ کمرے صرف سونے کے لئے ہوتے ہیں۔ گھر کے اندر دو جوان لڑکیاں تھیں جوان طالبان کے لئے کھانے پینے اور کپڑے وغیرہ دھونے کا کام کرتی تھیں۔ ان کو سارا دن ان طالبان کے سامنے ہی رہنا پڑتا تھا اور وہ لوگ ان کو گھورتے رہتے تھے۔ ہم سب کا خون تو کھولتا تھا لیکن مجبور تھے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

طالبان بہت بڑی تنظیم تھی اور ہم ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے اس لئے دل پر جبر کر کے برداشت کر رہے تھے۔ چونکہ ہمارا گھر گاؤں سے باہر پہاڑی کے نزدیک تھا اس لئے یہاں کوئی بھی دہشت گرد مستقل نہیں رہ رہا تھا۔ یہ ہر روز بدلتے رہتے تھے اور ہمارے گھر کی شہرت سبھی طالبان کے اندر پھیل رہی تھی۔ اصل میں ان کا کام اس گاؤں پر قبضہ جما کر بیٹھنا نہیں تھا۔ یہ حکومت کے ساتھ مذاکرات کر رہے تھے۔ مذاکرات تو صرف ایک بہانہ تھا جبکہ مذاکرات کی آڑ میں وہ دوبارہ اپنی طاقت اکٹھی کر رہے تھے۔ ان کو تھوڑی مہلت کی ضرورت تھی تا کہ اپنا سیٹ اپ بنا سکیں۔

اسلحہ، بارودی مواد اور خودکش جیکٹس افغانستان سے سمگل ہو کر آ رہی تھیں۔ وہ اس سامان کو ہمارے گاؤں کے اوپر جنگل میں اکٹھا کر رہے تھے اور پھر وہاں سے آگے پنجاب میں لے جا رہے تھے۔ ان کی نظر فاٹا کے کسی بھی علاقے پر نہیں تھی۔ یہ یہاں اس علاقے میں صرف کنٹرول حاصل کر رہے تھے اور وہ بھی وقتی طور پر۔۔ ان کے چھپنے کے لئے جنگل اور پہاڑ بہت تھے۔ اصل ٹارگٹ پشاور، پنجاب اور کراچی تھا۔ یہ اسلحہ اور بارود ادھر پہنچا رہے تھے۔

فاٹا کی کسی ایجنسی میں دھماکہ ہوتا تو اس کی خبر باہر نہیں جاتی تھی کیونکہ اس علاقے کی کوئی ویلیو نہیں تھی۔ یہاں کوئی نیشنل یا انٹرنیشنل میڈیا نہیں تھا جو دھماکے کی کوریج کرتا۔ ساری خبریں آرمی کا ادارہ (ISPR) ہی جاری کرتا تھا اور ان چیزوں میں کوئی سنسنی نہیں ہوتی تھی۔ جبکہ لاہور یا کراچی میں کوئی دھماکہ ہوتا تو ایک آدمی کے مرنے پر بھی خبر BBC اور CNN پر چلتی تھی اور پاکستانی میڈیا تو تقریباً پاگل ہی ہو جاتا تھا۔ چونکہ ان طالبان کو باہر سے فنڈنگ ہی سنسنی اور خوف پھیلانے پر ہوتی تھی۔ اس لئے ان کی دلچسپی لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہر ہی ہوتے تھے۔ فاٹا کے علاقے میں یہ لوگ صرف اس لئے دہشت پھیلاتے تھے کہ ان کو لوگوں کے

درمیان رہنے میں کوئی پرابلم نہ ہو۔ان کی مین رہائش تو پہاڑی کے اوپر تھی۔

جنگل میں کم از کم بھی 50 کے قریب طالبان رہ رہے تھے۔ نیچے گاؤں میں بیس کے قریب ہی آتے تھے اور ادھر ہی رہتے تھے۔ باقی سارے طالبان یا تو اوپر جنگل میں تھے یا پھر دوسرے علاقوں میں تھے۔ ہمارا ڈر روز بروز ہی بڑھ رہا تھا۔آرمی والوں نے اس طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ہمیں ہر روز ہی کم از کم دس کے قریب لوگوں کے لئے کھانا بنانا پڑتا تھا۔اوپر جنگل میں رہنے والے طالبان اپنا کھانا جنگل میں خود ہی بناتے تھے۔ یہ کھانا صرف ان کے بڑے سرداروں کے لئے ہوتا تھا یا پھر ان لوگوں کے لئے ہوتا تھا جو اسلحہ لے کر آتے تھے۔بکریاں چرانے کے لئے بھی وہ ابو کو روزانہ چار گھنٹے ہی دیتے تھے۔گاؤں کے باقی لوگ بھی اتنا ہی ٹائم بکریاں چراتے تھے اور ان کو زیادہ دور تک بکریاں لے کر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

طالبان کے آدمی اوپر پہاڑی پر پہرہ دیتے تھے۔اس چھوٹے سے گاؤں میں بھی انہوں نے چھ لوگوں کو آرمی کی مخبری کرنے کے الزام میں مار دیا تھا۔دو لوگوں کے اوپر کفر کا فتویٰ لگا تھا اور وہ بے چارے بھی کافر مرگئے۔طالبان کے ڈر سے گاؤں والوں نے ان کا نمازِ جنازہ تک نہیں پڑھایا تھا۔ ہمارا گھر ابھی تک بچا ہوا تھا لیکن ایک انجانا سا خوف مسلسل ہمارے ذہنوں پر چھایا ہوا تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بڑا دھماکہ ہونے والا ہو۔

جاسم اور امبر کی شادی کو ابھی دو دن باقی تھے جب ایک دن دوپہر کے بعد ایک پچاس سالہ آدمی ہمارے گھر آ گیا۔اس کی بڑی بڑی داڑھی اور مونچھیں تھی جن کو اس نے مہندی لگا کر سرخ کیا ہوا تھا۔اس کا پورا جسم ہی بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں پر بھی بڑے بڑے بال تھے جو عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ سفید ہو گئے تھے۔سارے طالبان اسے کمانڈر یوسف کے نام سے بلا رہے تھے۔

امی نے سالن بنا لیا تھا اور اب ان لوگوں کے لئے روٹیاں بنا رہی تھی۔ان لوگوں کے پاس پیسہ بہت تھا۔ یہ مفت کھانا نہیں کھاتے تھے۔سبزی، گھی اور آٹا وغیرہ خود خرید کر گھر میں لا کر دیتے تھے۔اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً وہ نقد پیسے بھی ابو کو دے دیتے تھے تا کہ وہ دوسرا ضروری سامان خرید سکیں۔امی باہر صحن میں مٹی کے بنے ہوئے تندور پر روٹیاں لگا رہی تھی جبکہ ہم سارے بچے اندر کمرے میں سہمے بیٹھے تھے۔ابو بکریاں لے کر گھر واپس آئے تو وہ آدمی جس کا نام کمانڈر یوسف تھا چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ابو کو اٹھ کر سلام کیا اور گلے سے لگا لیا۔

''مبارک ہو عابد علی! خدا نے تمہیں اسلام کی خدمت کرنے کا موقع دیا ہے۔'' اس نے اونچی آواز میں ابو سے کہا تو میں جلدی سے باہر آ گیا۔ میں اندر سے کانپ گیا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے ابو بھی ان دہشت گردوں سے ملنے لگے ہیں۔

''مبارک ہو عابد علی صاحب! کمانڈر صاحب نے آپ کو اسلام کی خدمت کے لئے چُنا ہے۔''

''مبارک ہو عابد علی صاحب!'' باقی سارے طالبان بھی باری باری ابو کو مبارک باد دینے لگے۔

ابو خاموشی سے ان کے مبارک باد وصول کرتے رہے اور جب وہ سارے فارغ ہو گئے تو ابو کمانڈر یوسف کے ساتھ چار پائی پر بیٹھ گئے۔ وہ چار پائی پر بیٹھ چکا تھا اور اس نے ابو کو بھی اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

''سوری کمانڈر صاحب! میں بہت غریب اور گناہ گار آدمی ہوں۔ میرے لئے میرا گھر ہی جنت ہے اور میں اپنے گھر والوں کی ہی خدمت کر لوں تو یہی میرے لئے بہت ہے۔ میں نہ ہی کسی سے لڑ سکتا ہوں اور نہ ہی کسی کو مار سکتا ہوں۔'' ابو نے ان کو جواب دیا تو میں بھی ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''نہیں عابد بھائی! خدا نے آپ کو میدان جنگ میں لڑنے اور شہید ہونے کے لئے نہیں چنا۔ یہ تو بہت عظیم جذبہ ہے۔ شہید ہونا بہت سعادت کی بات ہے۔ اسلام میں جہاد صرف دشمنوں سے لڑنا ہی نہیں ہے بلکہ ان مجاہدین کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے۔'' اس نے دوسرے طالبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی! وہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ہمارے گھر میں مہمان ہو اور آپ کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔'' ابو نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''عابد بھائی! خدا نے آپ کی دونوں بیٹیوں کو مجاہدین کی خدمت کے لئے چن لیا ہے۔ تمہاری بیٹیاں دنیا کی خوش قسمت ترین بیٹیاں ہوں گی جوان مجاہدین کی بیویاں بنیں گی جو خدا کی راہ میں اپنی جانیں نچھاور کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور تم دنیا کے خوش قسمت ترین باپ ہو گے کہ خدا نے تمہیں دو بیٹیاں دیں اور دونوں ہی خدا کو اس مقدس کام کے لئے پسند آ گئیں۔'' ابھی کمانڈر نے اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ پورا گھر ایک بار پھر ''مبارک! مبارک!'' کے الفاظ سے گونجنے لگا۔ وہ سارے بڑھ چڑھ کر ابو کو مبارک باد دے رہے تھے۔

''عابد بھائی! تم بہت خوش قسمت ہو! تمہاری بڑی بیٹی کو میں اپنے عقد میں لوں گا اور چھوٹی بیٹی میرے نائب کمانڈر حبیب کی بیوی بنے گی۔'' اس نے ابو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کمانڈر صاحب! یہ واقعی میرے لئے نصیب کی بات ہوتی لیکن میری بڑی بیٹی کا نکاح پرسوں جمعہ کو میرے دوست کے بیٹے سے ہو رہا ہے، ان کی شادی طے ہو چکی ہے۔ جبکہ چھوٹی بیٹی کی شادی پہلے سے ہی میرے بھائی کے بیٹے سے ہو چکی ہے۔ وہ سعودی عرب میں مزدوری کرتا ہے اور اس کا گھر لاہور میں ہے۔ آپ لوگوں کے آنے کی وجہ سے ہم گاؤں سے باہر نہیں جا سکتے ورنہ میں تو اسے اس کے سسرال چھوڑ کر آنے والا تھا، وہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں۔'' ابو نے جلدی سے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''اچھا! وہ کب ہوئی ہے؟'' کمانڈر ابو کی بات سن کر تھوڑا پریشان ہو گیا۔

''جی! ابھی پچھلے سال اس کی شادی ہوئی ہے، بڑی کی شادی بھی پرسوں ہو رہی ہے۔ پورے گاؤں کو دعوت دی ہوئی ہے۔ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ہی اب بچی کا نکاح پڑھوایا جائے گا۔ یہ بھی تو نصیب کی بات ہے نا؟'' ابو نے قدرے اونچی آواز میں کہا تاکہ باقی بھی یہ باتیں سن سکیں۔

''ٹھیک ہے! ہم دیکھتے ہیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔'' اس نے مختصر بات کی اور چپ ہو گیا۔

امی اتنی دیر تک روٹی تیار کر چکی تھی۔ انہوں نے دسترخوان بچھا کر روٹی لگائی تو انہوں نے خاموشی سے روٹی کھائی اور اس کے بعد کمانڈر اور نائب کمانڈر تو واپس چلے گئے جبکہ باقی طالبان ادھر ہی چھاؤں میں چارپائیاں ڈال کر لیٹ گئے۔ بظاہر ہر طرف خاموشی ہو گئی تھی لیکن یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔ ابھی ایک بڑا طوفان آنے والا تھا اور سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر جانے والا تھا۔ ابو کو بھی پتہ تھا کہ وہ لوگ اتنے آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ ان کی نظر لڑکیوں پر پڑ گئی تھی اور اب اتنی جلدی وہ ان لڑکیوں سے دستبردار نہیں ہونے والے تھے۔ کمانڈر یوسف نے تو اسپیشل امبر کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ اندر کمرے میں آیا تھا اور اس نے دونوں لڑکیوں سے چہرہ دکھانے کا کہا تھا۔ ہم نے انہیں اسلام اور پردے کی بات بتائی تو اس نے ٹال دیا۔

''بہن جی! جو خدا کا مجاہد ہوتا ہے نا اس سے عورت کو پردہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ خدا کا سپاہی ہوتا ہے اور خدا کے سپاہی سے پردہ کرنا حرام ہوتا ہے۔'' باہر اس کے سارے لوگ بیٹھے تھے۔ امی نے آہستگی سے امبر اور عریج کے چہروں سے پردہ ہٹا کر اسے لڑکیوں کا چہرہ دکھا دیا تھا اور وہ خاموشی سے چہرہ دیکھ کر باہر چلا گیا تھا۔

پوری رات ہم کمرے میں خدا سے کسی مدد کی دعا کرتے رہے۔ ہماری پوری رات روتے اور گڑگڑاتے ہی گزری تھی۔ ہم لوگوں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی دعائیں نہیں مانگی تھیں جتنی اس رات میں مانگ لی

تھیں لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہماری زندگی میں آزمائشیں لکھی ہوئی تھی اور ہم نے ان آزمائشوں سے گزرنا ہی تھا۔

دوسرے دن صبح صبح ہی کمانڈر اور نائب کمانڈر آ گئے۔ انہوں نے ابو کو ساتھ لیا اور گاؤں کے چوک میں لے گئے۔ انہوں نے سارے گاؤں والوں کو اکٹھا کر لیا۔ میں بھی ابو کے پیچھے پیچھے چوک میں چلا گیا۔ چوک کے اندر انہوں نے مٹی ڈال کر نسبتاً اونچا ایک چبوترا بنایا ہوا تھا۔ جس کے کنارے انہوں نے لکڑی کی مدد سے ایک پھانسی گھاٹ بنایا ہوا تھا۔ انہوں نے ابو کو چبوترے پر کھڑا کیا اور ان کے ہاتھ پیچھے پشت کی طرف کر کے باندھ دیئے۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے خطرے کا احساس ہو گیا۔ میں بھیڑ سے باہر نکلنے لگا تاکہ کوئی انتظام کر سکوں لیکن اس سے پہلے ہی تین لوگوں نے مجھے پکڑ لیا اور میرے بھی ہاتھ پیچھے کی طرف کر کے باندھ دیئے اور چبوترے پر لے گئے۔

''گاؤں والو! اللہ تعالیٰ نے ہم طالبان کو آپ لوگوں اور اسلام کی حفاظت کے لئے بھیجا ہے۔ ہم لوگ خدا کے دین کو بچانے کے لئے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔ اسلام کے یہ مجاہدین اپنے گھر بار چھوڑ کر خدا کی راہ میں شہید ہو رہے ہیں۔'' کمانڈر یوسف چبوترے کے اوپر کھڑا ہو کر تقریر کر رہا تھا۔

''میرے بھائیو! جہاں ہم مجاہدین خدا کی راہ میں شہید ہونا فخر محسوس کرتے ہیں، وہیں کچھ منافق لوگ بھی ہیں۔ یہ کافر ہو چکے ہیں جنہوں نے اپنا ایمان امریکہ کے کافروں کے آگے بیچ دیا ہے۔ یہ پاک آرمی بھی امریکہ کے ہاتھوں بکی ہوئی ہے اس لئے ان کے خلاف لڑنا جہاد ہے۔ یہ عابد علی ایک جاسوس ہے۔ یہ آپ لوگوں کے گاؤں میں آیا ہی جاسوسی کے لئے تھا اور ہماری ساری خبریں باہر جا رہی تھیں۔ اسلام کا یہ دشمن کسی بھی معافی کا حقدار نہیں ہے۔ ہماری طالبان کی مجلس شوریٰ نے اسے پھانسی کا حکم سنایا ہے۔ یہ خدا کا حکم ہے اور میں خدا کا سپاہی اس حکم پر عمل درآمد کر رہا ہوں۔'' کمانڈر یوسف نے اپنی تقریر ختم کی تو تین دہشت گردوں نے ابو کو پکڑ لیا اور اسے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جانے لگے۔

ابو کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ کوئی بھی مزاحمت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایک کپڑے سے ابو کا منہ بھی بند کر دیا تھا تاکہ وہ چیخ چلا نہ سکیں۔ میں نے اپنے آپ کو ان لوگوں سے چھڑانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ میں اونچی آواز میں چلّا چلّا کر ابو کے بے قصور ہونے کا کہہ رہا تھا۔ میں ان لوگوں سے معافیاں مانگ رہا تھا لیکن ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ وہ لڑکیاں لے جانے کے لئے کر

رہے تھے۔انہیں معلوم تھا کہ ابو کبھی بھی اپنی زندگی میں امبر اور عریج کی شادی ان طالبان سے نہ کرتے۔اب وہ دوسرا طریقہ استعمال کر رہے تھے۔وہ ابو کو جاسوس قرار دے کر مار دیتے اور پھر کوئی بھی انہیں روکنے والا نہ ہوتا۔میں چلاّ چلاّ کر ان سے معافیاں مانگ رہا تھا، ان سے ابو کو چھوڑ دینے کا کہہ رہا تھا لیکن ان پر کوئی بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

’’کمانڈر صاحب! میں اپنی دونوں بہنوں کی شادی آپ دونوں سے کروا دیتا ہوں، پلیز! ابو کو چھوڑ دو! وہ جاسوس نہیں ہیں۔پلیز! نہیں! چھوڑ دو! میں خود بھی مجاہد بننا چاہتا ہوں۔۔۔‘‘ میں چلاّ چلاّ کر ان سے کہہ رہا تھا۔

میں اپنی دونوں بہنوں کے بدلے میں ابو کی جان بخشی کی درخواست کر رہا تھا۔مجھے معلوم تھا وہ ابو کو مار کر بھی لڑکیوں کو لے جاتے۔وہ پھانسی ہی اس وجہ سے دے رہے تھے۔ان بے چاریوں کی قسمت میں تو طالبان کے دہشت گرد کمانڈر ہی لکھے تھے۔کم از کم ابو کی جان تو بچ جاتی۔پورے گھر کے مر جانے سے اچھا تھا کہ کچھ تو بچ جائیں اور میں یہی کر رہا تھا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔انہوں نے یہ سب کچھ معاف کر دینے کے لئے نہیں کیا تھا۔یہ لوگ ڈر اور خوف بٹھا کر ہی حکومت کرتے تھے۔اگر وہ معاف کرنا شروع کر دیتے تو لوگوں کے دلوں سے خوف نکل جاتا۔میں ایسے ہی روتا اور چلاّتا رہا۔انہوں نے ابو کے گلے میں پھندا ڈالا اور لکڑی کے اوپر سے رسی گزار کر انہیں ہوا میں لٹکا دیا۔وہ چار پانچ منٹ تک فضا میں لٹکتے تڑپتے رہے اور آخر ان کا جسم ساکت ہو گیا۔وہ مر گئے تھے۔اچانک ہی خاموشی سے صرف چار پانچ منٹ کی تڑپ، بے بسی اور سب کچھ ختم۔۔۔میں ان کا بے جان جھولتا ہوا جسم دیکھ کر زمین پر گر گیا۔

وہ بہت غریب تھے، وہ غریب مزدور تھے۔ہمارے پاس کھانے کے لئے روٹی تک نہیں تھی۔اسی کھانے کی تلاش میں وانا آئے اور اچانک ہی مر گئے۔زندگی اتنی سستی تو نہیں ہوتی۔پچاس سال کی سانسیں پانچ منٹ میں ہی ختم ہو گئیں۔انہوں نے تو دنیا سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔صرف دو وقت کی عزت کی روٹی، رہنے کی جگہ اور اپنے بچوں کے لئے کمانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن طالبان کے جہاد کی نظر ہو گئے۔امریکی جاسوس؟ وہ ان پڑھ تھے، ان کو تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ امریکہ دنیا کے کس کونے میں ہے۔

’’گاؤں والو! دیکھ لو! اپنی آنکھوں سے دیکھ لو! ہم جاسوسوں کا یہ حال کرتے ہیں۔یہ اور اس کا پورا گھر جاسوس اور اسلام کا دشمن ہے۔آج ہم نے ان پر فتح حاصل کی ہے اور خدا نے انعام کے طور پر ہمیں دو

لونڈیاں عطا کی ہیں۔ اس کی دونوں بیٹیاں مجاہدین کے لئے حلال ہوگئی ہیں اور ہم ان کو لے کر جا رہے ہیں۔'' انہوں نے مجھے اور ابو کو ادھر ہی چھوڑا اور خود ہمارے گھر کی طرف چل پڑے تا کہ امبر اور عریج کو لے کر جا سکیں۔

وہ ان دونوں کو لے کر آج ہی افغانستان کا بارڈر کراس کر کے دوسری طرف چلے جاتے اور پھر دوبارہ ہمیں کبھی بھی ان کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ وہ لونڈیاں بن گئی تھیں۔ اس لئے ایک سے دوسری جگہ بیچ دی جاتیں اور آخر کسی حملے میں ماری جاتیں۔ اب یہی ان کی تقدیر تھی۔ وہ سارے چلے گئے تو جاسم نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ کھول دیئے۔ وہ گاؤں والوں کے ساتھ ہی کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا لیکن آگے بڑھنے کی ہمت اس میں بھی نہیں تھی۔

''علی بھائی! حوصلہ کرو، خدا کو یہی منظور تھا۔'' جاسم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو میں نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''جاسم صاحب! خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔ کونسا خدا اپنے بندوں کو ایسے مارتا ہے؟ وہ جو پھانسی سے لٹک رہا ہے اس کا کیا قصور ہے؟ یہ خدا نہیں ہماری بزدلی ہے جو ہمیں کمزور بنا رہی ہے۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''یار! وہ بہت طاقت ور ہیں۔ ہم ان کے مقابلے پر کچھ بھی نہیں ہیں۔'' وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تمہارے گھر میں اسلحہ ہے؟'' میں نے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔

''مجھے ایک رائفل اور گولیاں چاہئیں، مر جاؤں گا لیکن اپنی بہنوں کو ایسے لے جانے نہیں دوں گا۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''علی بھائی! وہ بہت طاقت ور ہیں۔ تم اور خالہ دونوں ہی مر جاؤ گے اور امبر اور عریج کبھی بھی واپس نہیں آئیں گی۔ اگر ایسے بغیر لڑائی کے جائیں گے تو وہ سات آٹھ مہینے بعد واپس کر دیں گے۔ پلیز! بھائی میری بات مان لو!'' اس نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

''جاسم بھائی! میں پٹھان نہیں ہوں، سرائیکی ہوں۔ ہم لوگ کسی سے لڑتے نہیں ہیں۔ دنیا کی سب سے شریف ترین قوم ہیں۔ لیکن ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر برداشت بھی نہیں کرتے۔ لڑنا ہے اور مر جانا ہے لیکن چپ نہیں رہنا ہے۔'' میں اس کو پکڑ کر اس کے گھر کی طرف چلنے لگا۔

''سوری ابا! میرے پاس ابھی نیچے اتارنے کا وقت نہیں ہے۔'' میں نے پیچھے مڑ کر ابو کے لٹکتے ہوئے

جسم کرد یکھ کر کہا اور بھاگتا ہوا جاسم کے گھر پہنچ گیا۔

ان کے گھر میں اس وقت صرف دو ہی طالبان بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھاگتا ہوا سیدھا اندر کمرے میں چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا نصیر چاچا کا پستول کدھر پڑا ہوتا ہے۔ میں نے ایک سوٹ سے پستول اٹھا کر اسے کاک کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ دونوں طالبان آرام سے چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں کسی چیز کا بھی ڈر خوف نہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ گاؤں والوں پر ان کی دہشت ہی اتنی تھی۔۔۔ لیکن وہ یہاں پر مار کھا گئے۔ میں نے پسٹل سیدھا کیا اور اس سے پہلے کہ انہیں کسی چیز کا احساس ہوتا، میں نے دونوں کو گولی مار دی۔ میں نے انہیں بالکل قریب جا کر شوٹ کیا تھا۔ صرف ایک ایک گولی ہی ان کے سر میں لگی اور وہ ادھر ہی نیچے گر کر فوراً ہی مر گئے۔ میں نے مزید ایک ایک اور گولی ان کو ماری اور مطمئن ہو گیا۔ جاسم اور کریم چاچا دونوں ہی میرے پیچھے کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''چاچا! مجھے ایک بڑی رائفل اور بہت سی گولیاں چاہئیں۔'' میں نے پیچھے مڑ کر کہا تو وہ جلدی سے اندر کمرے میں گھس گئے۔

کمرے میں ایک بڑی کپڑوں والی پیٹی تھی۔ یہ بڑی پیٹی تھی جس میں سردیوں کے لئے کپڑے اور دو رضائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیہاتوں میں ایسی پیٹیاں عام ہوتی ہیں۔ انہوں نے جلدی سے پیٹی سے رضائیاں باہر نکالیں۔ نیچے چار بڑی رائفلیں اور کم از کم پندرہ کے قریب میگزینیں پڑی ہوئی تھیں جو کہ ساری کی ساری فل تھیں۔ اس کے علاوہ گولیوں کے پانچ بڑے بکس بھی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک رائفل اٹھا لی اور اسکے ساتھ میگزینیں اٹھا کر اپنی جیبوں میں ڈالنے لگا۔ میں نے آرمی کا ایک ٹراؤزر پہنا ہوا تھا۔ اس میں ہر طرف جیبیں ہی جیبیں ہوتی ہیں۔ اس ٹراؤزر میں چھ جیبیں تھیں۔ میں نے ہر جیب میں ایک ایک میگزین ڈالی اور رائفل لے کر باہر آ گیا۔

یہ روس کی بنی ہوئی AK47 تھی اور اس کی ایک میگزین میں 30 گولیاں ہوتی ہیں۔ اس طرح میرے پاس آٹھ میگزینیں اور 250 سے اوپر گولیاں تھیں۔ میں گھر سے باہر نکلا تو مجھے سامنے ہی دو مزید طالبان نظر آ گئے۔ رائفل کو میں نے پہلے ہی کاک کیا ہوا تھا۔ میں نے ان کی طرف رائفل کر کے ایک برسٹ مارا تو وہ دونوں ہی زمین پر گرے اور تڑپنے لگے۔ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ یہ رائفل کی گولی تھی۔ نزدیک سے چلائی ہوئی گولیوں نے ان کو زیادہ دیر تک تڑپنے نہیں دیا اور وہ ایک منٹ میں ہی ٹھنڈے

ہو گئے۔

نصیر چاچا کا گھر گاؤں کے درمیان میں تھا جبکہ ہمارا گھر گاؤں سے باہر تھا۔ گاؤں زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن پھر بھی مجھے پانچ منٹ لگ گئے گھر تک آتے آتے، اس دوران میں نے مزید تین اور طالبان کو ڈھیر کر دیا تھا۔ وہ فائرنگ کی آواز سن کر اس طرف آئے اور بغیر کوئی مزاحمت کئے مر گئے۔ جاسم اور نصیر چاچا بھی رائفل لے کر میرے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ انہوں نے بھی میرے ساتھ مل کر لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ابو کریم چاچا کے سب سے پیارے دوست تھے۔ وہ یہاں اس گاؤں میں کریم چاچا کے کہنے پر ہی آئے تھے اور مارے گئے تھے۔ وہ بھی اپنے دوست کی جان کا بدلہ لینے چاہتے تھے۔

طالبان پہلے تو بہت بے خوف اور مطمئن تھے لیکن یکے بعد دیگرے رائفل کے برسٹ کی آواز سن کر وہ بھی تھوڑے محتاط ہو گئے تھے۔ میں ایک گلی کراس کر کے جیسے ہی سامنے ہوا، میرے گھر کے سامنے دو طالبان تیار کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی فائر کھول دیا۔ میں جلدی سے زمین پر گر گیا اور گولیاں میرے اوپر سے ہو کر گزر گئیں۔ یہ سب کچھ لاشعوری طور پر ہو گیا تھا۔ میں انہیں دیکھتے ہی زمین پر لیٹ گیا تھا جبکہ نصیر چاچا اور جاسم گلی کی دوسری طرف ہی رک گئے۔ انہوں نے گولیوں کو گلی کی دیوار میں گھستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

میری قسمت اچھی تھی جو میں نیچے گر گیا۔ اگر میں واپس پلٹ کر دوسری طرف جانا چاہتا تو ہٹ ہو جاتا۔ گولیوں نے مجھے واپس جانے کا موقع نہیں دینا تھا۔ میں نے زمین پر گرتے ہی پلٹا کھایا اور دیوار کے ساتھ چپک کر لیٹ گیا۔ میں ان کے بالکل سامنے گلی میں لیٹا ہوا تھا۔ انہوں نے جب پہلا وار خالی جاتے دیکھا تو دوسری بار میری طرف رائفلیں کیں لیکن انہیں چلانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ان کی ساری توجہ میری طرف تھی اس لئے وہ جاسم اور نصیر چاچا کو نہ دیکھ سکے اور یہی ان کی غلطی تھی۔ جو انہیں موت کے منہ میں لے گئی۔ نصیر چاچا کا چلایا ہوا ایک طویل برسٹ ان دونوں کو چاٹ گیا۔

رائفل کے برسٹ نے ہمارے گھر کی دیوار کو بھی معمولی سا نقصان پہنچایا اور وہاں سے کچھ پتھر ٹوٹ کر دوسرے طرف گھر کے اندر گرے۔ میں ان کے گرتے ہی ایک دم اوپر اٹھا اور بھاگتے ہوئے اپنے گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے گھر کے اندر جانے کی غلطی نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا اندر مزید طالبان ہوں گے۔ چاچا نصیر اور جاسم بھی بھاگتے ہوئے میرے پیچھے پہنچ گئے۔ میں نے انہیں دیوار کے کونے کے ساتھ پوزیشن سنبھالنے کا کہا اور خود دوسری طرف بکریوں کے باڑے کی طرف نکل گیا۔ یہاں کی

دیوار اونچی تھی، میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی تو مجھے ایک موٹا ٹہنہ نظر آ گیا۔ میں نے اس ٹہنے کو دیوار کے ساتھ ٹکایا اور نصیر چاچا کو فائرنگ کا اشارہ کر کے اس ٹہنے کی مدد سے شیڈ کی چھت پر چڑھنے لگا۔ نصیر چاچا نے دوسری طرف سے فائرنگ شروع کر دی تو گھر کے اندر سے بھی فائرنگ کا جواب ملنا شروع ہو گیا۔

طالبان کے پاس بھاری ہتھیار تھے۔ انہوں نے پوری دیوار کو چھلنی کر کے رکھ دیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ لیٹے ہوئے کہنیوں کی مدد سے آگے بڑھنے لگا۔ میں شیڈ کے کنارے پر پہنچ گیا تو میں نے سر کو آگے کر کے ایک نظر نیچے صحن پر ڈالی۔ وہاں دس کے قریب طالبان تھے اور سبھی کمرے کی دیوار کی اوٹ میں لیٹے سامنے دیوار پر فائرنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی فائرنگ سے سامنے والی پوری دیوار ہی گرا دی تھی۔ وہ سب ہی سامنے کی طرف متوجہ تھے اور عقب سے بالکل بے خبر تھے۔ میں بالکل ان کے پیچھے سر پر کھڑا تھا۔ چھت پر چڑھتے ہی میں نے نئی میگزین چڑھا لی تھی۔ پرانی میگزین میں بھی ابھی گولیاں باقی تھیں لیکن میں چانس نہیں لینا چاہتا تھا۔ لڑائی کے دوران میگزین بدلنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ یہ سیکنڈوں کی جنگ ہوتی ہے۔ میگزین خالی ہوئی تو سامنے والا آپ کو دوسری میگزین لگانے کا موقع نہیں دے گا۔ میں چھت پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے سامنے وہ دس کے دس ہی کھڑے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔

میں نے رائفل کا رخ ان کی طرف کر کے پورے کا پورا برسٹ ہی ان پر خالی کر دیا۔ وہ سارے ہی کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین پر گرے اور تڑپنے لگے۔ وہ سب ہی فائرنگ سے ہٹ ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک بھی نہیں بچا تھا۔ میگزین میں جو گولیاں تھیں وہ ساری کی ساری ان کے جسموں کو پھاڑ کر گزر گئی تھیں۔ میں نے جلدی سے میگزین بدلی اور ان تڑپتے ہوئے دہشت گردوں پر ایک اور راؤنڈ مار دیا۔ وہ سارے کے سارے موت کی تکلیف سے گزر رہے تھے اور میں نے ان کی ساری تکلیف دور کر دی۔ گولیوں کی آواز خاموش ہوئی تو باہر موجود جاسم اور چاچا گھری ہوئی دیوار پھلانگ کر اندر آ گئے۔ انہوں نے سامنے مرے ہوئے طالبان کو دیکھا تو مطمئن ہو کر آگے بڑھنے لگے۔

''چاچا! احتیاط سے ۔۔۔ان کے مزید ساتھی اندر کمرے میں بھی ہو سکتے ہیں۔'' میں نے چیختے ہوئے ان کو خبردار کیا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ اندر مزید طالبان بھی تھے۔ ان کی چلائی ہوئی گولیاں سیدھی نصیر چاچا کے سینے پر لگیں اور وہ پیچھے زمین پر گرتے چلے گئے۔ میں نے جلدی سے کمرے کے دروازے پر فائر کھول دیا۔ میں اوپر کھڑا تھا۔ میری چلائی ہوئی گولیاں سیدھی اندر چلی گئیں اور اندر سے مجھے چیخوں کی آواز

سنائی دی اور فائرنگ رک گئی۔ میری چلائی ہوئی گولیوں نے اندراسی کو زخمی کر دیا تھا۔ وہ جلدی سے دروازے سے دور ہو گئے اور باہر فائرنگ کرنے لگے لیکن چونکہ اس وقت وہ کمرے کے اندر سے فائرنگ کر رہے تھے اور نصیر چاچا باہر صحن میں گرے تھے۔ وہ کمرے کے دروازے کے سامنے نہیں تھے۔ اس لئے براہ راست فائرنگ کی زد میں نہیں آ رہے تھے۔ جاسم وہاں سے بھاگ کر دوسرے کمرے کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ نصیر چاچا کو پورا برسٹ لگا تھا اور ان کا پورا سینا کھل گیا تھا لیکن وہ ابھی تک زندہ تھے اور رائفل کو ہاتھ میں تھامے گھسٹ گھسٹ کر کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''چاچا! کمرے کے دروازے سے ہٹ جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔'' میں نے ایک بار پھر چیختے ہوئے کہا تو انہوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

ایک عجیب سی بے بسی اور درد مجھے ان کے چہرے پر دکھائی دیا۔ شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ان کی آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ بہت تکلیف سے سانس لے رہے تھے۔

''چاچا! دروازے سے ہٹ جاؤ۔'' میں نے ایک بار پھر چیختے ہوئے کہا لیکن وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتے رہے۔

اندر سے مزید کچھ فائرنگ ہوئی اور مزید گولیاں آ کر ان کے جسم کے آر پار ہو گئیں۔ انہوں نے ایک جھٹکا کھایا اور ساکت ہو گئے۔ وہ مر چکے تھے۔ میں نے چھت سے چھلانگ لگائی اور صحن میں آ گیا۔

''جاسم! تم مجھے کور کرو میں کمرے کے اندر جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے جاسم سے جا کر کہا اور پھر اسے سمجھانے لگا کہ اس نے کس پوزیشن سے فائر کرنا ہے۔ وہ دروازے کے ایک کونے سے لگاتار فائر کرتا تو میں زمین پر کرالنگ کرتا ہوا کمرے کے اندر چلا جاتا۔ انہیں اس قدر اچانک فائرنگ سے موقع ہی نہ ملتا اور میں اندر پہنچ جاتا۔ جاسم نے فائرنگ شروع کی تو میں نے ایک لمبی قلابازی کھائی اور اڑتا ہوا کمرے کے اندر چلا گیا۔ یہاں تین آدمی تھے۔ جنہیں میں نے ایک جھٹکے میں ہی فائرنگ کر کے مار دیا۔ دو لوگ پہلے ہی مر چکے تھے۔ یہ وہ تھے جنہوں نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر نصیر چاچا کو مارا تھا اور میں نے چھت سے فائرنگ کی تھی۔ یہ دونوں تو ڈائریکٹ میری فائرنگ کی زد میں آ گئے تھے۔ جبکہ باقی تین بعد میں مرے تھے۔

فائرنگ کا دھواں کم ہوا تو مجھے کمرے میں اپنی امی کی لاش پڑی ہوئی نظر آئی۔ ان کا ننگا جسم فائرنگ سے چھلنی ہو گیا تھا۔ میری دونوں بہنوں کو تو کمانڈر اور نائب کمانڈر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جبکہ امی کو ان لوگوں

نے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جس کا یہ سب ریپ کر رہے تھے اور ہم نے اچانک حملہ کیا تو دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آ کر وہ بھی ماری گئی تھیں۔ میں نے ایک بڑی چادر سے امی کا جسم ڈھکا اور بھاگتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ ہم نے ان کے بیس سے زیادہ آدمی مار دیئے تھے۔ ابھی بھی کم از کم چالیس سے اوپر طالبان تھے۔ جن میں سے کچھ تو گاؤں میں تھے۔ جو کہ پہاڑی کی طرف پسپا ہو رہے تھے۔ جبکہ اوپر پہاڑی اور اس سے پرے جنگل میں تھے وہ موجود تھے اور یہی لوگ خطرناک تھے۔ اوپر پہاڑی سے بڑی آسانی سے گاؤں کو ٹارگٹ کیا جا سکتا تھا۔ امبر اور عریج کو بھی ان کے بڑے کمانڈر اپنے ساتھ جنگل لے گئے تھے۔ میں جلدی سے باہر نکلا تو جاسم کمرے کی طرف آ رہا تھا۔

''جلدی باہر نکلو جاسم! طالبان اوپر سے دیکھ رہے ہوں گے۔۔۔ وہ پہاڑی سے فائرنگ کر سکتے ہیں۔'' ہم دونوں بھاگتے ہوئے گھر سے باہر آ گئے۔

اچانک ایک راکٹ اڑتا ہوا آیا اور سیدھا میرے گھر پر آ کر گر گیا۔ ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا اور ہم دونوں اڑتے ہوئے سامنے گلی کی دیوار سے جا لگے۔ راکٹ لانچر نے ہمارے پورے گھر کو اڑا کر رکھ دیا تھا۔ اگر ہمیں ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو ہم گھر کے ملبے کے نیچے دب کر مر چکے ہوتے۔ باہر آ جانے کی وجہ سے ہمیں کچھ چوٹیں تو ضرور آئیں لیکن ہم بالکل ٹھیک تھے۔ میں نے جاسم کا ہاتھ پکڑا اور بھاگتے ہوئے مکان سے دور ہونے لگا۔ میرا رخ گاؤں کی بجائے جنگل کی طرف تھا۔ میں نے بکریوں کے باڑے کی دیوار کو کراس کیا تو دوسری طرف پہاڑی کے اوپر چڑھتے ہوئے کچھ طالبان نظر آ گئے۔ یہ پندرہ کے قریب طالبان تھے۔ جو تین تین گروپوں کی صورت تیزی سے اوپر چڑھ رہے تھے۔ میں نے جاسم کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر روکا اور ہم دونوں درختوں کی اوٹ میں ہو گئے۔

میں نے جلدی سے نئی میگزین لگائی اور جاسم کو اشارہ کر کے دونوں نے ایک ساتھ فائرنگ شروع کر دی۔ ان میں سے دو گروپ تو ہمارے پہلے ہی حملے میں مارے گئے جبکہ باقی گروپوں نے جلدی سے درختوں کی اوٹ میں ہو کر پوزیشنیں لے لیں۔ ہم فائر کر کے تیزی سے دوسری طرف بھاگ گئے اور ایک ڈھلان کے ساتھ گردن نیچی کر کے آگے بھاگتے چلے گئے۔ اس ڈھلان کے اندر سر پہاڑی سے نظر نہیں آتا تھا۔ جہاں سے ہم نے فائرنگ کی تھی وہ جگہ اوپر پہاڑی سے نظر آتی تھی۔ وہاں سے اس بار اکٹھے پانچ راکٹ فائر ہوئے اور اس جگہ پر ایک بھی درخت اپنی جگہ پر سلامت نہ رہا۔ یہ جگہ چونکہ ڈھلان تھی اس لئے ہم دونوں

یہاں محفوظ تھے۔ طالبان کو ایسا لگا جیسے پورے گاؤں نے ہی بغاوت کر دی ہے۔ اس لئے انہوں نے اگلا راؤنڈ گاؤں پر کیا۔ ان کے پاس اسلحہ اور راکٹ لانچر کی کمی نہیں تھی۔ راکٹ پہاڑی سے اڑتے ہوئے نیچے آئے اور گاؤں پر برسنے لگے۔ سارے گاؤں والے فائرنگ کے خوف سے گھروں میں دبکے بیٹھے ہوئے تھے۔ راکٹوں کی بارش شروع ہوئی تو سب لوگ گھروں سے باہر نکل کر بھاگنے اور اپنی جان بچانے لگے۔ وہ سارے شترمرغ کی طرح ریت میں سر دیئے بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ان کی جان بچ گئی ہے۔ لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ وہ بہادروں کی طرح لڑ کر نہیں مر رہے تھے بلکہ بزدلوں کی طرح گھروں میں چھپ کر مار کھا رہے تھے۔ اب جب راکٹ ان کے گھروں پر برسنے لگے تو وہ سب باہر بھاگنے لگے۔

ہر طرف قیامت کا شور سنائی دے رہا تھا۔ ابھی دن کے بارہ بھی نہیں بجے تھے لیکن بارود کے دھوئیں نے اندھیرا کر دیا تھا۔

’’جاسم بھائی! گاؤں والوں کو گھر کے اندر نہیں چھپنا چاہیے تھا۔ وہ بے چارے ایسے ہی اپنی جان سے گئے۔‘‘

کسی بھی لڑائی یا جنگ کی صورت میں یہ پہلا اصول ہوتا ہے کہ آپ کبھی بھی کسی گاڑی یا گھر کو پناہ کے لئے مت استعمال کریں۔ یہ ہمیں محفوظ تو لگتے ہیں لیکن بڑے اور دور سے نظر آنے کی صورت میں یہ دشمن کا پہلا ٹارگٹ ہوتے ہیں۔ دشمن خالی زمین یا گھاس پر فائرنگ نہیں کرتا۔ اگر سامنے گاڑی نظر آئے گی تو وہ سب سے پہلے اس گاڑی کو ہی اڑائے گا۔ گاؤں والے اپنے آپ کو گھروں میں محفوظ سمجھ رہے تھے لیکن راکٹ لانچروں نے سب سے پہلے گاؤں کو ہی کھنڈر بنانا شروع کر دیا۔ میں اور جاسم ڈھلان کی جس جگہ پر چھپے بیٹھے تھے یہاں ایک چھوٹا سا برساتی نالہ تھا جو پہاڑی کی ایک سائیڈ سے ہوتا ہوا اوپر تک جاتا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے ایسے پہاڑی نالوں سے بخوبی واقف ہوں گے۔ میں اور جاسم بھاگتے ہوئے نالے میں سے گزر کر اوپر چڑھنے لگے۔

گاؤں والوں نے جب اپنے گھروں اور بیوی بچوں کو مرتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی گاؤں سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے لگے۔ ہتھیار گاؤں والوں کے پاس بھی بہت تھے اور وہ اس علاقے کو اچھی طرح جانتے بھی تھے۔ اس لئے مقابلہ دونوں طرف سے ہونے لگا۔ طالبان چونکہ اوپر تھے اس لئے وہ نسبتاً زیادہ مستحکم پوزیشن پر تھے۔ میں اور جاسم نالے کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھتے رہے۔ ہمیں تقریباً چالیس منٹ لگ گئے اور ہم سب

سے اوپر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ ہم گاؤں والی پہاڑی کو کراس کر کے اس سے پیچھے والی پہاڑی پر چڑھ گئے تھے۔ گاؤں والے اور طالبان دونوں آپس میں شدید ترین لڑائی لڑ رہے تھے جبکہ ہم طالبان کی پشت پر آ گئے تھے۔ میری چار میگزینیں لگی تھیں جبکہ ابھی بھی میرے پاس مزید چار میگزینیں موجود تھیں اور ایک میری رائفل میں لگی ہوئی تھی۔ میں آتے ہوئے نصیر چاچا کی گولیاں بھی لے آیا تھا۔ جاسم کے پاس بھی پانچ میگزینیں موجود تھیں۔ اسے زیادہ فائرنگ کا موقع نہیں ملا تھا۔ پہاڑی پر پہنچ کر ہم دونوں الگ الگ ہوئے اور اوپر سے فائرنگ شروع کر دی۔ طالبان کو ہم نے دو ونوں سائیڈوں سے گھیر لیا تھا۔ وہ نیچے گاؤں والوں سے مقابلہ کر رہے تھے اور اوپر سے ہم بھی آ گئے تھے۔

میرا اندازہ غلط تھا کہ وہ کم تعداد میں ہوں گے۔ گاؤں والوں سے مقابلہ کر کے ان کے دس کے قریب لوگ مارے گئے تھے لیکن ابھی بھی میرے سامنے تیس کے قریب لڑ رہے تھے۔ میں نے ایک برسٹ مارا اور دو لوگ میری فائرنگ کی زد میں آ کر نیچے گر گئے۔ جبکہ تیسرے نے پلٹ کر میری طرف فائر کیا جو مجھ سے صرف چند انچ کے فاصلے پر لگا اور میں جلدی سے اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری طرف چلا گیا۔ دوسری طرف جاسم نے بھی فائرنگ شروع کر دی اور وہ جلدی سے ادھر ادھر بھاگنے لگے تا کہ چھپنے کا ٹھکانہ ڈھونڈ سکیں۔

یہ ہمارے لئے سنہری موقع تھا۔ میں نتائج کی پروا کئے بغیر باہر نکلا اور ان بھاگتے ہوئے طالبان کا شکار کرنے لگا۔ مجھے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر جاسم بھی شیر ہو گیا اور وہ بھی باہر نکل کر فائرنگ کرنے لگا۔ چونکہ ہم اوپر تھے اس لئے ہمیں پورا علاقہ نظر آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم نے بیس کے قریب مزید طالبان کو ڈھیر کر دیا جبکہ باقی زیرِ زمین بنی ہوئی غاروں میں چھپنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں پہاڑی پر کم از کم چار ڈنکر مجھے نظر آ رہے تھے جن میں وہ طالبان پناہ لئے ہوئے تھے۔

نیچے گاؤں والوں کو بھی لڑائی کے نتیجے کا پتہ چل گیا تھا اور وہ بھی اوپر کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک ایک ڈنکر سے راکٹ اڑتا ہوا نیچے گاؤں والوں کی طرف گرا تو گاؤں والے ایک بار پھر نیچے کی طرف چلے گئے۔ ساری ہی ڈنکروں کا رخ نیچے گاؤں اور مین سڑک کی طرف تھا۔ اصل میں ڈنکر بنائے ہی آرمی کا مقابلہ کرنے کے لئے تھے۔ آرمی نیچے سڑک اور گاؤں سے ہی اوپر کی طرف حملہ کرتی اور اس کو روکنے کے لئے ہی ڈنکر بنائے گئے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی پشت سے بھی وار کر سکتا ہے۔ نیچے پہاڑی پر جا بجا اسلحہ پڑا ہوا تھا۔ یہ وہ اسلحہ اور راکٹ لانچر تھے جو طالبان گاؤں والوں سے مقابلہ پر چلا رہے تھے۔

ان کے مرنے کی صورت میں اب وہ اسلحہ ایسے ہی بکھرا پڑا تھا۔ جبکہ بچ جانے والے طالبان اسے چھوڑ کر ڈنکروں میں پناہ لئے ہوئے تھے۔

جاسم نے اپنی جگہ چھوڑی اور بھاگتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ وہ سارے کے سارے ڈنکروں میں چھپ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ یہاں پہاڑی کے اوپر سے مقابلہ کرنا فضول تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ میں بھی آڑ لے کر نیچے اترنے لگا۔ میری نظر چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ پہاڑی کے اوپر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں اور ان میں اب بھی طالبان چھپے ہو سکتے تھے۔ سبھی کو ڈنکروں میں جانے کا موقع نہیں مل سکتا۔ مجھے انہی سے خطرہ تھا۔ جاسم نیچے پہنچ گیا اور جلدی سے ایک راکٹ لانچر کے نزدیک پہنچ کر اس نے اسے اٹھا لیا۔ ابھی وہ اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک جھاڑی میں ہلچل محسوس ہوئی۔ میں نے رائفل کا منہ اس طرف کیا اور فائر کرنے ہی لگا تھا جب ایک راکٹ اڑتا ہوا وہاں سے نکلا اور سیدھا جاسم سے جا ٹکرایا۔ وہ پہاڑی کے بالکل کنارے پر کھڑا تھا۔ راکٹ اسے اڑاتا ہوا تقریباً پہاڑی سے دس فٹ دور اوپر فضا تک لایا اور وہ نیچے خلا میں گرتا چلا گیا۔

میں نے فائرنگ کا ایک طویل راؤنڈ جھاڑیوں میں لگایا اور بھاگتا ہوا پہاڑی کے کنارے پر آ گیا۔ وہ نیچے کی طرف گر رہا تھا۔ بالکل ایسے جیسے کسی جہاز سے بندہ سیدھا نیچے گرتا ہے۔ ایک سیکنڈ میں ہی اس کا جسم نیچے پہنچا اور پھٹ گیا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز بھاگتا ہوا واپس آیا اور ایک راکٹ لانچر پکڑ لیا۔ صرف ایک مہینے پہلے ہی میں نے گاؤں میں راکٹ لانچر دیکھا تھا اور اسے چلانے کا طریقہ بھی جاسم سے سیکھا تھا۔ وہ بے چارہ تو اسے چلانے کی حسرت لئے ہی اس دنیا سے چلا گیا لیکن اس کی تعلیم میرے کام آنے لگی۔ مجھے وہیں پر راکٹوں کا ایک ذخیرہ بھی نظر آ گیا۔ میں نے پہلا راکٹ تیار کیا اور نشانہ باندھ کر ایک ڈنگر پر فائر کر دیا۔ ایک سیکنڈ میں ہی پورا کا پورا ڈنکر ہی زمین بوس ہو گیا۔ میں نے جلدی سے دوسرا راکٹ لگایا اور دوسرا ڈنکر بھی دھماکے سے اڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں تیسرا راکٹ فائر کرتا ڈنکر سے باہر طالبان کمانڈر یوسف باہر نکلا۔ میں راکٹ لگا رہا تھا۔

اس نے باہر نکلتے ہی رائفل کا رخ میری طرف کیا اور ایک طویل برسٹ مارا۔ گولیاں بجلی کی سی تیزی سے میری طرف بڑھیں میں جلدی سے نیچے کی طرف آنے لگا لیکن مجھے دیر ہو گئی تھی۔ یہ میری غلطی تھی۔ مجھے دور آڑ میں فائر کرنے کے بعد رائفل پکڑ کر پوزیشن لینی چاہیے تھی۔ راکٹوں کے دھماکے میں انہوں نے

ڈنکروں سے باہر نکلنا تھا اور یہی موقع تھا رائفل سے فائرنگ کرنے کا لیکن تیسرے کے چکر میں پڑ کر ہٹ ہو گیا۔ مشین گن کسی گولیاں اڑتی ہوئی آئیں اور میرے سینے اور پیٹ کے آر پار ہو گئیں۔ درد کی ایک تیز لہر مجھے اپنے جسم میں محسوس ہوئی اور میں زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

''بھیا!'' مجھے امبر کی آواز آئی۔

وہ کمانڈر یوسف کے پیچھے پیچھے ڈنگر سے باہر آئی تھی اور مجھے گرتے ہوئے دیکھ کر بھاگتی ہوئی میری طرف آئی۔ کمانڈر یوسف نے رائفل کا منہ اس کی طرف کیا اور ایک بار پھر برسٹ مار دیا۔ میرے حصے سے بچنے والی باقی گولیاں امبر کے حصے میں آئی اور وہ بے چاری مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی زمین پر گری اور فوراً ہی مر گئی۔ اسے تڑپنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ مجھے کمانڈر نے تڑپتا ہوا دیکھا تو رائفل کی میگزین تبدیل کرنے لگا۔ وہ نئی میگزین لگا کر مجھے مارنا چاہتا تھا۔ اچانک مجھے ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی اور تیز شیلنگ ہونے لگی۔ یہ آرمی کا کوبرا ہیلی کاپٹر تھا۔ بالکل کالے سیاہ رنگ کا بڑا سا ہیلی کاپٹر جو طالبان کے لئے دہشت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کمانڈر اور اس کے پیچھے کھڑے باقی طالبان شیلنگ کے پہلے راؤنڈ میں ہی زمین پر آ گئے۔

میں نے جلدی سے ایک لوٹنی لگائی اور ایک بڑے پتھر کے نیچے سرک گیا۔ آرمی ہیلی کاپٹر شیلنگ بغیر کسی تعطل کے جاری تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرا ہیلی کاپٹر بھی آ گیا اور وہ مسلسل پہاڑی اور اس سے پیچھے جنگل میں فائرنگ کر رہے تھے۔ وہ بغیر دیکھے اور بغیر سوچے مسلسل شیلنگ کر رہے تھے۔ ان کی نظر میں دوست اور دشمن سب برابر تھے۔ آرمی کے کام کرنے کا طریقہ ہی ایسے ہوتا ہے۔ میں اسی لئے پتھر کے نیچے سرک گیا تھا اور مزید فائرنگ سے بچ گیا۔ مجھے ایک پورا رائفل برسٹ لگا تھا اور میرا سینہ اور پیٹ چھلنی ہو گیا تھا۔ جسم سے خون باہر نکلنا شروع ہوا تو مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے اس کے بعد ہوش تین دن بعد پشاور کے آرمی ہسپتال (CMH) میں آیا۔

ڈاکٹروں کی تین دن کی مسلسل کوشش مجھے واپس زندگی کی طرف لے آئی تھی۔ پہلے تو وہ مجھے بھی ان طالبان کا ساتھی سمجھے تھے لیکن میری چھوٹی بہن نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اسی نے آرمی والوں کو میرا بتایا تھا۔ عریج بچ گئی تھی۔ وہ چوتھے ڈنکر میں تھی۔ راکٹوں کی گونج اور دھماکوں سے دونوں ڈنکروں کے طالبان باہر بھاگ کر آ گئے تھے اور آرمی ہیلی کاپٹر کی اچانک شیلنگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ یہ ادھر ڈنکر میں ہی فائرنگ کی آواز سن کر سہم کر بیٹھ گئی تھی اور پھر خوف سے ہی بے ہوش ہو گئی۔ اسے بعد میں آرمی کے کمانڈرز نے ریسکیو کیا تھا۔

پہاڑی اور اس کے پیچھے جنگل میں سارے ہی طالبان مارے گئے تھے۔ یہ اسّی کے قریب تھے۔ جن میں سے ساٹھ کو تو ہم نے جہنم واصل کیا تھا۔ جبکہ باقیوں کو آرمی کے کوبرا ہیلی کاپٹر کی شیلنگ نے مار گرایا تھا۔ گاؤں والوں کا بہت نقصان ہوا تھا۔ ان کے سو سے اوپر عورتیں، بچے اور لوگ مر گئے تھے۔ جاسم اور نصیر چاچا بھی مارے گئے۔ پہاڑی پر صرف میں اور میری چھوٹی بہن عریج ہی بچے تھے۔ ہمارا سب کچھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ آرمی والوں کو میری بہادری اور ہمت کا گاؤں سے پتہ چلا تو سپیشل پشاور کے کور کمانڈر مجھ سے ملنے ہسپتال آئے۔ انہوں نے مجھے شاباش دی اور نقد انعام بھی دے کر گئے۔ مجھے صدر اور آرمی چیف کی طرف سے بھی انعام ملے۔

عریج آرمی کے ایک کواٹر میں آرمی کی ایک خاتون ڈاکٹر کے ساتھ ہی رہنے لگی۔ وہ روزانہ صبح صبح آجاتی اور شام تک میرے ہی پاس رہتی۔ مجھے مکمل ٹھیک ہونے میں چار مہینے لگ گئے۔ میرا ایک گردہ زخمی ہو گیا تھا جسے انہوں نے نکال دیا۔ اس کے علاوہ سامنے سینے کی تین پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں تھیں۔ جن کی جگہ پر انہوں نے لوہے کی لگا دیں۔ میرے معدے میں بھی گولی لگی تھی لیکن اسے ٹانکے لگا کر سی دیا گیا۔ میری ٹانگیں اور ہاتھ بچ گئے تھے۔ اس لئے میں جسمانی طور پر تقریباً فٹ تھا اور بھاگ دوڑ سکتا تھا۔ ہر قسم کا کام یا مزدوری کر سکتا تھا۔ مجھے ہسپتال سے چھٹی ملی تو میں عریج کو لے کر پہلے لاہور آیا اور نصیر چاچا کے دونوں پلاٹوں کا کلیم لے کر اسے بیچ دیا اور بہاولپور چلا گیا۔

اس بار میں ہر خان میں اپنے پرانے گاؤں کی بجائے چنن پیر (Channan Pir) سے کوئی پچاس کلومیٹر آگے روہی کے بالکل وسط میں موجود ایک چھوٹے سے گاؤں میں آ گیا۔ یہ صرف دس گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس گاؤں کا کوئی نام نہیں تھا اور نہ ہی نقشے پر اس کی نشاندہی تھی۔ یہاں ایک ڈھابہ تھا جس کے گرد یہ گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سارے گھر ایک ہی خاندان کے تھے۔ بارش کا پانی تالاب میں جمع ہوتا تھا جسے یہ لوگ سارا سال استعمال کرتے تھے۔ گاؤں کی ساری معیشت کا انحصار بکریوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ بکریاں پالتے تھے اور ان کو بیچ کر اپنے لئے خوراک خریدتے تھے۔ بکریوں کا دودھ یہ خود ہی پی جاتے تھے یا پھر بچوں کو پلا دیتے تھے۔ مہینے میں ایک بار ایک بڑا ٹرک راشن لے کر آتا تھا۔ یہ لوگ اس سے دالیں، چاول اور آٹا خریدتے تھے اور بدلے میں اس کو اپنی بکریاں بیچتے تھے۔

ٹرک کا مالک میرا دوست تھا اور وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ مہینے میں ایک بار بہاولپور شہر بکریاں

لے جاتا تھا اور انہیں مویشی منڈی لے جا کر بیچتا اور راشن خرید کر لے آتا تھا۔ ریگستان کے بالکل وسط میں موجود یہ قبیلہ موجودہ دنیا کی ہر قسم کی سہولتوں سے بے خبر تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہر مہینے کس تاریخ کو بہاولپور آتا ہے۔ اس بار وہ بہاولپور آتا تو میں بھی عریج کو لے کر اس سے منڈی میں مل گیا۔

''اوہ علی۔۔۔ مجھے یہ سب کچھ سن کر بہت دکھ ہوا، مجھے واقعی بہت افسوس ہے۔ تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔'' میں نے اسے اپنی کہانی سنائی تو اس نے دکھ سے بولتے ہوئے کہا۔

''علی! تم واقعی بہت ہمت والے ہو۔ تم نے نہ صرف ان کا مقابلہ کیا بلکہ ان کو مار کر اپنا بدلہ بھی لے لیا۔'' ہم تینوں مویشی منڈی سے باہر ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔

''اچھا! اب آگے کیا ارادہ ہے؟ کیا کرنے کا سوچا ہے تم نے؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سافی بھائی! میں آپ کے قبیلے میں کچھ عرصہ رہنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔'' اس کا اصل نام تو سرفراز تھا لیکن سب اسے سافی کے نام سے پکارتے تھے۔

''ہاں ہاں! کوئی بات نہیں یار۔۔۔ تمہارا جب تک دل چاہے تم ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو۔ تم میرے بھائی ہو اور میرا گھر بھی تمہارا ہی گھر ہے۔ ہم سب تمہارے اپنے ہیں یار!'' اس نے محبت سے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہم اسی دن اس کے ساتھ اس قبیلے میں آ گئے۔ میرے پاس حکومت کی طرف سے دیئے گئے پیسے اور دونوں پلاٹ فروخت کرنے سے کافی پیسہ آ گیا تھا۔ یہ تقریباً پچاس لاکھ سے اوپر روپیہ تھا۔ یہ بہت بڑی رقم تھی جسے میں نے بنک میں جمع کروا دیا تھا۔ غریب آدمی کے لئے تو پچاس ہزار بھی بہت ہوتے ہیں جبکہ میرے پاس پچاس لاکھ روپیہ تھا۔ ہم دونوں پاکستان کے کسی بھی شہر میں بڑے آرام سے رہ سکتے تھے۔ اتنا پیسہ ہم سے ساری زندگی بھی ختم نہ ہوتا۔ میرا ارادہ کچھ اور تھا۔ طالبان نے میرے پورے گھر کو تباہ کر دیا تھا۔ میرے ماں باپ اور بڑی بہن کو مار دیا تھا۔ میں نے بھی ان کو مار کر اپنا بدلہ لے لیا تھا لیکن ابھی بھی میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ میں طالبان پر ایک اور ضرب لگانا چاہتا تھا۔

میں بہت معمولی انسان تھا اور اس جنگ کو اکیلا نہیں لڑ سکتا تھا۔ یہ جنگ طویل تھی کیونکہ طالبان بہت مضبوط تھے۔ مختلف ملکوں کی حکومتوں کی ان سے لڑائیاں، معاشی فوائد، سیاسی فوائد اور اقتدار کی جنگ ان

طالبان کو مضبوط کرتی تھی۔ خدا نے مجھے ایک نئی زندگی دی تھی تو میں کچھ بڑا کرنا چاہتا تھا۔ ہم سافی (Safi) کے ساتھ اس کے قبیلے میں آ کر رہنے لگے۔ میں سافی کے ساتھ ہی بکریاں چرانے لگا۔ عزیج اور میری ہنس مکھ طبیعت نے بہت جلد گاؤں والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس قبیلے کو گاؤں سے باہر کسی چیز کا پتہ نہیں تھا۔ یہاں میرے اور عزیج سمیت کوئی 35 لوگ رہتے تھے۔ جبکہ بکریوں کی تعداد تین سو سے اوپر تھی۔ میں یہاں اس گاؤں میں تقریباً آٹھ مہینے تک رہا اور پھر آخر کار ایک نتیجے تک پہنچ گیا۔

''سافی بھائی! میں ایک آدمی کو اغوا کر کے ادھر لانا چاہتا ہوں۔ طالبان نے اسلام کا نام استعمال کر کے اسے بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ دنیا آج اسلام کو ایک دہشت گرد مذہب سمجھنے لگی ہے۔ میں اس امیج کو ختم کرنا چاہتا ہوں، جہاد کرنا چاہتا ہوں۔'' میں اور سافی دونوں اس وقت تالاب (ٹوبہ) کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''علی بھائی! جہاد کا کیا مطلب ہے؟ میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا ہوں۔ آپ کس کو اغوا کر کے یہاں لانا چاہتے ہیں؟'' اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

''ایک آدمی ہے۔۔۔ اسے یہاں تک لاؤں گا تو اپنے کچھ مطالبات منوا سکوں گا۔ یار دنیا کے حالات دن بدن خراب ہو رہے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو ایک دن سارے ہی ختم ہو جائیں گے۔ دنیا کو اس جنگ سے بچانا ہمارا فرض ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تم میرا ساتھ دو گے؟ سافی! کیا میری مدد کرو گے؟'' میں نے اس سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے علی بھائی! میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اسلام کے نام پر میری جان بھی حاضر ہے۔ آپ بولو کیا کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''میں نے بتایا ہے کہ ایک آدمی کو اغوا کر کے کچھ دن ادھر رکھنا ہے اور بس کوئی خون خرابہ نہیں ہو گا۔''

''اس نے کہا ٹھیک ہے، جیسے آپ کہتے ہو۔۔۔ بندہ کون ہے جسے اغواہ کرنا ہے؟ کوئی بڑا آدمی ہے؟'' اس نے تالاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! بہت بڑا آدمی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھائی! کہیں چیمہ صاحب کو تو اغوا کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟ یار! بچ کر۔۔۔ اسے پورا بہاولپور جانتا

ہے۔اسے اغوا کر کے ہم بچ نہیں سکیں گے۔'' اس نے پریشانی سے کہا۔

''نہیں یار! یہ ہمارے چیمہ صاحب سے بھی بڑا آدمی ہے۔ میں ڈونلڈ ٹرمپ (Donald Trump) کو اغوا کر کے ادھر لانا چاہتا ہوں۔'' میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگا لیکن اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی۔اس نے کوئی بھی ری ایکشن نہیں دیا تھا۔

''علی بھائی! یہ ڈونلڈ ٹرمپ کس بلا کا نام ہے؟ یہ ہے کون؟ طالبان کا کوئی لیڈر ہے؟ اور کیا چیمہ صاحب سے بھی بڑا آدمی ہے؟'' مجھے اب اس کے سپاٹ چہرے کا راز معلوم ہوا۔ وہ ڈونلڈ ٹرمپ کو جانتا ہی نہیں تھا۔اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ ڈونلڈ ٹرمپ کون ہے۔

''علی بھائی! امریکہ کا صدر ہے۔ میں اسے اس قبیلے میں لانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

''کیا یار! مذاق کیوں کرتے ہو، امریکہ کا صدر یہاں کہاں آسکتا ہے؟ اتنے بڑے خواب نہیں دیکھتے۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''نہیں سافی! نہیں! خواب نہیں دیکھ رہا، میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ میں اس ٹرمپ کو اغوا کر کے یہاں اس قبیلے میں لاؤں گا۔'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے! آپ لے آؤ۔۔۔ ہم سب اس کی ادھر مضالحت بھی کریں گے اور جو آپ کہو گے ہم وہی کریں گے۔آپ نے بولا ہے کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔ میں نے آپ کو اپنا بھائی بولا ہے اور سب کچھ ہی آپ سے سیکھا ہے۔ہم لوگوں کو تو اسلام بھی تم نے سکھایا ہے تو پھر آپ کیسے کوئی کام غلط کر سکتے ہو۔'' وہ واپس اپنے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔

''علی بھائی! میں نے آج تک آپ کو کوئی غلط بات کہتے ہوئے نہیں سنا ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے بھی آپ کی بات پر یقین کر سکتا ہوں۔'' وہ اپنی جھونپڑی میں چلا گیا۔ جبکہ میں ادھر ہی تالاب کے کنارے بیٹھا رہ گیا۔

''آجاؤ بھائی! رات ہو گئی ہے۔'' مجھے عریج کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی اس طرف آگئی تھی۔

''آجاؤ بھائی! اب کافی رات ہو گئی ہے۔'' وہ میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

''عریج! میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔کچھ بڑا کام۔'' میں نے اس کو اپنے پاس بٹھالیا۔

''بھائی! کونسا کام کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے کہا۔

''یار! طالبان کی دہشت آج بھی مجھے رات کو سونے نہیں دیتی۔ وہ لوگ آج بھی معصوموں کو مار رہے ہیں اور ہم سب لوگ بس خاموشی سے تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ میں ایک بار پھر ان سے لڑنا چاہتا ہوں۔'' میں نے پرسکون ہو کر تالاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی! وہ لوگ بہت برے ہیں، وہ سب کو مار دیتے ہیں۔آپ مت جاؤ ان کے پاس! ہم یہاں پر ٹھیک ہیں۔ میں ادھر ان بکریوں کے پاس بہت خوش ہوں۔'' اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''ہم نے اپنا پورا گھر کھو دیا تھا۔ ہمارے گھر میں سے صرف ہم دونوں ہی بچے تھے۔ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ میں نے سب کو کھو دیا ہے اور اب ایک بھائی کو کھونا نہیں چاہتی ہوں۔''

''عریج! میں بہت مجبور ہوں۔ابو کا رسّے سے جھومتا ہوا جسم آج بھی مجھے خوابوں میں دکھائی دیتا ہے۔ میں ایک بار پھر لڑنا چاہتا ہوں۔ میرے سینے میں ابھی تک آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ ایک بار پھر طالبان کے خون سے ہی ٹھنڈی ہو گی۔'' میری آواز لڑکھڑا گئی۔

''عریج! اس دن دونوں طرف کے دو سو کے قریب لوگ مارے گئے تھے۔ طالبان نے ابو کو لٹکایا تھا اور تم دونوں کو لے کر چلے گئے تھے۔صرف تم دونوں کو بچانے کے لئے میں نے رائفل اٹھائی تھی۔ دو لڑکیوں کو بچانے کے لئے دو سو لوگ مارے گئے تھے۔ مجھے پانچ گولیاں لگیں لیکن میں پھر بھی بچ گیا۔آرمی کے ہیلی کاپٹروں نے پوری پہاڑی کو شیلنگ سے تباہ کر دیا تھا۔ پہاڑی کی کوئی ایک انچ جگہ بھی ایسی نہیں بچی تھی جہاں آرمی کی گولی نہ لگی ہو۔لیکن پھر بھی ہم دونوں اسی پہاڑی کے اوپر محفوظ رہے۔ یہ زندگی خدا نے روہی (Rohi) کے اس ٹوبے (تالاب) کے گرد چکر لگانے کے لئے نہیں دی ہے۔ میں اس زندگی کو بکریاں چراتے ہوئے نہیں گزار سکتا، میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی! میں آپ کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے سب کچھ کھو دیا ہے اور اب آپ کو نہیں کھو سکتی۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''نہیں عریج! تیرا بھائی کمزور نہیں ہے جو اتنی جلدی مر جائے۔اگر میری قسمت میں مرنا ہی لکھا ہوتا تو میں ادھر وانا کی پہاڑیوں میں ہی مر جاتا۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا اور کامیاب ہو کر واپس آؤں گا۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور اپنی جھونپڑی میں آ گیا۔

دوسرے دن سافی نے شہر بکریاں لے کر جانا تھا۔ میں نے عرتج کو سافی کے ماں باپ کے حوالے کیا اور خود سافی کے ساتھ شہر آ گیا۔ بہاولپور آتے ہی سافی تو مویشی منڈی چلا گیا جبکہ میں نے لاہور والی بس پکڑ لی۔ میں نے امریکی صدر کو اغوا کرنے کا ارادہ تو کر لیا تھا لیکن اس کے لئے بہت زیادہ پیسے کی ضرورت تھی۔ میرے پاس پچاس لاکھ روپیہ تھا لیکن یہ رقم اس کام کے لئے کچھ بھی نہیں تھی۔ پچاس لاکھ سے تو میں امریکہ ہی پہنچ سکتا تھا۔ جبکہ وہاں سے امریکی صدر کو اغوا کرنا اور پاکستان لانا، اس کے لئے لاکھوں کی نہیں کروڑوں بلکہ اس سے بھی زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔

میرے ذہن میں ایک پلان تھا اس لئے ہی میں پہلے لاہور آ گیا تھا۔ یہاں پر میں نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ یہ لاہور کے پوش علاقے سمن آباد (Samanabad) میں دو کمرے کا سنگل سٹوری مکان تھا۔ یہ بہت گنجان آباد علاقہ تھا۔ انتہائی تنگ گلیوں میں بالکل نکڑ پر گھر تھا۔ شہروں میں ویسے ہی ایک دوسرے سے کسی کو کوئی غرض نہیں ہوتی ہے۔ یہ بھی ویسا ہی علاقہ تھا۔ سارے ہی سنگل سٹوری اور پرانے مکانات تھے۔ پورا علاقہ ہی مزدوروں پر مشتمل تھا۔ میرے لیے یہ جگہ بہترین تھی۔ لاہور کا سب سے امیر آدمی چوہدری شہباز تھا۔ اسے پاکستان میں پراپرٹی ٹائیکون کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے پاس اربوں روپیہ تھا۔ پورے پاکستان میں کوئی بھی ایسا شہر نہیں جہاں اس کی ہاوسنگ سوسائٹی نہ ہو۔ عمر چالیس سال کے قریب تھی، شادی شدہ تھا اور اس کا ایک بارہ سال کا بیٹا تھا۔ میرا ارادہ اس کے بیٹے کو اغوا کر کے تاوان سے پیسہ وصول کرنا تھا۔ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میں اگر اس کے بیٹے کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ میری مطلوبہ رقم آسانی سے دے سکتا تھا۔ کام بہت مشکل تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔

انسان جب ارادہ کر لیتا ہے تو خدا بھی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی دیتا ہے۔ میں نے پچھلے تین مہینے سے شیو نہیں کی تھی۔ میری عمر ابھی صرف بیس سال ہی ہوئی تھی۔ میں کلین شیو بہت ینگ لگتا تھا۔ میں نے داڑھی اور مونچھیں بڑھا لیں تو اپنی عمر سے تھوڑا بڑا نظر آنے لگا۔ ایک دن میں نے گھر میں ہی گزارا اور دوسرے دن میں اس کے گھر کے سامنے سے گزر کر وہاں کا ماحول دیکھنے لگا۔ میرے ساتھ دو اور آدمی بھی تھے۔ یہ بھی اس کام میں میری مدد کر رہے تھے۔ اصل میں جب سے میں نے طالبان کو لڑائی میں شکست دی تھی۔ کچھ لوگ میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ یہ پاکستان کے وہ جوشیلے نوجوان تھے جو اپنے بل بوتے پر ہی کچھ کرنا چاہتے تھے۔ میرا

ان سے رابطہ پشاور کے CMH ہسپتال میں ہی ہو گیا تھا اور وہ لوگ مجھ سے اسلام اور جہاد کی باتیں کر کر کے مجھے جوش دلاتے رہتے تھے تا کہ میں ان کے ساتھ مل کر طالبان کے خلاف لڑوں۔ میں پہلے پہل تو انہیں ٹالتا رہا۔ میرے کندھوں پر میری جوان بہن کا بوجھ تھا۔ میں اگر شہید ہو جاتا تو اس کا میرے بعد کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اپنی باقی زندگی اپنی چھوٹی بہن کے لئے جینا چاہتا تھا۔ اس کی کسی اچھے سے لڑکے سے شادی کرتا اور پھر خود بھی کسی لڑکی سے شادی کر کے آرام سے زندگی گزارتا۔ اس جنگ میں کچھ نہیں رکھا تھا۔ وہ مسلسل میرے پیچھے لگے رہے اور آخر کار مجھے اپنی طرف مائل کر ہی گئے تھے۔ یہ ٹوٹل پچاس نوجوان تھے جو پشاور یونیورسٹی میں اکٹھے ہی پڑھتے تھے۔ نوجوان اور کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق تھا لیکن اس طرف آ گئے تھے۔ میں نے ان کا ساتھ دینے کی حامی بھری اور بجائے بندوق لے کر طالبان سے لڑنے کے، بڑا کام کرنے کا ارادہ کیا۔

میں امریکی صدر کو اغوا کر کے پاکستان لانا چاہتا تھا۔ یہ بہت بڑا کام تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ناممکن نہیں ہے۔ اگر صحیح طریقے سے اور پلان بنا کر کام کیا جاتا تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ میں بہاولپور صرف جگہ کا انتظام ہی کرنے گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا صدر ایک بار اغوا ہو جائے تو پوری دنیا کی ایجنسیاں حرکت میں آ جاتیں ہیں۔ اغوا کرنا آسان تھا لیکن اس اغوا کو برقرار رکھنا بہت مشکل تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ ہی چھپانے کا تھا۔ امریکی CIA پوری دنیا کو بھی کھنگال کر اپنے صدر کو تلاش کرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ ہم دنیا کے کسی بھی کونے میں صدر صاحب کو چھپا نہیں سکتے تھے۔ میں اسی لئے راجستھان گیا تھا تا کہ وہاں کے حالات دیکھ سکوں اور وہ جگہ واقعی خفیہ رکھی جا سکتی تھی۔

ان لوگوں کو بھی اس جگہ کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ یہ صرف اتنا جانتے تھے کہ میں جنوبی پنجاب کا رہنے والا ہوں اور جنوبی پنجاب ملتان سے شروع ہو کر صادق آباد تک جاتا تھا۔ اس میں دس سے اوپر اضلاع شامل تھے۔

''علی بھائی! یہ ناممکن ہے۔ میں پچھلے ایک ہفتے سے جاسوسی کر رہا ہوں۔ چوہدری صاحب کے بیٹے کو اغوا کرنا ناممکن ہے۔'' ہم تینوں اس وقت ایک ہوٹل کے باہر رکھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''اس کا گھر نہیں قلعہ ہے۔ دس دس فٹ کی دیوار ہے اور اس کے اوپر تین فٹ کی تار لگی ہے۔ جس میں پورے 240 وولٹ کا کرنٹ دوڑتا رہتا ہے۔ اندر بیس کے قریب سیکورٹی گارڈ ہیں اور دس کے قریب ملازم۔۔۔ اسکے علاوہ پچاس کتے بھی ہیں۔۔۔ شکاری کتے۔ ہم کسی بھی طریقے سے گھر کے اندر داخل نہیں

ہو سکتے ، یہ ناممکن ہے علی بھائی!'' اس نے ایک بار پھر ناممکن بولتے ہوئے اپنے سر کو نفی میں ہلایا۔

''اچھا ٹھیک ہے، گھر کے اندر تو نہیں جا سکتے لیکن باہر سے تو اغوا کر سکتے ہیں؟ راستے سے یا سکول سے۔۔۔کسی دوست یار شتے دار کے پاس تو جاتے ہونگے؟'' میں نے چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

''جی بھائی! میں نے وہ بھی نوٹ کر لیا ہے۔ گھر سے روزانہ صبح 7 بجے لڑکے کو سکول لے جانے کیلئے تین کاریں نکلتی ہیں اور آگے آرمی پبلک سکول جاتی ہیں۔ سکول تو کینٹ کے اندر آرمی کا ہے۔ وہاں پر تو اغوا کے بارے میں سوچنا بھی حرام ہوگا۔ جب سے پشاور میں اٹیک ہوا ہے، سکولوں کی سیکورٹی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور یہ تو آرمی پبلک سکول ہے۔ یہاں سارے ہی افسروں اور جرنیلوں کے بیٹے پڑھتے ہیں۔ ہم صرف چھ لوگ ہیں اور پوری آرمی سے نہیں لڑ سکتے۔ کاریں تینوں ہی بلٹ پروف ہیں اس لیے نہ ہی آپ کاروں کو روک سکتے ہیں اور نہ ہی اڑا سکتے ہیں۔ سو یہ ناممکن ہے، کوئی اور پلان بناؤ بھائی جی!'' اس بار دوسرے نے پوری تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔ ناممکن کے الفاظ وہ بھی لگانا نہیں بھولا تھا۔

''اگر ہم بارود سے بھری ہوئی گاڑی گیٹ سے ٹکرا دیں اور فائرنگ کرتے ہوئے اچانک اندر جا گھسیں تو کیا کامیابی مل سکتی ہے؟ یہ پنجاب کا ایریا ہے، سیکورٹی گارڈ بے شک 100 بھی ہوں تب بھی وہ لوگ اچانک حملے سے بوکھلا جاتے ہیں اور کچھ بھی نہیں کر پاتے۔ گاڑی گیٹ کو توڑ کر دھماکہ کرے گی اور فائرنگ کی آواز چاروں طرف سے آ رہی ہوگی تو سبھی سیکورٹی گارڈ اپنی اپنی جان بچانے کے لئے چھپ رہے ہوں گے۔ ہمارا ایک آدمی تو پہلے ہی اندر ملازم بنا ہوا ہے۔ وہ انہی بلٹ پروف گاڑیوں میں سے کسی ایک کو استعمال کر لے گا اور باہر لے آئے گا۔ ہم بھی پانچ دس منٹ تک ایسے ہی فائرنگ کریں گے اور واپس بھاگ جائیں گے۔ جبکہ وہ ملازم تب تک بچے کو لے کر دور نکل چکا ہوگا۔'' میں نے مسلسل بولتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھائی! یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ جو سامنے آپ بڑا گیٹ دیکھ رہے ہیں یہ صرف فرسٹ سیکورٹی گیٹ ہے۔ اصل گیٹ اس کے بعد آتا ہے۔ اس بنگلے میں دو گیٹ ہیں۔ ایک پہلا اور تقریباً دس میٹر آگے جا کر ایک اور گیٹ آتا ہے، وہ مرکزی گیٹ ہے۔ آپ بارود سے پہلا گیٹ اڑائیں گے تو دوسرا آگے آ جائے گا۔ ہم دو گاڑیاں لے کر جاتے ہیں اور دونوں گیٹوں کو اڑا دیتے ہیں تو پھر بھی اس کے بعد تیسری رکاوٹ بھی ہے۔ یہ لوہے کے تین تین فٹ اونچے پول ہیں۔ جو آگے زمین کے اندر ہوتے ہیں اور ان کا کنکشن ڈائریکٹ گیٹ سے ہوتا ہے۔ جیسے ہی باہری گیٹ کو نقصان پہنچے گا۔ وہ خود بخود زمین سے باہر آ جاتے ہیں اور اس کے

بعد کوئی بھی گاڑی وہاں سے باہر نہیں جاسکتی۔اصل عمارت سومیٹر آگے ہے اور اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ جہاں سوئمنگ پول، مساج سنٹر اور باڈی بلڈنگ کلب وغیرہ بنے ہوئے ہیں۔دیواریں لوہے اور کنکریٹ کی بنی ہوئی ہیں۔آپ جتنے مرضی دھماکے کریں وہاں سے پتھر تو ٹوٹے گے لیکن سوراخ نہیں ہوگا۔'' پہلے والے نے مجھے اس بار پوری تفصیل سے بتایا اور میں قائل ہوگیا۔واقعی یہ ناممکن تھا۔اس گھر سے ہم کبھی بھی لڑکے کو اغوا نہیں کر سکتے تھے۔میرے دوستوں نے کام واقعی بہت عمدہ کیا تھا۔انہوں نے پورے گھر کی تفصیل لی تھی۔ ان کی ایک ایک نکتے پر نظر تھی۔مجھے اب کینٹ کے اندر سکول میں کاروائی کے لئے پلان بنانا تھا۔میں نے ان سے مزید دو دن کا ٹائم لیا اور دوسرے آپشن پر غور کرنے لگا۔

''علی بھائی! اچھی طرح سوچ لو، ہم میں سے ایک لڑکا اغوا نہیں ہو رہا ہے۔اپنے ہی ملک میں ایک چھوٹے سے بچے کو اغوا کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں تو امریکہ کے صدر کو کیسے اغوا کریں گے؟ علی بھائی! خواب دیکھنا چھوڑ دو اور کوئی دوسرا کام کرتے ہیں۔'' انہوں نے ہوٹل والے کو چائے کی ادائیگی کی اور واپس چلے گئے۔جبکہ میں ادھر ہی بیٹھا سوچتا رہ گیا۔

دوسرے دن میں نے ایک چکر کینٹ کا بھی لگا لیا لیکن وہ علاقہ بھی انتہائی محفوظ تھا۔کینٹ کے اندر کاروائی کی صورت میں ہم میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ بچتا۔میں سارا دن اسی علاقے میں گھومتا رہا لیکن مجھے کوئی بھی صورت نظر نہ آئی۔آخر تھک ہار کر ایک ہوٹل کے باہر رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گیا اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ویٹر کھانا لے کر آیا تو میں ایک ایک نوالہ کر کے روٹی کھانے لگا۔ہوٹل کے کونے پر ایک بڑا ٹی وی (TV) رکھا ہوا تھا۔جس پر ایک پاکستانی نیوز چینل لگا ہوا تھا۔ٹی وی پر نجم سیٹھی کا بیان آرہا تھا۔جو انتہائی زور وشور سے پاکستان سپر لیگ (PSL) کا فائنل لاہور میں کروانے کا بول رہا تھا۔PSL کے میچ دوبئی میں ہو رہے تھے جبکہ اس کا فائنل لاہور میں کروانے کا اعلان کیا گیا تھا۔میں سرسری طور پر نجم سیٹھی کا بیان سننے لگا۔

''ابا! میں نے بھی میچ دیکھنا ہے۔'' میرے ساتھ والے ٹیبل پر ایک فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔جن کا ایک دس سالہ بچہ میچ میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔

''ہاں ہاں! کیوں نہیں۔۔۔ہم سب ہی میچ دیکھنے جائیں گے۔'' اس کے والد نے بچے کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔

میرے دماغ میں اچانک ایک جھماکہ سا ہوا۔چوہدری شہباز کا بیٹا بارہ سال کا تھا اور لازمی اس کو بھی

کرکٹ سے دلچسپی ہوگی۔ پاکستان میں سبھی لڑکوں کو کرکٹ کا جنون ہوتا ہے۔پچھلے طویل عرصے سے پاکستان میں کوئی ایک بھی انٹرنیشنل میچ نہیں کھیلا گیا تھا۔یہ پہلا میچ تھا اور میرا اندازہ تھا کہ وہ بھی لازمی کرکٹ میچ دیکھنے آئے گا۔ میں نے جلدی سے اپنے دوستوں کا نمبر ملایا اور انہیں اسی وقت ملنے کا کہا۔وہ سارے مایوس ہو چکے تھے لیکن میری کال سنتے ہی آدھے گھنٹے میں ہی ہوٹل پہنچ گئے۔اس بار سارے ہی اکٹھے آ گئے تھے۔ان میں وہ آدمی بھی تھا جو چوہدری صاحب کے گھر میں ملازم تھا۔

''جی علی بھائی! اب کیا پروگرام بنایا ہے؟'' وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔قذافی سٹیڈیم میں پاکستان سپر لیگ (PSL) کا فائنل ہو رہا ہے۔

''کیا چوہدری اور اس کا بیٹا بھی میچ دیکھنے آئیں گے؟'' میں نے اس آدمی سے براہ راست پوچھا جو چوہدری کے گھر میں ملازم تھا۔

''جی بھائی! چوہدری اور اس کا بیٹا دونوں ہی میچ دیکھنے جائیں گے۔چوہدری کا بیٹا حارث کرکٹ بہت شوق سے کھیلتا ہے اور وہ لوگ انتہائی بے چینی سے فائنل کا انتظار بھی کر رہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے! مجھے بہت زیادہ مقدار میں بارود چاہیے اور ریموٹ کنٹرول ڈیٹونیٹر چاہیے۔تین ڈیٹونیٹر اور رائفلیں بھی چاہئیں۔کیا یہ سب انتظام کر سکتے ہو؟'' میں نے ان کے سرغنہ سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔میں نے موبائل سے قذافی سٹیڈیم اور اس کے آس پاس کے ایریا کا نقشہ دیکھ کر ایک پلان بنا لیا تھا۔

''کیا ایک چھوٹے بم (Bom) کو سٹیڈیم کے اندر لے کر جا سکتے ہو؟'' میں نے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

''نہیں علی بھائی! قذافی سٹیڈیم کی نگرانی ہوتی ہے اور وہاں انتہائی سخت سیکورٹی ہے۔واک تھرو گیٹ بنے ہوئے ہیں اور کسی بھی قسم کا اسلحہ یا بارود ہم سٹیڈیم کے اندر نہیں لے جا سکتے۔'' اس نے انکار کر دیا۔

''کیا باہر سے بھی اندر نہیں پھینک سکتے،ہم دیوار کے اوپر سے اندر پھینک سکتے ہیں اور دوسری طرف والا آدمی ادھر سے اٹھا لے۔'' میں نے ایک اور تجویز دی جسے اس نے پھر مسترد کر دیا۔

''علی بھائی! سٹیڈیم کی دیوار کے اوپر سیکورٹی کیمرے اور سنسرز لگے ہوئے ہیں۔ہم کوئی بھی چیز اوپر سے نہیں پھینک سکتے۔کیا آپ سٹیڈیم میں دھماکہ کرنا چاہتے ہیں؟'' اس نے غصے سے میری طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔

''علی بھائی! ہم دہشت گرد نہیں ہیں۔ دہشت گردوں کے خلاف لڑتے آئے ہیں نا کہ اپنے ہی شہریوں کو مارنے اور پاکستان کا میچ خراب کرنے۔۔۔۔اگر ایسی بات ہے تو آپ جا سکتے ہو،ہمیں آپ کے ساتھ کام نہیں کرنا ہے۔'' اس کا غصہ ابھی تک برقرار تھا۔

''نہیں یار! میں دھماکہ نہیں چاہتا،صرف تھوڑی سی بھگدڑ مچانے سے میرا کام بن جائے گا۔یار! میں مسلمان ہوں اور کسی بھی بے گناہ کی جان نہیں لوں گا۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ سارے میری بات سن کر تھوڑے مطمئن ہو گئے۔

''آپ بارود کا انتظام کرو میں صبح ایک چکر سٹیڈیم کا لگاتا ہوں اور پھر کوئی اچھا سا پلان بناتا ہوں۔'' میں نے ان لوگوں سے کہا اور واپس گھر آ گیا۔

دوسرے دن صبح صبح میں قذافی سٹیڈیم آ گیا۔فائنل کو ابھی پورا ایک ہفتہ پڑا ہوا تھا لیکن اس کی تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئیں تھیں۔ 27,000 تماشائیوں کی گنجائش والا یہ سٹیڈیم پاکستان کا سب سے بڑا اسٹیڈیم ہے۔فائنل میچ کو ابھی ایک ہفتہ پورا پڑا تھا۔اس لئے ابھی تک یہاں عام آدمی کا داخلہ منع نہیں ہوا تھا۔ یہاں پر سختی بہت زیادہ تھی۔ پورے سٹیڈیم میں ہی ہر طرف پولیس والے نظر آرہے تھے۔خفیہ پولیس کے اہلکار بھی تھے جو سادہ کپڑوں اور ٹریک سوٹ میں گھوم رہے تھے۔لاہور میں ایک دھماکہ ہو گیا تھا اور اس وجہ سے ہی پنجاب حکومت نے انتہائی سختی کر دی تھی۔ یہ سختی صرف قذافی سٹیڈیم تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ پورے شہر میں ہی نظر آرہی تھی۔ لاہور شہر ایک قلعہ ہی بن گیا تھا۔ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑی جنگ ہونے والی ہو۔ واقعی یہ جنگ ہی ہو رہی تھی۔جس کا کچھ حصہ میڈیا پر بھی نظر آرہا تھا۔

لاہور میں ہونے والی دہشت گردی کی ایک واردات کو اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تھا کہ اس کی دہشت دبئی میں ہونے والے PSL تک پہنچ گئی تھی اور پاکستان سپر لیگ میں کھیلنے والے سبھی غیر ملکی کھلاڑیوں نے فائنل میچ پاکستان آکر کھیلنے سے انکار کر دیا تھا۔کرکٹ بورڈ کے چیئر مین نجم سیٹھی تھے۔ یہ PSL کا دوسرا سیزن تھا۔نجم سیٹھی نے پہلے سیزن میں ہی اعلان کر دیا تھا کہ اگلے سال PSL کا فائنل پاکستان میں ہوگا۔ پاکستان میں آخری انٹرنیشنل میچ 2009ء میں ہوا تھا۔جس میں سری لنکا کی ٹیم پر حملہ ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں سری لنکا کی ٹیم ٹیسٹ میچ ادھورا چھوڑ کر واپس چلی گئی تھی۔ 2009ء سے لے کر

2017ءتک پچھلے آٹھ سال سے انٹرنیشنل کرکٹ کے دروازے پاکستان پر بند ہو گئے تھے۔

پاکستان کرکٹ بورڈ(PCB) مسلسل انہی کوششوں میں لگا ہوا تھا کہ انٹرنیشنل کرکٹ واپس پاکستان میں آجائے۔ پاکستان میں کرکٹ آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی اور اسی وجہ سے پاکستان پچھلے دس سال سے کوئی بھی بڑا ایونٹ نہیں جیت سکا تھا۔ مجھے نجم سیٹھی سے کوئی ذاتی لگاؤ نہیں ہے۔ مجھے اس کے ماضی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ایک لکھاری ہوں اور لکھاری کو ہمیشہ نیوٹرل ہونا چاہیے۔ مجھے عمران خان، نواز شریف اور زرداری تینوں سے محبت ہے۔ یہ میرے ملک کے لیڈر ہیں۔ جو ٹھیک کام کرتا ہے اسے ٹھیک لکھنا چاہیے اور جو غلط ہے اسے غلط لکھنا چاہیے۔

نجم سیٹھی جیسا بھی ہے لیکن ایک حقیقت ہمیں تسلیم کرنی چاہیے کہ اس بندے کی محنت نے کرکٹ کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔اس نے PSL کروانے کا فیصلہ کیا تو پورا پاکستان اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ پاکستان سپر لیگ ہو رہی ہے اور وہ بھی دوبئ میں۔۔۔ ایک لوکل سپر لیگ کبھی بھی ملک سے باہر نہیں ہوتی۔ لوکل ٹورنامنٹ ہمیشہ ملک کے اندر ہی ہوتے ہیں لیکن اس نے وہ ٹورنامنٹ ملک سے باہر کروایا اور ایک کامیاب ترین ٹورنامنٹ ثابت ہوا۔اس کا دوسرا سیزن بھی منعقد ہوا اور اس کا فائنل پاکستان میں کروایا۔

حکومت اور اپوزیشن دونوں لاہور دھماکے کے بعد فائنل میچ لاہور میں کروانے کا رسک نہیں لے رہی تھیں۔اس نے وفاقی گورنمنٹ اور پنجاب گورنمنٹ کو نہ صرف قائل کیا بلکہ پنجاب گورنمنٹ سے پولیس کے ساتھ ساتھ آرمی کی سیکورٹی بھی لی۔ پنجاب گورنمنٹ کبھی بھی آرمی کو پنجاب میں انوالو نہیں کرتی لیکن اس نجم سیٹھی نے سب کو قائل کیا۔ پوری اپوزیشن میڈیا پہ آ کر چیخ رہی تھی کہ فائنل لاہور میں مت کرو، لیکن اس اکیلے نجم سیٹھی نے نہ صرف یہ فائنل پاکستان میں کروایا بلکہ پوری دنیا کو دکھا دیا کہ پاکستان ایک مضبوط ملک ہے۔ پورے ملک میں حکومت کا کنٹرول ہے اور ملک کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں ہے جو حکومت کے کنٹرول سے باہر ہو۔

یہی نجم سیٹھی زمبابوے کی ٹیم کو پاکستان میں کھلانے کے لئے بھی لے کر آیا تھا۔اپوزیشن اس بار بھی چیختی رہی کہ زمبابوے کو بہت زیادہ پیسہ دیا گیا ہے۔ بات پیسے کی نہیں ہوتی، کھلاڑی جب کھیلتے ہیں تو انعام تھوڑا یا زیادہ نہیں ہوتا۔ بات صرف انٹرنیشنل امیج کو صحیح کرنے کی تھی اور انٹرنیشنل کرکٹ کو پاکستان میں واپس لانے کی تھی۔اس کے لئے واقعی نجم سیٹھی نے بہت محنت کی ہے اور اسی آدمی کی محنت نے پاکستان کو ICC

چمپیئن ٹرافی میں جتوایا اور پاکستان نویں نمبر سے چھلانگ لگا کر ورلڈ چمپیئن بنا۔ سارا پاکستان ہی لاہور میں فائنل کروانے سے ڈر رہا تھا لیکن نجم سیٹھی اڑا ہوا تھا۔ ملک کی سبھی سیکورٹی ایجنسیاں قذافی سٹیڈیم کو محفوظ بنانے میں لگی ہوئی تھیں لیکن میں اسی سیکورٹی کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سٹیڈیم کے اندر ایک دھماکہ کرنا چاہتا تھا اور اس دھماکے کے لئے پلان بنا رہا تھا۔ یہاں پر مزید تفصیل لکھنے سے پہلے میں نجم سیٹھی کی ذہنیت کی ایک اور بات کر دوں۔ صرف ایک چھوٹی سی بات سے آپ کو اس کے محبّ وطن ہونے کا پتہ چل سکے گا۔

ICC کے اس وقت 12 ممبر ممالک ہیں۔ اس میں افغانستان، زمبابوے اور آئرلینڈ بھی شامل ہیں۔ بڑے ممالک میں انگلینڈ، آسٹریلیا، ساؤتھ افریقہ اور انڈیا شامل ہیں جبکہ باقی چھوٹے ممالک ہیں۔ ICC پر مکمل اجارہ داری انگلینڈ کی تھی۔ ICC کے سبھی بڑے فیصلے انگلینڈ کرتا تھا اور ICC کی آمدن کا آدھا حصہ بھی انگلینڈ لے جاتا تھا۔ جبکہ باقی آدھا حصہ سات ممالک میں برابر تقسیم ہوتا تھا۔ ICC کی نوے فیصد آمدن انڈیا سے ہوتی تھی۔ (میں کرکٹ کا تجزیہ نگار نہیں ہوں اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہ اعداد و شمار بالکل مختلف ہوں۔ یہ صرف میری ذاتی رائے ہے، حقیقت اس سے مختلف بھی ہوسکتی ہے) جبکہ اسے منافع دس فیصد بھی نہیں ملتا تھا۔

انڈیا کی آبادی ڈیڑھ ارب ہے اور کم از کم ایک ہزار کے قریب ٹی وی چینل ہیں۔ انڈیا میں کرکٹ کو بھگوان کا درجہ حاصل ہے۔ ڈیڑھ ارب کی آبادی والے اس ملک میں بچے سے لے کر بوڑھے تک سبھی کرکٹ سے جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ ننانوے ملکوں کی ٹوٹل آبادی کو بھی اکٹھا کیا جائے تو تب بھی انڈیا کی آبادی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کرکٹ کی ساری کمائی انڈیا سے ہوتی ہے تو منافع پر بھی انڈیا کا اتنا ہی حق ہونا چاہیے۔ یہ بات انڈین کرکٹ نے کی جو آگے چل کر بگ تھری کی بنیاد بنی۔ انڈین کرکٹ بورڈ منافع میں اپنا پورا حصہ وصول کرنا چاہتا تھا۔ وہ کرکٹ پر انگلینڈ کی اجارہ داری ختم کرنا چاہتا تھا۔ بنیادی طور پر یہ بات ٹھیک تھی اور نجم سیٹھی اس بات کو جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ICC انڈیا کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔ اس لئے وہ بگ تھری کی حمایت کرنا چاہتے تھے اور اس کے بدلے میں انڈیا سے پاکستان کرکٹ بورڈ سے مراعات وصول کرنا چاہتے تھے۔

سپریم کورٹ نے نجم سیٹھی کو چیئرمین کی سیٹ سے اتار کر دوبارہ ذکاء اشرف کو چیئرمین بنا دیا اور ذکاء اشرف بگ تھری کی مخالفت کرنے لگے۔ وہ معصوم آدمی تھے۔ انہیں دنیا کے حالات کو سمجھنا چاہیے تھا۔ اپنے

آپ کو محبّ وطن ثابت کرنے کے لئے انہوں نے بگ تھری کی مخالفت میں ووٹ دے دیا۔ ہمارے میڈیا نے بھی اس وقت ان کی پوری حوصلہ افزائی کی لیکن گورنمنٹ انہیں ہٹا کر دوبارہ نجم سیٹھی کو لے آئی اور انہوں نے دوبارہ بگ تھری کی حمایت کی لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ انڈین کرکٹ بورڈ کے ساتھ ہمارے تعلقات خراب ہو چکے تھے اور یہ تعلقات آج تک خراب چلے آ رہے ہیں۔

ہمارے میڈیا نے نجم سیٹھی کو انڈین کا وفادار اور غدار تک کہا۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ ہماری وفاداری کو انڈیا کے ساتھ کیوں جوڑا جاتا ہے؟ کیوں ہم پر زور دیا جاتا ہے کہ ہم انڈیا سے نفرت کریں؟ کیا ہم انڈیا سے نفرت کئے بغیر محبّ وطن پاکستانی نہیں ہو سکتے؟ نجم سیٹھی میں لاکھ برائیاں سہی لیکن بہر حال وہ پاکستان کا وفادار ہے اور پاکستان کا مفاد ہی دیکھ رہا تھا۔ ہم بگ تھری کی حمایت کر کے انڈیا کے ساتھ کرکٹ بھی کھیل سکتے تھے اور اپنے کھلاڑیوں کو IPL میں بھی کھلا سکتے تھے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ دنیا میں ورلڈ کپ کے بعد سب سے بڑا ایونٹ IPL ہی ہوتا ہے اور اس IPL نے ہی کرکٹ کو تیز بنا دیا ہے جو کہ پاکستانیوں پر بین ہے۔ نجم سیٹھی نے اگر کچھ اچھا کیا ہے تو ہمیں سیاست سے اوپر ہو کر اس کی حمایت کرنی چاہیے۔

میں سٹیڈیم میں گھوم پھر کر سیکورٹی کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ میرے دو دوست بھی آئے ہوئے تھے۔ ہم سب الگ الگ ہو کر ماحول کا جائزہ لے رہے تھے۔ سیکورٹی واقعی بہت سخت تھی۔ یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ 27,000 ہزار کا ہجوم یہاں فائنل دیکھنے آ رہا تھا۔ ایک بہت بڑا ایونٹ جس میں آرمی چیف اور وزیر اعظم بھی شریک ہونے والے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ آرمی کے بڑے بڑے آفیسر اور مختلف وزیر بھی آتے۔ یہ پاکستان کا سب سے بڑا ایونٹ ہونے جا رہا تھا۔ ہمارے سیکورٹی ادارے یہاں فول پروف سیکورٹی دینے والے تھے۔ یہ پاکستان کی عزت کا سوال تھا۔ اس عزت کو ختم کرنے کے لئے دشمن بھی میدان میں اتر چکا تھا۔

دشمن اپنا پورا زور لگا رہا تھا کہ پاکستان یہ فائنل نہ کروا سکے۔ اگر یہ فائنل پاکستان میں ہو جاتا تو انٹرنیشنل کرکٹ کے دروازے پاکستان پر کھلنا شروع ہو جاتے اور یہی چیز ہمارے دشمنوں کو منظور نہیں تھی۔ وہ اس فائنل میں کوئی کاروائی کرنا چاہتے تھے۔ وہ فائنل میں سٹیڈیم کے اندر یا سٹیڈیم سے باہر کوئی دھماکہ کر دیتے تو دوبارہ زندگی میں کبھی کرکٹ پاکستان میں نہ آتی۔ اس لئے دونوں طرف پورے زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سیکورٹی ادارے اس فائنل کو کامیاب کرنے کے لئے کام کر رہے تھے جبکہ دشمن اس فائنل کو ناکام

بنانے کے لئے کام کررہا تھا۔ دونوں طرف ہی کام ہورہا تھا۔ جبکہ ایک چھوٹا سا کام میں بھی کررہا تھا۔ ہر شخص کے اپنے اپنے مفادات اس PSL کے فائنل سے جڑے ہوئے تھے۔ مجھے کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اس کرکٹ سے بہت اوپر سوچ رہا تھا۔ مجھے اس سٹیڈیم سے ایک بچے کو اغوا کرنا تھا اور اس کے لئے میں فائنل والے دن سٹیڈیم کے اندر ایک دھماکہ کرنا چاہتا تھا تاکہ افراتفری پھیلے اور میں اس افراتفری کا فائدہ اٹھا کر بچے کو اغوا کرسکوں۔ 27,000 ہزار افراد کے ہجوم میں اگر بھگدڑ مچتی تو پھر اس ہجوم کو سنبھالنا ناممکن ہوجاتا اور میں اس بھگدڑ میں سے ایک بچے کو آسانی سے اغوا کرکے لے جاسکتا تھا۔ اس کے ساتھ لازمی گارڈ وغیرہ ہوتے لیکن جب افراتفری ہوتی ہے تو سب ہی اپنی اپنی جان بچانے کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ دس دس ہزار تنخواہ لینے والے پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز ہوتے ہیں اور ان کی تربیت بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ پولیس اور انٹیلی جنس کا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا ایونٹ تھا جس میں ملک کے تقریباً سبھی بڑے بڑے آفیسرز اور سیاست دان آرہے تھے اور اسی حساب سے سیکورٹی کے انتظامات بھی ہونے تھے۔ میں اس سیکورٹی کو توڑنا چاہتا تھا۔

''علی بھائی! یہ ناممکن ہے۔ ہم چوہدری شہباز کے بنگلے پر حملہ کرکے تو بچ سکتے ہیں لیکن یہاں پر بچہ اغوا کرنا تو دور کی بات ہے، ہمیں اپنی جانیں بچانی بھی مشکل ہوجائیں گی۔ اتنی پاورفل سیکورٹی کو توڑ کر ایک لڑکے کو باحفاظت اغوا کرکے لے جانا ناممکن ہے۔ ہم میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔ یہ خودکشی ہے علی بھائی!'' میرے سامنے بیٹھے ہوئے اسد نے کہا۔ یہ راولپنڈی سے تھا اور پشاور میں انجینئرنگ کررہا تھا۔ یہ ان پانچ لڑکوں میں سب سے سینئر اور ذہین تھا جو میرے اس کام میں میری مدد کررہے تھے۔

''نہیں اسد بھائی! مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ جان کا خطرہ ضرور ہے لیکن کامیاب ہونے کے امکان بھی ہیں۔ ابھی تو صرف ہمیں پاکستان کی سیکورٹی ایجنسیوں کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ صرف ایک لڑکے کو اغوا کرنا ہے اور ہم اس کو ناممکن کہہ رہے ہیں۔ جب صدر کو اغوا کرنے کی باری آئے گی تو پھر کیا کہیں گے؟ وہ تو سپر پاور ہے۔ امریکہ کی ایجنسیاں دنیا کی نمبرون ایجنسیاں ہیں۔ ہم یہاں پاکستان کی ایجنسیوں سے گھبرا رہے ہیں تو آگے امریکی ایجنسیوں کے سامنے تو بالکل ہی گھٹنے ٹیک دیں گے۔'' میں نے ایک چھوٹی سی تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''حوصلہ رکھو یار! سر پر کفن باندھ کر گھروں سے نکلے ہیں تو پھر موت کا ڈر کیوں؟'' میں نے اپنے

سامنے بیٹھے ہوئے اسد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''علی بھائی! موت کا ڈر نہیں ہے۔ہم میں سے کوئی بھی مرنے سے نہیں ڈرتا۔صرف زندگی کے ضائع ہونے سے ڈر لگتا ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ غلط ہو رہا ہے۔ہم اسلام اور پاکستان کی خدمت کرنے کی بجائے اس کا نام بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔علی بھائی! اگر فائنل والے دن قذافی سٹیڈیم میں دھماکہ ہوتا ہے تو اس سے پاکستان کا نام تو بدنام ہو جائے گا۔ہم وزیرستان جا کر طالبان سے لڑ سکتے ہیں اور کشمیر جا کر انڈین آرمی سے بھی لڑ سکتے ہیں۔جہاد تو وہاں ہو رہا ہے۔پاکستان کے اندر کوئی بھی کاروائی کرنا جہاد تو نہیں ہے بلکہ یہ تو دہشت گردی ہے۔کہیں ہم دہشت گرد تو نہیں بن رہے ہیں؟ کہیں ہم اسلام اور پاکستان کا امیج تو خراب نہیں کر رہے؟'' وہ بدستور الجھا ہوا تھا۔

''نہیں اسد بھائی! ہم کچھ بھی غلط نہیں کر رہے ہیں۔میں نے اس جنگ میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو کھویا ہے۔مجھے اس درد کا احساس ہے جو کسی اپنے کو کھونے سے ہوتا ہے۔میرے ہاتھ سے کبھی کسی بے گناہ کا خون نہیں بہے گا۔طالبان کے خلاف جا کر لڑنے سے یا پھر کشمیر میں جا کر لڑنے سے یہ جنگ ختم نہیں ہوگی۔ہم ایک کو ماردیں گے تو دس اور آجائیں گے ان کی جگہ لینے کے لئے۔۔۔کس کس کو ماریں گے؟ جنگ کرنے سے جنگ ختم نہیں ہوتی بلکہ مزید نفرتیں پیدا ہوتی ہیں جو اگلی جنگ کا ذریعہ بنتی ہیں۔ہمیں اس جنگ کی مین جڑ کو پکڑنا ہوگا۔اس جنگ کے مقصد کو ختم کر دیں گے تو جنگ خود بخود ہی ختم ہو جائے گی۔میں اس ہاتھ کو کاٹنا چاہتا ہوں جو انہیں پیسہ دیتا ہے اور اپنے مفاد کے لئے ان کو لڑواتا ہے۔اسد بھائی! نیت سچی ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے۔'' میں وہاں سے اٹھ کر آ گیا اور ایک بار پھر سٹیڈیم میں گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا۔

اسٹیڈیم کی عمارت بہت اونچی تھی اور اس عمارت کے اوپر جگہ جگہ سیکورٹی کیمرے بھی لگے ہوئے تھے۔ پولیس والے بھی چوبیس گھنٹے پہرہ دیتے تھے۔اسٹیڈیم کے آس پاس والے بھی چوبیس گھنٹے پہرہ دیتے تھے۔ اسٹیڈیم کے آس پاس جتنی بھی عمارتیں تھیں انہیں بھی نئے کرایہ داروں کے لئے بین کر دیا گیا تھا۔ان رہائشی عمارتوں میں کوئی بھی نیا کرایہ دار آ کر نہیں رہ سکتا تھا۔اس کے علاوہ پولیس اور انٹیلی جنس والے ان گھروں کی تلاشی بھی لے رہے تھے۔پولیس کا ایک پورا اسکواڈ صرف اسی کام پر لگا ہوا تھا۔ان کے ساتھ انٹیلی جنس کے افراد بھی تھے اور ان کے پاس مکمل اختیارات تھے۔وہ کسی بھی گھر میں گھس جاتے اور پورے گھر کو چھان ڈالتے۔ان کے پاس پانچ گاڑیاں اور دس سے اوپر موٹر سائیکل تھے۔جو چوبیس گھنٹے ان کالونیوں میں

گھومتے رہتے تھے اور مشکوک افراد کو روک روک کر تلاشی لیتے رہتے تھے۔ سٹیڈیم کے اندر اور باہر دونوں طرف انتہائی فول پروف سیکورٹی کا انتظام تھا۔

''اسد بھائی! یہ ٹائلٹ کا پانی کہاں جاتا ہے؟'' میں اور اسد دونوں ٹائلٹ کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ اندر لیڈیز اور جینٹس کے لئے علیحدہ علیحدہ ٹائلٹ بنے ہوئے تھے۔

''میں نے نقشہ دیکھا ہوا ہے! ٹائلٹ کے نکاس لئے تو یہیں سٹیڈیم کے اندر ہی زیرِ زمین انتظام ہے۔ البتہ واش روم میں چونکہ زیادہ پانی استعمال ہوتا ہے تو اس کے پانی کو ایک پائپ لائین کے ذریعے سٹیڈیم کے باہر زیرِ زمین لے جایا جاتا ہے۔ یہاں سے تقریباً آٹھ سو میٹر دور کینال برانچ گزر رہی ہے۔ یہ سارا پانی اس میں چلا جاتا ہے۔ یہ بہت چھوٹا پائپ ہے اور اس میں سے آدمی نہیں گزر سکتا۔ یہ یورپ نہیں ہے بھائی جان! جہاں پانی کی نکاسی کے لئے بڑی بڑی سرنگیں ہوتی ہیں۔'' اس نے مجھے پوری تفصیل بتاتے ہوتے کہا۔

''آؤ ایک بار، میں اس سسٹم کو پھر دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں اسے لیکر واش روم کے اندر گھس گیا۔

یہاں مردانہ ٹائیلٹ کے ساتھ ہی دو چھوٹے چھوٹے واش روم بھی بنے ہوئے تھے۔ میں ایک واش میں چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا واش روم تھا جس کا المونیم کا دروازہ تھا اور اوپر فوارا لگا ہوا تھا۔ یہ پورٹ ایبل فوارہ تھا جس کو ہینگر سے باہر نکال کر اس سے پیر بھی دھوئے جاسکتے تھے۔ نیچے سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی ٹائلیں لگی ہوئی تھیں۔ واش روم کے بالکل درمیان میں ایک 6x6 انچ کا سوراخ تھا۔ جس کے اوپر 8x8 کی لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی۔

''اسد! تمہارے پاس کوئی پیچ کس وغیرہ ہے؟'' میں نے پیچھے مڑ کر اسد سے کہا۔

''نہیں بھائی! پیچ کس تو سیکورٹی والے اندر نہیں لے کر آنے دیتے۔ میرے پاس گاڑی کی چابی ہے، اگر اس سے کام ہوسکتا ہے۔'' اس نے جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

گاڑیوں کی چابیاں عام چابیوں سے تھوڑی لمبی ہوتی ہیں۔ میں نے اس سے چابی لی اور اسے لوہے کی جالی سے اٹکا کر چابی کو باہر نکال لیا۔ یہ لوہے کی جالی تھوڑی بھاری ہوتی ہے جو بالکل کسی ڈھکن کی طرح لگی ہوتی ہے اور اسے آسانی سے باہر نکالا جاسکتا ہے۔ لوہے کی جالی موٹے کچرے کو پائپ میں جانے سے روکتی ہے۔ نہاتے وقت بعض اوقات ہاتھوں سے انگوٹھی گر جاتی ہے تو اس جالی کی وجہ سے وہ انگوٹھی اندر پائپ میں جانے سے بچ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پلاسٹک کے شاپر یا دوسرے پیکٹ وغیرہ بھی پائپ میں جانے سے بچ

جاتے ہیں جو کہ پائپ میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔
یہ جالی ان سب چیزوں سے حفاظت کرتی ہے۔ یہ اندر فکس نہیں ہوتی بلکہ ڈھکن کی طرح اسے باہر نکالا جا سکتا ہے تا کہ پائپ کے اندر صفائی وغیرہ کی جا سکے۔ نہاتے ہوئے سر کے بال اور مٹی وغیرہ گرتی ہے۔ جو نیچے پائپ میں جمع ہو جاتی ہے۔ جالی کو نکال کر وہاں صفائی کی جا سکتی ہے۔ میں نے جالی کو باہر نکالا اور پائپ کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ بڑی عمارتوں میں واش روم کے اندر دو جالیاں لگائی جاتی ہیں۔ ایک تو اوپر ہوتی ہے جبکہ دوسری ایک فٹ مزید اندر لگی ہوتی ہے۔ جسے پیچ کس کی مدد سے ہی کھولا جا سکتا ہے۔ یہ جالی سیکورٹی کے لئے لگائی جاتی ہے لیکن یہاں پر ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ میرا پورا بازو پائپ کے اندر گھس گیا۔ اندر دوسری جالی لگانے کی زحمت ہی نہیں کی گئی تھی۔ میں نے اپنا بازو باہر نکالا اور دوبارہ جالی لگا کر واش روم سے باہر آ گیا۔

''اسد بھائی! ہمارا کام ہو گیا۔ آپ بارود کا انتظام کریں اور پھر دیکھیں کے آگے کیا کیا ہوتا ہے۔'' میں نے اسد سے کہا اور اسٹیڈیم سے باہر آ گیا۔

اس کے بعد اسد تو ایک لڑکے کو اپنے ساتھ لے کر بارود کا انتظام کرنے چلا گیا جبکہ میں دوسرے لڑکے کے ساتھ اندرون شہر کی طرف آ گیا۔ یہاں وزیر اعلی پنجاب نے ایک تازہ تازہ پل بنایا ہوا تھا جو بہت بڑا اور مضبوط پل تھا۔ میڈیا کے اوپر اس کا کافی دن چرچا رہا تھا۔

''راشد بھائی! ہمارا ملک جس دن ان پلوں اور سڑکوں کی سیاست سے باہر آ گیا اس دن ترقی بھی کر جائے گا۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ کا کام سڑکیں اور پل بنانا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا کام صوبے میں قانون کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ اگر لاہور کے کسی تھانے، ہسپتال یا ائیر پورٹ پر کوئی اہلکار آپ سے بدتمیزی کرتا ہے یا آپ سے رشوت لیتا ہے تو اس کا جواب دہ وزیر اعلیٰ ہوتا ہے۔ وزیر اعلیٰ کا کام سرکاری اداروں کو چلانا ہوتا ہے سڑکیں اور پل بنانا نہیں ہوتا۔ جبکہ ہمارے ملک میں تو وزیر داخلہ بھی دو دو کلومیٹر کی سڑکیں بنوا رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کے اپنے ہی حلقے کے تھانے میں ہر روز رشوت لی جا رہی ہوتی ہے۔ ہم صرف آرمی کو قصور وار ٹھہراتے ہیں کہ وہ ملکی معاملات میں بار بار مداخلت کرتی ہے۔ اصل قصور وار تو ہمارے سیاست دان ہیں جو خود اپنا کام ہی نہیں کرتے۔ یہاں تو ایک معمولی کونسلر سے لے کر وزیر اعظم تک سبھی کو سڑکیں اور پل بنانے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اگر حکومت میں آ کر سڑکیں اور پل ہی بنانے ہیں تو پھر ہم عوام کو اس سے کیا فرق پڑتا

ہے کہ کون حکومت کر رہا ہے۔ یہ کام تو انگریز بھی بہت اچھے طریقے سے کر رہے تھے۔ بلکہ ان سے زیادہ اچھے طریقے سے کر رہے تھے۔ کم از کم وہ ان سڑکوں اور پلوں سے کمیشن تو نہیں کھاتے تھے۔ دو لاکھ کی سڑک دو کروڑ میں نہیں بناتے تھے۔'' میں اس پل کے اوپر چڑھ کر اس کی مضبوطی چیک کرنے لگا۔ کافی مضبوط پل تھا اور چھ مہینے کے قلیل عرصے میں تیار کیا گیا تھا۔ ہمیں گھومتے گھومتے کافی دیر ہو گئی تھی اس لئے واپس گھر آ گئے۔

دوسرے دن صبح صبح میں نے ایک دکان سے پتنگ اڑانے والی ڈور لی۔ یہ پلاسٹک کی ڈور تھی اور ٹوٹتی نہیں تھی۔ گلا کاٹ دیتی تھی لیکن پھر بھی ٹوٹتی نہیں تھی۔ لاہور شہر میں ایسی ڈور منع تھی لیکن پھر بھی شہر کی دکان سے مل جاتی تھی اور سرے عام بک رہی تھی۔ پنجاب کے سب سے بڑے اور مرکزی شہر لاہور کی ہر دکان سے پلاسٹک کی ڈور مل رہی تھی۔ یہ لاہور کی حالت ہے جہاں وزیر اعلیٰ بیٹھتا ہے باقی پورے ملک کا کیا حال ہو گا۔ اس کا اندازہ بھی آپ کو ہو گیا ہو گا۔ پلاسٹک، شیشہ یا مانجا لگی ہوئی ڈوروں کو ختم کرانے کی جواب داری شاید کسی کی بھی نہیں ہے۔ کام تو صرف سڑکیں اور پل بنانے کا ہی ہے۔ اس کے علاوہ تو پورے پاکستان میں مکمل امن اور شانتی ہے، اور کوئی کام ہی نہیں ہے اس ملک میں۔۔۔ مجھے بڑی آسانی سے ڈور مل گئی۔

مجھے قذافی سٹیڈیم سے لے کر کینال برانچ تک کے لئے ڈور چاہیے تھی اور ایک ڈور نا کافی تھی۔ میں نے وہاں سے تین ڈوریں اٹھائی اور ایک سپورٹس کی دکان سے گولف کی چھوٹی گیند لے کر گھر آ گیا۔ یہاں پر میں نے ایک باریک تار کو گرم کر کے گولف کی گیند میں سوراخ کیا تاکہ ڈور کو اس میں سے گزار کر گانٹھ دے سکوں۔ یہ پلاسٹک کی چھوٹی اور بھاری گیند تھی۔ میں آسانی سے اس میں سوراخ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور واپس سٹیڈیم آ گیا۔ میرے ساتھ اسد اور راشد دونوں تھے۔ ہم تینوں نے ایک ایک ڈور جیب میں ڈال لی تھی۔ یہ پلاسٹک کی ڈور تھی اور میٹل ڈیٹکٹر سے آسانی سے گزر گئی۔ ہماری تلاشی لیتے ہوئے بھی کسی نے اس چیز کا نوٹس نہیں لیا اور ہم سٹیڈیم کے اندر آ گئے۔

ہم تینوں کچھ دیر تک ایسے ہی سٹیڈیم میں بیٹھ کر لڑکوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد واش روم کی طرف آ گئے۔ میں نے گولف کی گیند میں سے ڈور کے دھاگے کو گزار کر اچھی طرح سے گانٹھ دے دی۔ اس کے بعد نیچے فرش سے جالی نکالی اور گیند کو سوراخ میں ڈال کر فوارے کو سوراخ کے منہ پر رکھ کر پانی کا پریشر مارنے لگا۔ ہم ڈور کو ڈھیلا چھوڑتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے گولف کی گیند پانی کے ساتھ ساتھ آگے

جانے لگی۔ پہلی ڈور ختم ہوئی تو ہم نے دوسری ڈور کو مضبوطی سے باندھا اور ایک بار پھر پانی کا پریشر پائپ میں مارنے لگے۔

ہمارا ایک آدمی آگے نالے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ گولف کی گیند کا دوسری طرف سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے بارود کا ایک چھوٹا سا گول پیکٹ بنا کر اسے اچھی طرح پلاسٹک میں پیک کر دیا تھا تا کہ وہ گیلا ہو کر خراب نہ ہو سکے۔ یہ سادہ سا گولہ تھا جو عام شادی بیاہ کے موقع پر چلایا جاتا تھا۔ میرا ارادہ سٹیڈیم کے اندر صرف ایک چھوٹا سا دھماکہ کرنے کا تھا تا کہ بھگدڑ مچے، میرا ارادہ کوئی جانی نقصان کرنے کا نہیں تھا۔ یہ معمولی سا بم تھا جسے پنجابی میں ''سیبوں والا'' بم بھی کہتے ہیں۔ یہ اگر لوگوں کے درمیان میں پھٹتا تو ایک آدھ ہی آدمی معمولی زخمی ہوتا۔ ویسے اس کا بارود نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ بم کے اندر تھوڑا سا بارود ہوتا ہے اور باقی کپڑے یا پٹ سن کی رسیاں ہوتی ہیں جسے پنجابی میں ''سیبے'' کہتے ہیں۔ یہ اگر ہاتھ میں پھٹ جائے تو ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے۔ باقی اس سے جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ البتہ بارود ہونے کی وجہ سے دھماکے کی آواز بہت خوفناک ہوتی ہے اور یہ آواز سن کر ہی بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ میرے لئے یہی بہت تھا۔ میں اس دوران بغیر کسی جانی نقصان کے اپنا کام کر جاتا۔

ابھی دوسری ڈور ہی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ میرے موبائل پر کال آ گئی۔ گولف کی گیند دوسری طرف پہنچ چکی تھی۔ میں نے مزید پانی بہانا بند کر دیا اور دوسری طرف کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے گیند کو اتار کر وہاں بم کو باندھنا تھا۔ دو منٹ بعد ہی اس کی کال پھر آئی تو میں نے آہستہ سے ایک جھٹکا ڈور کو دیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے بھی ایک ہلکا سا جھٹکا مجھے ڈور پر محسوس ہوا تو میں نے دھاگے کو آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ میں نے تقریباً سو میٹر کے قریب دھاگے کو اپنی طرف کھینچا، اس کے بعد پائپ میں ہاتھ ڈال کر کوئی سریا یا کیل وغیرہ تلاش کرنے لگا تا کہ میں وہاں پر اس دھاگے کو باندھ سکوں۔ مجھے سوراخ سے کوئی پانچ انچ نیچے ایک تار مل گئی۔ یہ لینٹر ڈالتے ہوئے جو جالی ڈالی جاتی ہے اس کی تار تھی۔

یہ لوہے کی بڑی بڑی جالیاں ہوتی ہیں جن کو پوری چھت پر ڈالا جاتا ہے۔ اس کے بعد اوپر سے سیمنٹ اور بجری ڈال دی جاتی ہے۔ لوہے کی ان جالیوں کی وجہ سے چھت بہت مضبوط ہو جاتی ہے اور کبھی بھی چھت کا کوئی ایک بڑا حصہ ٹوٹ کر نیچے نہیں گرتا۔ پوری کی پوری چھت تو نیچے گر سکتی ہے لیکن اس کا ایک حصہ علیحدہ ہو کر نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہی جالی مکانوں کی بنیادوں اور بعض اوقات دیواروں میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ یہ

وہ دیواریں ہوتی ہیں جو خالص سیمنٹ اور بجری سے بنتی ہیں اور بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ یورپ میں سو فیصد مکانات اور بلڈنگیں ایسے ہی لینٹر سے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد عمارت کے اندر چھوٹے چھوٹے کمرے اینٹوں یا پھر گتے سے بنائے جاتے ہیں۔ بیرونی دیواریں خالص سیمنٹ اور بجری کی ہوتی ہیں جبکہ اندر کمروں کی دیواریں سنگل اینٹ یا لوہے اور گتے سے بنائی جاتیں ہیں۔ یہاں بھی واش روم میں لینٹر ڈالا گیا تھا اور نیچے سوراخ میں ایسی ہی جالی کی تار باہر نکلی ہوئی تھی۔ میں نے اچھی طرح اسے ہلا جلا کر مضبوطی دیکھی اور پھر اس کے ساتھ پلاسٹک کی ڈور کو باندھ دیا اور اس کے اوپر لوہے کی جالی کو دوبارہ فٹ کر دیا۔

اب ہم فائنل والے دن آسانی سے بم کو باہر نکال سکتے تھے۔ میں نے واش روم میں صرف دھاگا ہی رہنے دیا تھا جبکہ اصل بم سٹیڈیم سے باہر نہر کے پاس ہی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ فائنل سے دو دن پہلے پورے سٹیڈیم کا چپہ چپہ میٹل ڈیٹکٹر اور بارود چیک کرنے والی مشینوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر میں بم کو واش روم تک لے کر آ جاتا تو بڑی آسانی سے چیک ہو سکتا تھا۔ انٹیلی جنس والوں کے پاس بارود کی بو سونگھنے والے کتے بھی ہوتے ہیں۔ اگر مشینوں سے یہ بچ بھی جاتا تو کتے سے بچنا ناممکن تھا۔ کتے کے سونگھنے کی حس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے بم کو سٹیڈیم سے باہر نہر کے پاس ہی رہنے دیا تھا اور یہاں صرف خالی دھاگا ہی تھا جو کہ کبھی بھی پکڑا نہیں جا سکتا تھا۔ دھاگا نیچے پانی کے اندر تھا۔ چیک کرنے والے زیادہ سے زیادہ جالی اتار کر اندر ٹارچ کی لائیٹ ڈال کر دیکھ لیتے، گندے پانی کے اندر ہاتھ کوئی بھی نہ ڈالتا۔ اس لئے مجھے پوری امید تھی کہ میرا کام آسانی سے ہو جائے گا۔ اب مجھے باقی دوسرے کام بھی کرنے تھے۔ سٹیڈیم کی طرف سے میں مطمئن ہو کر واپس گھر آ گیا اور اگلے کام کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

گھر میں پہنچ کر میں نے کچھ گھنٹے آرام کیا اور پھر رات کا اندھیرا پھیلتے ہی اندرون لاہور پہنچ گیا۔ آج دن کو میں اور راشد ادھر آئے تھے اور میں نے اس کو پل دکھا دیا تھا۔ اس لئے وہ بھی بارود لے کر پل پر پہنچ گئے۔ اسد انجینئر تھا۔ اس نے بارود میں ریموٹ کنٹرول ڈینٹونیٹر لگا دیا تھا۔ یہ تین بم تھے جن کو اس نے ایک تار کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔ اب یہ تینوں بم مل کر ایک ہی بم بن گیا تھا۔ جو ریموٹ کنٹرول بم سے پھٹنا تھا۔ ریموٹ کے سگنل چار سو میٹر تک کار آمد تھے۔

''علی بھائی! اب کیا یہ پل اڑانے کا ارادہ ہے؟'' اسد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''لیکن بھائی! اس پل کا چوہدری کے بیٹے کے اغوا سے کیا تعلق ہے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔واقعی یہ بالکل مختلف علاقہ تھا اور سٹیڈیم سے کافی دور تھا۔اس دھماکے کا سٹیڈیم سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔

''اس دھماکے کا اسٹیڈیم سے کوئی تعلق نہیں ہے اسد بھائی! یہ صرف ریہرسل ہے۔ میں بارود کی کوالٹی چیک کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ واقعی تمہارا لایا ہوا بارود اس پل کو گرا سکتا ہے یا نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ دونوں پریشانی سے میرا چہرہ دیکھنے لگے۔

یہاں پر صرف وہ دونوں ہی آئے تھے۔ہم سارے اکٹھے کہیں بھی نہیں جاتے تھے۔ ہمارا ایک آدمی تو پہلے ہی چوہدری شہباز کے گھر میں کام کر رہا تھا۔وہ بدستور وہیں پر کام کر رہا تھا اور ہم نے اس کو بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیں گھر کے اندرونی حالات بتا رہا تھا اور ہم چوہدری شہباز کے گھر میں ہونے والی سبھی خبروں سے باخبر تھے۔ جبکہ باقی چار لوگ مزید تھے اور وہ دو دو کے گروپ میں باہر نکلتے تھے۔ان کا مین لیڈر اسد ہی تھا جو کہ بہت ذہین تھا۔ وہ ایک بہت بڑے گھر کا لڑکا تھا لیکن پتہ نہیں کون سے حالات اسے ان راستوں پر لے آئے تھے۔ان بے چاروں کی قسمت اچھی تھی جو یہ مجھ سے مل گئے تھے ورنہ اگر کسی اور بندے کے ہاتھ لگ جاتے تو اب تک یقیناً مارے جا چکے ہوتے۔

اس دنیا میں اصل جہاد کرنے والے بہت کم بچے تھے۔سبھی اپنے اپنے مفادات کے لئے ان معصوموں کو جہاد کے نام پر مروا رہے تھے۔شاید میری یہ بات کچھ میرے پڑھنے والوں کو بری لگے۔ میں اسلام اور جہاد کے خلاف نہیں ہوں۔ میں الحمداللہ مسلمان ہوں اور اس اسلام کی خاطر اپنی جان قربان کرنے پر فخر محسوس کرنے والا ہوں۔اسلام جہاد کے بغیر نامکمل ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ میں صرف ان دہشت گردوں کے خلاف ہوں جو اسلام کے نام پر دہشت گردی کرتے ہیں اور اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔حقیقت ہمیشہ کڑوی ہی ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آج کے دور میں جہاد سے زیادہ دہشت گردی ہو رہی ہے۔ دنیا کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک سبھی اسلامی ممالک اس دہشت گردی کا شکار ہو رہے ہیں اور اسلام کو فائدہ ہونے کی بجائے نقصان ہو رہا ہے۔وہ بے چارے بھی اگر ان میں سے کسی کے ہتھے چڑھ جاتے تو ابھی تک یا تو مر چکے ہوتے یا پھر پاکستان کی کسی جیل میں پڑے سڑ رہے ہوتے۔

''علی بھائی! بارود چیک کرنے کے لئے پورے پل کو ہی اڑانا لازمی تو نہیں ہے۔اس کے لئے ہم کوئی ایک بھی طریقہ استعمال کر سکتے ہیں۔'' اس کا دل پل کو اڑانے کا نہیں تھا۔

''اسد بھائی! میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔اگر اس آپریشن کے دوران بارود ہلکی پاور کا نکلا اور وہ زیادہ دھماکہ نہ کر سکا تو ہمارا یہ سارا آپریشن فیل ہو جائے گا اور ہم سب اپنی جانوں سے بھی چلے جائیں گے۔اگر مقابلہ پوری دنیا سے کر رہے ہیں تو پھر یہ چھوٹے چھوٹے پل گرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ویسے بھی ہماری گورنمنٹ کے پاس بہت وقت ہوتا ہے ان پلوں کو تعمیر کرنے کے لئے۔۔۔ہماری گورنمنٹ صرف ایک یہی تو کام کر رہی ہے۔نوے دن میں پورا پل تیار کروا دیتی ہے۔فکر مت کرو، ہمارے وزیر اعلیٰ اس پل کے گرنے سے خوش ہوں گے کیونکہ انہیں کمیشن ملے گا،اس علاقے کے ایم این اے کو کمیشن ملے گا، یہاں کے بلدیہ کو کمیشن ملے گا،ٹھیکہ دینے والے کو کمیشن ملے گا،ٹھیکہ لینے والے کو کمیشن ملے گا اور پل تعمیر کرنے والی کمپنی اس ایک پل سے اپنی پورے سال کی روٹیاں بنا لے گی۔اسد صاحب! ہم تو فائدہ کر رہے ہیں نا پل گرا کر؟ دیکھ لو! کون کون اس پل سے کمیشن کھائے گا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بھائی! نقصان تو پاکستان کا ہو رہا ہے نا؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں بے اختیار مسکرانے لگا۔

''اسد بھائی! ایک یا دو پل گرانے سے ملک کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ہمارا مقصد بڑا ہے اور اس کے لئے پل گرانے میں میری مدد کرو تاکہ ہم اس سے آگے مزید کام کریں۔ہمارے پاس دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں اور ہمیں بہت سا کام کرنا ہے۔'' میں نے اس سے کہا تو وہ جلدی سے گاڑی میں سے بم باہر نکالنے لگا۔

یہ بہت پرسکون علاقہ تھا اور رات کے اس وقت بس اِکا دُکا ہی گاڑیاں ادھر سے گزر رہی تھیں۔اس لئے ہمیں اپنا کام کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو رہی تھی۔ہم دونوں پل کے اوپر چڑھے اور پھر میں پل کی ریلنگ کو پکڑ کر نیچے کی طرف لٹک گیا۔یہاں لوہے کے بڑے بڑے پائپ لگے ہوئے تھے جو نیچے پورے پل پر پھیلے ہوئے تھے۔میں نے ایک بم کو پکڑ کر جیب میں ڈالا اور پل کے نیچے لٹکتا ہوا آگے چلا گیا۔یہاں پر میں نے پہلا بم فٹ کیا اور پھر تار کو ٹیپ کی مدد سے چپکاتا ہوا پل کے درمیان تک چلا گیا اور پھر ادھر تار کو چپکا دیا۔تب تک اسد بھی پل کے نیچے لٹکتا ہوا ادھر آ گیا تھا۔اس نے دوسرے بم کو پل کے بالکل درمیان

میں ٹیپ کی مدد سے اچھی طرح چپکایا اور پھر ہم دونوں مزید آگے بڑھنے لگے اور پل کے اگلے سرے کے درمیان میں تیسرے بم کو بھی ٹیپ کی مدد سے چپکا کر ہم دونوں اوپر آ گئے۔ ہم پل کو بم لگا چکے تھے اور یہ بلاسٹ سے گرنے کے لئے بالکل تیار تھا۔

''علی بھائی! ایک بار پھر سوچ لو، ہم لوگ بہر حال پاکستان کا نقصان نہیں کر سکتے۔'' اسد نے مجھے ریموٹ کنٹرول پکڑاتے ہوئے کہا۔ راشد تب تک گاڑی لے کر پل کے اوپر ہی آ گیا تھا۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھے اور آہستہ آہستہ پل کراس کر کے دوسری طرف چلے گئے۔

''راشد! گاڑی کو آگے لے جاؤ، ہم کوئی تین سو میٹر آگے جا کر بلاسٹ کریں گے اور واپس آ کر چیک نہیں کریں گے۔ اب ہم کل صبح دن کو ہی آ کر دیکھیں گے۔ رات کو اس وقت ادھر آنا ہمارے لئے خطرناک ہوسکتا ہے۔'' میں نے راشد کو کہا تو وہ گاڑی کو سیدھا آگے بڑھا لے گیا۔

تقریباً تین سو میٹر آگے جا کر میں نے ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پوری سڑک سنسان تھی اور یہاں پر کوئی بھی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہمارے لئے یہ آئیڈیل وقت تھا۔ چونکہ پل کے اوپر کوئی بھی گاڑی نہیں تھی اس لئے کوئی بھی گاڑی پل کے نیچے نہ آتی اور کوئی جانی نقصان نہ ہوتا۔

''اسد بھائی! ایک بڑے فائدے کے لئے چھوٹا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں کچھ بڑے فیصلے بھی لینا پڑتے ہیں۔'' میں نے ریموٹ اسد کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہو یار!'' اس نے میرے ہاتھ سے ریموٹ لیا اور اس کا بٹن پریس کر دیا۔

ہمارے پیچھے روشنی کا ایک بہت بڑا جھما کا ہوا۔ اچانک ہر طرف روشنی پھیلی اور ایک زوردار دھماکہ ہوا جس سے گاڑی لہرا کر سڑک کے درمیان میں آ گئی۔ راشد نے جلدی سے گاڑی کو سنبھالا اور اسے سڑک کے ایک کنارے پر چلانے لگا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں گرد وغبار کا ایک طوفان اوپر آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔ بارود بہت طاقت ور تھا اور شاید اس نے پورے پل کو ہی زمین بوس کر دیا تھا۔ ہمارے پاس واپس جا کر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ دھماکے کی آواز سن کر پولیس ادھر پہنچ سکتی تھی اور ہم شک کے دائرے میں آ سکتے تھے۔ اس لئے ہم تیزی سے اپنے گھروں کی طرف جانے لگے۔ راشد اور اسد نے مجھے گلی کی نکڑ پر اتارا اور میں گھر کی طرف چل پڑا۔ یہاں گلی بہت تنگ تھی۔ کار گلی کے اندر نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے کمرے میں پہنچ کر جلدی سے پہلے غسل کیا اور پھر ٹی وی آن کر کے نیوز دیکھنے لگا۔

پل گرنے کی خبر میڈیا پر آ چکی تھی اور تقریباً سارے ہی نیوز چینل چھ مہینے پہلے بنے ہوئے اس پل کے گرنے کی بریکنگ نیوز چلا رہے تھے۔ پل کے اوپر اس وقت کوئی بھی گاڑی نہیں گزر رہی تھی اس لئے کسی بھی قسم کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس پل کو دہشت گردی کے کسی واقعے سے نہیں جوڑا جا رہا تھا بلکہ پل بنانے والے ٹھیکیدار کو قصوروار ٹھہرایا جا رہا تھا۔ جس نے ناقص میٹریل سے اس پل کو تیار کیا تھا۔ وہ بے چارہ پل کے گرنے کی خبر سن کر ہی فرار ہو گیا تھا۔ ہمارے ملک کی پولیس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ جس جگہ سے تھوڑا سا بھی پیسہ ملنے کی امید ہوتی ہے وہ وہاں بہت تیزی سے کام کرتی ہے۔ پولیس اس ٹھیکیدار کے گھر تک پہنچ گئی تھی لیکن وہ پولیس سے زیادہ تیز نکلا اور ان کے آنے سے پہلے ہی غائب ہو گیا۔ اب میڈیا چیخ چیخ کر پل کے گرنے کی خبر دے رہا تھا۔ انہوں نے کنسٹرکشن کے کچھ ایکسپرٹ بھی کہیں سے اکٹھے کر لئے تھے جو میڈیا کے اوپر بیٹھ کر لوگوں کو بتا رہے تھے کہ پل بنانے میں کہاں کہاں کرپشن ہوئی ہے، کون کون سا ناقص میٹریل ڈالا جاتا ہے جس کی وجہ سے پل اتنی جلدی گر جاتا ہے۔

میں تقریباً ایک گھنٹے تک مسلسل ٹی وی دیکھتا رہا۔ ٹی وی پر چلنے والی مختلف فوٹیج سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پورے کا پورا پل ہی زمین بوس ہو گیا ہے۔ اسد کا لایا ہوا بارود بہت طاقتور تھا۔ اس نے پورے پل کو ہی اڑا کر رکھ دیا تھا۔ پاکستان میں شاید ہر چیز ہی دو نمبر ملتی ہو لیکن اسلحہ اور بارود ایک نمبر ملتا ہے۔ اس میں کوئی دو نمبری یا ملاوٹ نہیں ہوتی۔ میں یہی سوچتا ہوا سو گیا۔

دوسرے دن دوپہر کے قریب میں سب سے پہلے پل پر گیا۔ یہاں پر ابھی بھی دو تین میڈیا والے کیمرے سنبھالے نیوز بنا رہے تھے۔ پل مکمل طور پر گر گیا تھا۔ میں آدھے گھنٹے تک ادھر ادھر گھومتے ہوئے پل کے ملبے کو دیکھتا رہا۔ ٹنوں وزنی ملبے کے نیچے بارود یا تار کے باریک ذرّے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی کے برابر تھی اور کوئی بھی اس واقع کی انکوائری نہیں کر رہا تھا۔ سبھی ناقص میٹریل کو ہی پل گرنے کی وجہ مان رہے تھے اور کسی کی بھی توجہ بارود کی طرف نہیں تھی۔ میں ادھر سے مطمئن ہو کر سٹیڈیم کی طرف چلا گیا۔ سٹیڈیم میں آج سے عام عوام کا داخلہ منع ہو گیا تھا۔ ابھی فائنل کو پورے پانچ دن رہتے تھے اور سیکورٹی ایجنسیوں نے سٹیڈیم کو مکمل طور پر سیل کر دیا تھا۔ میں کوئی دس منٹ تک ادھر ہی آس پاس گھومتا رہا۔ اس دوران مجھے اسد کی کال آ گئی۔ وہ بھی پل کا ایک چکر لگا آئے تھے۔ میں نے ان کو ایک ہوٹل کا پتہ بتایا اور خود بھی ادھر ہی چلا گیا۔ میرے ادھر پہنچنے سے پہلے ہی وہ دونوں ادھر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے کھانے کا آرڈر بھی دے دیا تھا اور اب

ہوٹل کے باہر بنی ہوئی بنچوں پر بیٹھے میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ان سے سلام لیا اور ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''علی بھائی! آپ دیکھ ہی آئے ہونگے میری انجینئر نگ کا کمال؟ پورے کا پورا پل ہی زمین بوس ہو گیا تھا۔'' اسد نے میرے سلام کا جواب دیا اور میرے بیٹھتے ہی فخر سے سینہ پھلانے لگا۔

''میں دیکھ کر ہی آیا ہوں، واقعی! تم نے بہترین کام کیا ہے۔ اب ہم نے آگے کے لئے پلان بنانا ہے۔ تم نے مرگی کے دورے والی دوائی کا بندوبست کرنا ہے۔'' میں نے اسے ایک دوائی کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

یہ پاؤڈر کی شکل میں ہوتی ہے اور کسی بھی پنساری کی دکان سے مل جاتی ہے۔ اسے پانی کے ساتھ مکس کر کے پتلا سا پیسٹ بنایا جاتا ہے اور پھر اس پیسٹ کو کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی سوئی کے سرے پر لگایا جاتا ہے۔ پھر اس سوئی کو جس بھی آدمی کے جسم میں چبھویا جاتا ہے تو اسے فوراً مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ یہ پاؤڈر خون کے ساتھ ملتے ہی ایک سیکنڈ میں ری ایکشن کرتا ہے اور بندہ فوراً زمین پر گر کر تڑپنے لگتا ہے۔ اس پاؤڈر سے کوئی بھی بندہ مرتا نہیں ہے۔ یہ صرف دس پندرہ منٹ تک تکلیف دیتا ہے اور اس کے بعد اس کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور بندہ نارمل ہو جاتا ہے۔ اصل میں یہ پاؤڈر فالج کے مریضوں کے لئے ہوتا ہے۔ فالج سے جسم کے اندر حرکت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ یہ دوائی اس حرکت کو پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ میں اس پاؤڈر سے سوئی تیار کرتا اور پھر اس سوئی سے چوہدری شہباز کے بیٹے کو نشانہ بناتا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگتا۔ ہم اسے سٹیڈیم کے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاتے اور پھر وہاں سے اغوا کر سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے بھائی! دوائی تو پنساری کی سبھی دکانوں سے مل جاتی ہے۔ میں کسی بھی دکان سے وہ خرید کر لا سکتا ہوں۔'' اس نے بے فکری سے کہا۔

''ٹھیک ہے! یہ مرحلہ تو طے ہو گیا، اب دوسرے مرحلے کی طرف آتے ہیں۔ سٹیڈیم کے باہر ہنگامی حالت کے لئے ایمرجنسی ایمبولنس کھڑی ہوں گی۔ تم نے یہ پتہ کرنا ہے کہ یہ کتنی ہوں گی اور ان میں عملہ کون کون ہو گا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی! عملہ تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ صرف ایک ڈرائیور ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک نرس یا پھر ڈاکٹر ہوتا ہے۔ ایک ایمبولینس کے ساتھ ٹوٹل دو ہی آدمی ہوتے ہیں۔ شیخ زید ہسپتال صرف تین کلومیٹر کی دوری پر

ہے۔میرے خیال میں سٹیڈیم کے باہر زیادہ ایمبولینس نہیں ہوں گی۔ایمرجنسی کی صورت میں ہسپتال سے صرف پانچ منٹ میں ایمبولینس سٹیڈیم پہنچ جاتی ہے۔باقی میں مزید تفصیل کل تک حاصل کرلوں گا اور پھر آپ کو بتادوں گا۔کوئی اور چیز ہوتو بتا دو؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔وہ جاسوسی کے کام میں ماہر تھا۔خدا نے اسے بنایا ہی جاسوس تھا۔میں صرف پلان بتاتا تھا اور وہ اس پر پورا اترتا تھا۔

''ٹھیک ہے! جہاں یہ سب کچھ کردو گے وہیں مجھے ایک ڈاکٹر کا آئی کارڈ چاہیے۔تم سب بھی ہسپتال کے کارڈ بنوا لینا۔ہم نے سٹیڈیم کے باہر ایک ایمبولینس پر قبضہ کرنا ہے اور چوہدری شہباز کے بیٹے کو اس ایمبولینس میں بٹھا کر لے جانا ہوگا۔ہم ہسپتال جانے کی بجائے درمیان سے ہی راستہ تبدیل کرکے دوسری طرف نکل جائیں گے۔'' میں نے تفصیل بتائی تو اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات نمایاں ہوگئے۔

''واہ علی بھائی! واقعی ایک فول پروف پلان بنایا ہے۔آپ واقعی جینئس ہو۔ہم آسانی سے اس لڑکے کو لے کر نکل جائیں گے۔پورا سیکورٹی ہی سٹیڈیم کے اندر تعینات ہے اور ہم اسی سیکیورٹی کو آسانی سے چکمہ دے کر کراپنا کام کرجائیں گے۔'' اس کا چہرہ جوش سے چمک رہا تھا۔میں بھی اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''علی بھائی! صرف ایک چیز کی مجھے سمجھ نہیں آئی؟ یہ سارا کام تو بارود کے بغیر ہی مکمل ہوسکتا تھا تو پھر اس پل کو دھماکے سے اڑانے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ ابھی تک اسی پل میں الجھا ہوا تھا۔

''تھوڑا صبر کرو! پل گرانے کا مقصد بھی تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔آج رات ہم ایک اور پل کو بارود لگانے والے ہیں۔یار! ہماری گورنمنٹ سو رہی ہے انہیں تھوڑا جگانے کی ضرورت ہے۔وہ اٹھے اور پل بنانے شروع کرے۔۔۔آخر اگلے الیکشن میں انہوں نے ووٹ بھی لینے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ دونوں اپنے سر کھجانے لگے۔

''علی بھائی! صحیح صحیح بتاؤ، آخر کیا ماجرا ہے؟ پل گرانا خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔سیکیورٹی اداروں کو ہلکا سا بھی شک ہوگیا تو وہ ہمیں کہیں بھی چھپنے نہیں دیں گے اور ہمارا یہ سارا آپریشن خراب ہوجائے گا۔'' اس بار وہ کافی سیریس ہوگیا۔

''ٹھیک ہے! میں پورے آپریشن کی تفصیل بتا دیتا ہوں۔'' میں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھانا کھانے کے ساتھ انہیں پوری تفصیل بتانے لگا۔

''چوہدری شہباز اپنے بیٹے کے ساتھ اکیلا ہی میچ دیکھنے نہیں آئے گا بلکہ اس کے ساتھ لازمی سیکیورٹی

گارڈ ہوں گے جو کہ سٹیڈیم کے اندر بھی موجود ہوں گے اور باہر بھی۔۔۔اندر والے تو غیر مسلح ہوں گے جن کی ہمیں کوئی فکر نہیں جبکہ باہر والے سیکیورٹی گارڈ پوری طرح مسلح ہوں گے۔ وہ ہمارے ساتھ ایمبولینس کے ساتھ اندر تو نہیں بیٹھ سکتے لیکن بہر حال وہ ایمبولینس کے پیچھے پیچھے ضرور آئیں گے۔ ہم راستہ بدلیں گے تو وہ لازمی ہمارا پیچھا کریں گے۔ ہمیں ان سے پیچھا چھڑانا ہے جس کے لئے مجھے بارود کی ضرورت ہے۔'' میں نے ان کو اس آپریشن کی پوری تفصیل بتائی اور پھر واپس گھر آ گیا۔

''اگلا سارا کام اسد کا ہی تھا۔ اس نے ہی سارا بندوبست کرنا تھا۔ میرا اب کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے صرف ایک پل پر بم لگانے تھے اور وہ بم میں میچ سے ایک دن پہلے رات کو اسد کو ساتھ لے کر لگا آیا تھا۔ رات کو ہم سب نے اکٹھے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور سب نے آپریشن کے دوران اپنا اپنا کام بتایا اور ایک دوسرے سے شیئر بھی کیا تا کہ کل کو کسی بھی قسم کی کوئی پرابلم نہ ہو۔ نو بجے کے قریب ہم سب نے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو دہرایا اور پھر گھر چلے گئے۔ میں کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے اچھی طرح نہایا اور پھر عشاء کی نماز پڑھنے لگا۔ آج رات نماز میں بہت سکون مل رہا تھا۔ کل کا دن ہم سب کے لئے بہت اہم تھا۔ کل پورا پاکستان اس میچ کو انجوائے کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ پاکستانی ایجنسیاں اس میچ کو کامیاب بنانے کے لئے زور لگا رہی تھیں اور ملک دشمن عناصر (دہشت گرد) اس ایونٹ کو ناکام بنانے کے لئے کوششیں کر رہے تھے۔ ان سب کے درمیان ایک ہمارا بھی چھوٹا سا گروپ تھا جو اپنے مقصد کے لئے لڑ رہا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد میں بڑی دیر تک خدا کے حضور گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا اور بارہ بجے کے قریب جا کر سو گیا۔

دوسرے دن صبح صبح اٹھ کر سب سے پہلے میں نے صبح کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ایک چکر سٹیڈیم اور پھر نہر کا بھی لگا کر آ گیا۔ سارے کام اپنی اپنی جگہ پر بہترین تھے۔ ہسپتال چونکہ سٹیڈیم کے بالکل نزدیک تھا اس لئے انہوں نے صرف ایک ہی ایمبولینس بھیجی تھی جس میں ایک ڈرائیور اور ایک ڈاکٹر تھا۔ اندر VIP لوگوں کے لئے علیحدہ ڈاکٹروں کی ٹیم اور ہیلی کاپٹر بھی تھا جو کسی بھی حادثے کی صورت میں ایمبولینس کا کام سرانجام دیتا۔ میں صبح صبح ایک چکر لگا کر گھر واپس آ گیا اور پھر دو بجے کے قریب میں نے نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے اور خدا سے مدد کی التجا کر کے باہر آ گیا۔

آج زندگی اور موت کا دن تھا، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہم نے اپنا کام سو فیصد مکمل کیا ہوا تھا لیکن پھر بھی ایک ہلکی سی غلطی کی صورت میں سب کچھ ختم ہو سکتا تھا۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں تھی اور آج ہم چھ

لوگ سروں پر کفن باندھ کر گھروں سے نکلے تھے۔ میچ تو رات کو آٹھ بجے کے قریب شروع ہونا تھا لیکن ہم میڈیکل سٹاف بنے ہوئے تھے، اس لئے ہم نے ادھر پہلے ہی رپورٹ کرنا تھی۔ اسد نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایمبولینس کو ہسپتال سے باہر نکلتے ہی اغوا کر لیا تھا۔ اسد ڈاکٹر بنا ہوا تھا۔ وہ صبح صبح ہی ہسپتال چلا گیا اور سٹیڈیم کی طرف جانے والی ایمبولینس کی نگرانی کرتا رہا۔ جیسے ہی وہ ایمبولینس تیار ہوئی اور باہر نکلنے لگی تو وہ بھی جلدی سے ان کے پاس چلا گیا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا اور ڈرائیور کو سٹیڈیم پہنچانے کا کہا۔ چونکہ ڈرائیور بھی سٹیڈیم ہی جا رہا تھا اس لئے اس نے اسد کو بھی ایمبولینس میں بٹھا لیا۔ باہر ایک بند گاڑی میں دوسرے لڑکے انتظار کر رہے تھے۔

جیسے ہی ایمبولینس ہسپتال سے باہر نکلی اور سٹیڈیم کی طرف چلی تو اسد نے جیب سے گن نکالی اور ڈرائیور کی کنپٹی پر لگا کر اسے ایمبولنس روکنے پر مجبور کر دیا۔ جیسے ہی ایمبولینس رکی پیچھے سے آنے والی بند گاڑی سے دوسرے مسلح لڑکے بھاگتے ہوئے آگے آئے اور انہوں نے ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کو گن پوائنٹ پر نیچے اتارا اور بند گاڑی میں بٹھا دیا۔ بند گاڑی میں بٹھاتے ہی ان لڑکوں نے ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر انہیں ایک لڑکے کے حوالے کیا اور خود آگے جا کر ایمبولینس میں بیٹھ گئے۔ وہ لڑکا انہیں لے کر دوسری طرف چلا گیا۔ ہم نے جوہر ٹاؤن میں ایک چھوٹا سا گھر کرایہ پر لیا ہوا تھا۔ وہ لڑکا ان دونوں کو لے کر اس گھر میں چلا گیا۔

بند گاڑی کو گیراج میں کھڑا کر کے اس نے ان دونوں کو ادھر گیراج میں ہی اچھی طرح کس کر باندھ دیا اور ان کو بے ہوشی کا ایک ٹیکہ بھی لگا دیا۔ ٹیکے کی مدد سے وہ دونوں دس بارہ گھنٹے تک آرام سے بے ہوش رہتے، تب تک ہم اپنا کام مکمل کر چکے ہوتے۔ اس نے انہیں اچھی طرح کس کر باندھا تھا، اور منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا تا کہ وہ اگر ہوش میں بھی آ جائیں تو کوئی مسئلہ نہ کریں۔ اس لڑکے کا نام طلحہ (Talha) تھا۔ اس نے سٹیڈیم میں آنے کی بجائے پل پر ہمارا انتظار کرنا تھا۔ گیراج میں ان دونوں کے علاوہ ایک پٹھان بھی بندھا پڑا تھا۔ وہ صبح صبح ایک مقامی ٹرک اڈے سے ایک بڑا ٹرک لے کر آیا تھا۔ اس نے ایک پٹھان کو کہا تھا کہ وہ کچھ سامان لاہور سے سیالکوٹ لے کر جانا چاہتا تھا۔ اس نے ٹرک ڈرائیور سے کرایہ وغیرہ طے کر کے اسے ایک ویرانے میں لے جا کر بے ہوش کیا اور اسے بھی ادھر لا کر باندھ دیا تھا۔ ہمیں اپنے اس آپریشن کے لئے ٹرک کی بھی ضرورت تھی۔ طلحہ نے ٹرک حاصل کر لیا تھا اور وہی اس ٹرک کو لے کر پل کے اوپر ہمارا انتظار

کرتا۔

چوہدری صاحب کے گھر میں کام کرنے والے لڑکے کا نام اکبر تھا اور وہ چوہدری صاحب کے ساتھ ہی میچ دیکھنے کے لئے آرہا تھا۔ وہ سٹیڈیم کے اندر چوہدری اور اس کے بیٹے کی سیکورٹی پر مامور تھا۔ وہی چوہدری کے لڑکے حارث کو سوئی مار کر زخمی کرتا۔ سوئی مارتے ہی وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگتا تو اس وقت میں ادھر ہی ہوتا، اسد اور راشد باہر ایمبولینس میں ہوتے۔ ایک لڑکا واش روم سے بم نکال کر لاتا اور اسے سٹیڈیم کے اندر چوہدری شہباز اور اس کے بیٹے کے بالکل پاس لا کر چلا دیتا۔ اسد نے اس بم میں بھی تھوڑی تبدیلی کر دی تھی اور یہ بم آگ کی بجائے زور سے زمین پر مارنے سے پھٹ جاتا۔ بارود کو پھٹنے کے لئے صرف آگ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ رگڑ یا دباؤ سے بھی پھٹ جاتا ہے۔

ایمبولینس گیٹ کے پاس آ کر رک گئی اور اسد نے نیچے اتر کر اپنی اور ڈرائیور کا آئی ڈی کارڈ وغیرہ سیکورٹی والوں کو چیک کروایا اور مرکزی گیٹ سے تھوڑا ہٹ کر ایمبولینس کھڑی کر کے اس کے اندر بیٹھ گیا۔ پانچ بجے کے قریب میں سٹیڈیم میں پہنچا تو سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ میں نے مرکزی گیٹ پر اپنا پاس اور میڈیکل کارڈ دکھایا اور سٹیڈیم کے اندر آ کر بیٹھ گیا۔

آج اتوار کا دن تھا اور فائنل میچ سے پہلے افتتاحی تقریب شروع ہو چکی تھی۔ پورا سٹیڈیم ہی تماشائیوں سے بھر چکا تھا۔ پاکستان آرمی کے پیرا گلائیڈر پیراشوٹ کی مدد سے سٹیڈیم میں اتر رہے تھے اور تماشائیوں سے داد و تحسین موصول کر رہے تھے۔ چونکہ میرے پاس میڈیکل کارڈ تھا اس لئے میں پورے سٹیڈیم میں کہیں بھی آ جا سکتا تھا۔ فضا میں آرمی کے رنگ برنگے پیراشوٹ لہرا رہے تھے جو ایک ایک کر کے سٹیڈیم کے اندر اتر رہے تھے۔ یہ فضا سے سیدھے سٹیڈیم کے اندر اتر رہے تھے۔ یہ اتنی رفتار کے باوجود بھی نیچے گر نہیں رہے تھے بلکہ اپنے پیروں پر کھڑے چلتے ہوئے اتر رہے تھے۔ پیراشوٹ سے اترتے ہی بندہ زمین پر گر جاتا ہے اور پیراشوٹ کے جھٹکے کی وجہ سے بڑی دور تک گھسٹتا رہتا ہے لیکن اس سٹیڈیم میں سارے آرمی کے جوان سیدھے اپنے پیروں پر بھاگتے ہوئے اتر رہے تھے۔

میں سٹیڈیم کے مختلف حصوں میں گھومتا ہوا سیکورٹی کے افراد دیکھنے لگا۔ 27,000 ہزار کے اس مجمع میں کم از کم ایک ہزار سے اوپر سیکیورٹی کے افراد موجود تھے۔ وردی میں بھی اور سادہ کپڑوں میں بھی اہلکار پورے سٹیڈیم میں گھوم پھر کر لوگوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ چھ بجے کے قریب سٹیج پر علی ظفر آ گئے اور اس کے

خوبصورت ملی نغموں پر پورا سٹیڈیم جھومنے لگا۔ میں نے چوہدری شہباز اور اس کے بیٹے کو دیکھ لیا تھا لیکن میں ان کے پاس نہیں جا رہا تھا۔ میں وقت سے پہلے ان کے پاس جا کر کھڑا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس سے ان کو شک ہو سکتا تھا۔ ابھی میچ شروع ہونے میں پورے دو گھنٹے باقی تھے۔ عوام کا جوش و خروش میچ کے دوران ہی عروج پر ہوتا تھا۔ اس وقت سیکورٹی ادارے کرکٹ ٹیم پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھتے اور ہمیں موقع مل جانا تھا۔ اگر ہم میچ سے پہلے دھماکے کرتے تو ہمارا کام فیل بھی ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہم سب میچ شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

ٹھیک آٹھ بجے میچ شروع ہو گیا۔ پہلی باری پشاور زلمی کی تھی۔ ان کے کپتان ڈیرین سیمی تھے جسے شاید پورا پاکستان ہی جانتا تھا اور محبت بھی کرتا تھا۔ ڈیرن سیمی کو پچھلے سیزن سے ہی محبت ملنی شروع ہو گئی تھی۔ اس بار جب لاہور میں دھماکہ ہوا تو تقریباً سبھی غیر ملکی کھلاڑیوں نے پاکستان آ کر فائنل کھیلنے سے انکار کر دیا تھا۔ فائنل کو پاکستان میں کروانے کا مقصد ہی یہی تھا کہ انٹرنیشنل کھلاڑی پاکستان میں آ کر کھیلتے تو دوسرے ملکوں کی ٹیمیں بھی اچھی سیکورٹی کو دیکھتے ہوئے پاکستان آ کر کھیلنا شروع کر دیتیں۔ سبھی غیر ملکی کھلاڑیوں نے پاکستان آ کر کھیلنے سے انکار کر دیا تو گورنمنٹ کا فائنل ہی خطرے میں پڑھ گیا۔ نیشنل اور انٹرنیشنل میڈیا میں جگ ہنسائی ہو رہی تھی۔ غیر ملکی کھلاڑیوں کے بغیر اس گورنمنٹ کی کوئی ویلیو ہی نہیں تھی۔ اس موقع پر ڈیرن سیمی آگے بڑھے اور انہوں نے اپنی پاکستان سے والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ ڈیرن سیمی نے پاکستان جا کر فائنل کھیلنے کا اعلان کر دیا۔ سیمی کے ساتھ ساتھ کچھ اور کھلاڑی بھی پاکستان جا کر کھیلنے پر آمادہ ہو گئے۔ پاکستانیوں کے دل پہلے ہی ڈیرن سیمی کی محبت میں دھڑکتے تھے۔ اس کے اس اعلان نے سیمی کی محبت اور عزت مزید بڑھا دی۔

آج پورے پاکستان میں لوگ اتنا اپنے کھلاڑیوں سے محبت نہیں کرتے ہیں۔ لوگ سیمی سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے کرکٹ سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ بچپن میں کچھ عرصہ دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلی تھی اور بس اس کے علاوہ اور کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں نے سیمی کو بھی پہلی بار ادھر ہی کھیلتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کا کھیل دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا۔ ویسٹ انڈیز میں ویسے ہی بہت بڑے بڑے بیٹسمین ہوتے ہیں جبکہ ڈیرن سیمی ان سے بہت اوپر تھا۔ اس کے کھیلنے کے انداز سے ہی انفرادیت جھلکتی تھی۔

یہ میچ کوئٹہ اور پشاور کے درمیان تھا۔ کوئٹہ کی ٹیم کی کپتانی سرفراز احمد کر رہے تھے۔ جبکہ پشاور زلمی کی ٹیم کی کپتانی ڈیرن سیمی کر رہے تھے۔ پہلے بیٹنگ کرنے کی باری پشاور زلمی کی تھی اور پشاور کی طرف سے اوپننگ

کے لیئے کامران اکمل اور ڈی جے ملان آئے۔ دونوں اوپنرز نے سو سے اوپر کے سٹرائیک ریٹ سے بہترین بیٹنگ کی۔ ملان نے 17 جب کہ کامران اکمل چالیس سکور بنا کر آؤٹ ہوئے۔ محمد حفیظ بھی اس میچ میں بارہ سکور کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ڈیرن سیمی بالکل آخر میں آئے اور انتہائی تیز بیٹنگ کرتے ہوئے گیارہ گیندوں پر 254 کے سٹرائیک ریٹ سے 28 بنا گئے۔ پورے میچ میں یہ سب سے بڑے سٹرائیک ریٹ تھے۔ دوسرے نمبر پر سٹرائیک ریٹ سرفراز احمد کا تھا۔ جنھوں نے گیارہ گیندوں پر 200 کے سٹرائیک ریٹ سے 22 سکور بنائے۔ دونوں ہی کپتان تھے اور دونوں نے ہی بہترین بیٹنگ کی۔ میچ کی پہلی اننگز ختم ہوئی، پشاور زلمی بیس اوورز میں 148 سکور بنا چکا تھا۔

میرے ساتھ والا لڑکا واش روم سے بم نکال کر لے آیا تھا۔ میچ کے آخری اوورں میں سیمی بیٹنگ کر رہا تھا اور پورا سٹیڈیم ہی کرسیوں سے چپک کر بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی بھی باتھ روم جا کر ان لمحات کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اور واش روم سے جا کر بم نکالنے کا یہی سب سے بہترین موقع تھا۔ میرا لڑکا آرام سے واش میں گیا، اس نے واش کا دروازہ اندر سے بند کیا اور ڈور کو باہر کھینچنے لگا۔ دو منٹ میں ہی پوری ڈور باہر آ گئی۔ اس نے ڈور سے بندھے ہوئے بم کو باہر نکالا جو بالکل محفوظ تھا۔ اس نے ڈور اور پلاسٹک کور کو ایک شاپر میں ڈالا اور واش روم سے باہر لگے ہوئے ایک بڑے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ جبکہ بم کو اس نے پہلے ہی اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ وہ واپس آ کر چوہدری شہباز اور اس کے بیٹے کے بالکل قریب چلا گیا اور ان سے تھوڑے فاصلے پر ایک خالی کرسی پڑی تھی اس پر جا کر بیٹھ گیا۔ پشاور زلمی اپنی باری لے چکا تھا اور اب دس منٹ کی بریک تھی۔ اس کے بعد کوئٹہ نے آ کر کھیلنا تھا۔

ہم نے دھماکے کا پروگرام پہلے دس اوور کے بعد بنایا تھا۔ کوئٹہ والے اپنی باری کھیلنے کے لئے آئے۔ ان کے اوپنر وان وائیک اور احمد شہزاد تھے۔ دونوں ہی اوپنر ایک ایک سکور بنا کر آؤٹ ہو گئے۔ وان وائیک کو تو میں پہلے نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اب جانتا ہوں لیکن احمد شہزاد کا مجھے پتہ تھا۔ یہ کسی بھی میچ میں نہیں چلتا تھا۔ اگر سامنے والی ٹیم افغانستان کی ہو تو یہ شاید کچھ سکور کر جاتا ہے لیکن کسی بڑی ٹیم اور بڑے سکور کے تعاقب میں بالکل زیرو ہے۔ کھلاڑی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جیتے ہوئے میچ کو بھی ہروانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پوری ٹیم بہترین کھیل رہی ہوتی ہے لیکن یہ پلیئر آتے ہی سارا پریشر اپنے اوپر لے لیتے ہیں اور انتہائی خراب کھیلتے ہوئے پوری ٹیم کو ہی لے ڈوبتے ہیں۔ دوسرے وہ کھلاڑی ہوتے ہیں جو جیتے ہوئے میچ کو جیتنے

کی صلاحیت رکھتے ہوئے اسے حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر زیادہ ہو تو شروع میں ہی آوٹ ہو کر واپس آ جاتے ہیں اور گیلری میں بیٹھ کر پورے میچ کو انجوائے کرتے ہیں۔ کھلاڑیوں کی تیسری قسم میچ ونگ کھلاڑیوں کی ہوتی ہے۔ یہ بالکل ہارے ہوئے میچ کو بھی جیتنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شاہد آفریدی، سرفراز احمد اور محمد عامر جیسے پلیئر کبھی بھی مخالف ٹیم کا پریشر اپنے اوپر نہیں لیتے۔ یہ وہ کھلاڑی ہیں جن کی نظر میں ہمیشہ ناممکن کو ممکن کرنے پر لگی ہوتی ہے۔

احمد شہزاد کھلاڑیوں کی دوسری قسم سے تھے۔ بڑے ٹارگٹ کا تعاقب یہ کبھی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آج بھی 149 سکور کا بڑا ٹارگٹ دیکھتے ہوئے یہ پانچ گیندوں پر ایک سکور بنا کر آؤٹ ہو گیا۔ میچ کا تیسرا کھلاڑی بھی تین سکور کر کے آؤٹ ہو گیا۔ پہلے چار اوورز میں کوئٹہ کی ٹیم پانچ کے سکور پر اپنی تین وکٹیں گنوا بیٹھی تھی۔ مجھے اب فکر ہونے لگی۔ جس تیزی سے یہ وکٹیں گر رہی تھیں ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ ٹیم دس اوور بھی مکمل نہیں کر پائے گی اور اس سے پہلے ہی آؤٹ ہو جائے گی۔ ہم ٹورنامنٹ کے بالکل عروج پر دھماکہ کرنا چاہتے تھے۔ کرکٹ میچ کے آخری اوروں میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب تماشائی آنکھ بھی نہیں جھپکتے۔ ایک ایک گیند پر پورے میچ کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہوتا ہے۔ مجھے ایسے ہی لمحات کا انتظار تھا تاکہ جب دھماکہ ہو تو صرف وقتی طور پر ہی بھگدڑ رہو۔ میں لڑکے کو لے کر باہر آؤں، ایمبولینس میں ڈال کر لے جاؤں اور سیکورٹی ایجنسی والے واپس میچ پر متوجہ ہو جائیں۔

احمد شہزاد نے ایک سکور پر آؤٹ ہو کر مجھے اپنا پلان بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گراؤنڈ میں اس وقت سرفراز کھیل رہے تھے اور وہ اپنے روایتی انداز میں انتہائی تیز گیم کھیل رہے تھے۔ انہوں نے میچ کے اندر ایک بار پھر جان ڈال دی تھی۔ وہ ایک کے بعد ایک چوکا لگا رہے تھے اور میچ ایک بار پھر کوئٹہ کی طرف منتقل ہونے لگا۔ سرفراز احمد کی انتہائی تیز گیم نے میچ میں ایک بار پھر دلچسپی ڈال دی تھی اور عوام پورے جوش و خروش سے نعرے بازی کرنے لگی۔ میں نے موبائل سے باہر اسد کو ایک مس کال دی اور دھماکے کے لئے اشارہ کر دیا۔ دھماکہ کرنے والے لڑکے نے میرا اشارہ دیکھ لیا اور وہ آہستگی سے اپنی جیب سے بم نکالنے لگا۔ دوسری طرف اکبر بھی سرکتا ہوا چوہدری کے بیٹے حارث کے نزدیک ہونے لگا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے حارث کے نیچے گرتے ہی ادھر پہنچنا تھا تاکہ اسے اٹھا سکوں اور باہر ایمبولینس کی طرف لے جانے کا کہوں۔

پورا سٹیڈیم لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور سارے ہی لوگ حلق پھاڑ پھاڑ کر نعرے بازی کر رہے تھے۔ پولیس اور سیکیورٹی والے بھی کچھ مطمئن ہو گئے تھے۔ میچ آخری لمحات چل رہے تھے۔ سرفراز احمد بس آخری ہی تھے اور ان کے آؤٹ ہوتے ہی میچ کا فیصلہ ہو جانا تھا۔ سب اپنے اپنے ماحول میں مست مزے سے اور خوشی سے کھلکھلا رہے تھے۔ بم والے لڑکے نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پوری طاقت سے بم کو زمین پر دے مارا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور کافی سارا دھواں اوپر کی طرف اٹھا۔ لوگوں میں اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ اکبر نے سوئی کو ہاتھ میں پکڑا اور اسے حارث کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ زمین پر گرتا چلا گیا۔ میچ رُک گیا تھا۔ سٹیڈیم کے اندر سیکیورٹی کے افراد گھس آئے اور کھلاڑیوں کو ایک طرف اکٹھا کرنے لگے۔ کچھ افراد ادھر دھماکے والی جگہ کی طرف بھی آئے۔ میں تیر کی طرح ان کے پاس پہنچ گیا اور میں نے جلدی سے گرتے ہوئے حارث کی نبض پکڑی جو اس وقت تڑپ رہا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ! دھماکے کا اثر ان کے دل پر ہوا ہے اور اسے فالج کا اٹیک ہونے والا ہے۔ جلدی کرو! اسے ابھی ہسپتال لے کر جانا ہوگا ورنہ اس کا دل بند ہو جائے گا اور یہ ادھر ہی تڑپ کر جان دے دے گا۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا تو اکبر جلدی سے آگے آیا اور لڑکے کو میرے ساتھ مل کر اوپر اٹھانے لگا۔

دھماکہ کرنے والا لڑکا اب سٹیڈیم سے باہر جا رہا تھا۔ یہ دھواں صرف ایک منٹ کے لئے ہی تھا۔ میرے ساتھ دو اور آدمی بھی آ گئے اور ہم سب نے مل کر حارث کو اوپر اٹھایا اور سٹیڈیم سے باہر جانے لگے۔ سیکورٹی والے سٹیڈیم میں گھوم پھر کر دھماکے کی حقیقت معلوم کر رہے تھے لیکن وہاں کچھ بھی نہیں۔ جب تک ہم حارث کو لے کر باہر نکلے تب تک پیچھے سیکورٹی والے سٹیڈیم میں گھوم پھر دھماکے کی حقیقت معلوم کر رہے تھے۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جب تک ہم حارث کو لے کر باہر نکلے تب تک پیچھے سیکیورٹی والوں نے سٹیڈیم کو کلیئر کر دیا تھا۔

''یہ ایک چھوٹا سا پٹاخہ تھا، کوئی نظر بچا کر اندر لے آیا تھا۔ یہاں پر مزید اور کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' سیکیورٹی والوں نے بیان دیا اور میچ صرف دس منٹ رکنے کے بعد دوبارہ شروع ہو گیا۔

ہم حارث کو لے کر سٹیڈیم سے باہر نکلے تو اسد نے جلدی سے اسے رسیو کیا اور ایمبولینس میں ڈالنے لگا۔ چوہدری شہباز اور اکبر دونوں جلدی سے حارث کے ساتھ ہی اندر بیٹھ گئے۔ باہر موجود چوہدری شہباز کے سیکورٹی ملازم بھی آگے آنے لگے تو میں نے چیخ کر اسے روک دیا۔

''ایمبولینس میں کسی اور کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے، یہ سرکاری گاڑی ہے۔ ہم بچے کو لے کر ہسپتال جا رہے ہیں اس کی جان کو خطرہ ہے۔ جو بچے کے رشتہ دار ہیں وہ اپنی پرائیویٹ گاڑی پر ہسپتال آ جائیں۔ چلو ڈرائیور! گاڑی سٹارٹ کرو۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر راشد بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ایمبولینس کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

اندر چوہدری اور اس کے بیٹے کے ساتھ اکبر اور اسد دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں راشد کے ساتھ اگلی سیٹ پر جا کر بیٹھا تو راشد نے جلدی سے ایمبولینس سٹارٹ کی اور انتہائی تیز رفتاری سے اسے حفیظ کاردار روڈ پر دوڑانے لگا۔ یہ چھوٹی سی سڑک تھی جو سٹیڈیم کے گرد گھومتی ہوئی آگے جاتی تھی اور تقریباً پانچ سو میٹر آگے جا کر فیروز پور روڈ سے جا ملتی تھی۔ چوہدری شہباز کے محافظ جلدی سے گاڑی میں بیٹھے اور ہمارے پیچھے آنے لگے لیکن سڑک پر پیچھے وہی بم والا لٹر کا اچانک آ گیا۔ انہوں نے گاڑی کو اچانک بریک لگائے تو وہ زمین پر گر گیا۔ سٹیڈیم کے باہر کھڑے ہوئے لوگ جلدی سے آگے آئے اور اسے اٹھانے لگے۔ جب تک وہ لوگ اسے زمین سے اٹھا کر سائیڈ پر کرتے اور چوہدری کے محافظوں کی گاڑی چلتی تب تک ہم انتہائی تیز رفتاری سے فیروز پور روڈ پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ہمیں بائیں طرف مڑتے ہوئے دیکھ لیا اس لئے وہ بھی انتہائی تیز رفتاری سے ہمارے پیچھے پیچھے آنے لگے۔

ان کے اور ہمارے درمیان تقریباً تین سو میٹر کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ہمارے لئے بہت تھا۔ فیروز پور روڈ سے ہم نے دائیں طرف ٹرن لیا اور مسعود فاروقی روڈ (Masood Farooqi Road) پر آ گئے۔ یہ روڈ سیدھا آگے لاہور کینال کی طرف جاتا تھا جس کے دوسری طرف شیخ زید ہسپتال تھا۔ راشد انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی کو اڑائے لئے جا رہا تھا۔ پیچھے محافظوں کی گاڑی بھی تیز رفتاری سے آ رہی تھی لیکن وہ ایمبولینس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ جیسے ہی ایمبولینس پل پر آئی ہمارے پیچھے ایک بڑا ٹرک سڑک کے بالکل درمیان میں ترچھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ طلحہ تھا۔ اس نے ٹرک کو اغوا ہی اس لئے کیا تھا تاکہ اس سے روڈ کو بلاک کیا جا سکے۔ ہم نے ایک لمحے کے لئے ایمبولینس کو روکا تو طلحہ بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے سائیڈ کا دروازہ کھولا تو وہ جمپ مار کر اندر سوار ہو گیا۔ ایمبولینس ایک بار پھر چل پڑی۔

ہم جیسے ہی پل کے دوسری طرف پہنچے اور ہمارے پیچھے لگے ہوئے محافظ ٹرک کو سڑک کے درمیان میں دیکھ کر رک گئے۔ اتنی دیر میں طلحہ نے جیب سے ریموٹ کنٹرول نکالا اور اس پر موجود ریڈ بٹن دبا دیا۔ ایک

بہت بڑا دھماکہ ہوا اور پورا پل ہی دھماکے سے زمین پر آ گرا۔ اب ان کا راستہ مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔ دوسرا پل قریباً پانچ کلومیٹر آگے تھا۔ پانچ کلومیٹر جانا اور پھر واپس پانچ کلومیٹر واپس آنا۔۔۔انہیں دس کلومیٹر کا سفر طے کرنے میں سات آٹھ منٹ لگ جاتے اور اتنی دیر میں ہم غائب ہو چکے ہوتے۔ ہم ایمبولینس کو ہسپتال لے جانے کی بجائے سیدھا آگے لے جانے لگے۔ ہم نے ایک بند گاڑی شاہ کمال کالونی (Shah Kamal) کے ایک پارک میں کھڑی کی تھی۔ اسد نے اندر دونوں باپ بیٹوں کو کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ ہم نے پارک میں جا کر ایمبولینس کھڑی کی، انہیں ایمبولینس سے نکال کر بند گاڑی میں منتقل کیا اور ایمبولینس کو ادھر ہی چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے۔

اب ہماری منزل بادامی باغ سے آگے دریائے راوی کو کراس کر کے شاہدرہ (Shahadara) تھی۔ ہم نے راوی کے کنارے پر ایک بھینسوں کا پرانا فارم دیکھا ہوا تھا جو کہ بالکل ویران تھا۔ یہاں کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ ہم نے اس فارم کو دو مہینے پہلے سے ہی لے رکھا تھا۔ جنگل میں اس طرف کوئی بھی نہیں آتا تھا اس لئے ہم کچھ دن تک بڑی آسانی سے انہیں یہاں رکھ سکتے تھے۔ جیسے ہی گاڑی یہاں پہنچی، ہم نے جلدی سے انہیں یہاں پر اتارا اور جلدی جلدی اپنے کپڑے اور حلیے وغیرہ تبدیل کرنے لگے۔ صرف دس منٹ کے اندر اندر ہم سب مکمل طور پر تبدیل ہو چکے تھے۔ ہم نے ان دونوں کو طلحہ کے سپرد کیا اور خود گاڑی لے کر واپس لاہور آ گئے۔ ہم نے گاڑی ایک ویران سڑک پر چھوڑ دی اور ٹیکسی لے کر علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے گھروں میں آ گئے۔

سٹیڈیم میں میچ ختم ہو گیا تھا۔ پشاور زلمی نے یہ میچ 58 سکور سے جیت لیا۔ 90 کے مجموعی سکور پر کوئٹہ کی ساری ٹیم آؤٹ ہو گئی تھی۔ ہم نے صرف چوہدری کے بیٹے کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا تھا جبکہ یہاں پر ہمیں دونوں باپ بیٹا مل گئے تھے۔ رات ہم نے ادھر ہی آرام سے گزاری اور دوسرے دن صبح صبح میں اور اسد شاہدرہ کے اس بھینس فارم پر آ گئے۔ چوہدری اور اس کے بیٹے کو ہوش آ گیا تھا۔ طلحہ نے انہیں ایک رسی کی مدد سے بہت مضبوطی سے باندھا ہوا تھا۔ میں نے اور اسد نے ایک کالا ماسک چہرے پر چڑھایا اور اندر چلے گئے۔ چونکہ ہم نے ان دونوں کو جان سے نہیں مارنا تھا اس لئے ان کے سامنے نقاب میں جا رہے تھے تاکہ وہ ہم میں سے کسی کو پہچان نہ سکیں۔ طلحہ بھی ان کے سامنے نقاب میں ہی جاتا تھا۔

''جی تو چوہدری صاحب! کیا حال ہے آپ کا؟'' میں نے چوہدری صاحب کو سلام کیا اور اس کے

سامنے کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔

''تمہارے سامنے رسیوں سے بندھا ہوا ہوں، اس سے اچھا اور کیا حال ہوگا؟ مجھے تم سب نوجوان لڑکے لگتے ہو، اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ہمیں چھوڑ دو تو میں تم سب کو ایک اچھی نوکری بھی دوں گا اور تمہاری مالی مدد بھی کروں گا۔ جرم بھی چھوڑ دو اور اچھی زندگی گزارو۔'' اس نے مسلسل بولتے ہوئے کہا۔

چوہدری شہباز واقعی بہت نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ یہ پاکستان کے بل گیٹس تھے۔ یہ بھی بل گیٹس کی طرح جتنا کمارہے تھے اتنا ہی چیرٹی میں دے رہے تھے۔ اربوں روپیہ لٹانے کے باوجود ان کے پاس کھربوں روپیہ تھا۔ پاکستان اور انڈیا میں زمین کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور اس بزنس میں بہت پیسہ ہے۔ ایک عام بلڈر بھی پراپرٹی کے بزنس میں کروڑوں کما لیتا ہے اور چوہدری صاحب تو اس بزنس کے ٹائیکون تھے۔ وہ پراپرٹی کے کاروبار کے بے تاج بادشاہ تھے اور ان کے اثاثوں کی تعداد کھربوں میں تھی۔ ان کے لئے کام کرنے والے لوگوں کی تعداد ہی لاکھوں میں تھی۔ میں نے بچپن میں اپنی ماں سے سنا تھا کہ بیٹا آپ اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کرو گے تو اللہ اسی دنیا میں آپ کو اس سے دس گناہ زیادہ دے گا۔ یہ بات چوہدری صاحب پر مکمل فٹ بیٹھتی تھی۔ وہ غریبوں پر ایک روپیہ خرچ کرتے تھے تو خدا ان کو دس روپے کے حساب سے منافع بھی دے دیتا تھا۔ ان کے اثاثوں کی تعداد ہر روز بڑھ رہی تھی۔ میں نے اپنے سارے ساتھیوں کو خاص طور پر یہ تاکید کی تھی کہ وہ چوہدری صاحب کے ساتھ بالکل سختی نہ کریں۔ یہ ہمارے ملک کی معزز ترین ہستی تھی اور انہیں کسی بھی قسم کی تکلیف ہم انہیں پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ طلحہ ان سے بہت تمیز سے پیش آیا تھا اور انہیں طلحہ کے رویے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم روایتی مجرم نہیں ہیں بلکہ کسی پڑھی لکھی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمیں یہ سب چھوڑ کر ایک اچھی اور صاف زندگی گزارنے کا مشورہ دے رہے تھے۔

''چوہدری شہباز، دی پراپرٹی ٹائیکون آف اسلامی جمہوریہ پاکستان ۔۔۔ سوری میں نے غلط کہا ہے، آپ کی کمپنی تو پورے ایشیاء میں پہلے نمبر پر ہے۔'' میں ان کے سامنے بیٹھ گیا جبکہ اسد نے لیپ ٹاپ کھولا اور اسے انٹرنیٹ سے کنیکٹ کرنے لگا۔

''چوہدری صاحب! آپ پاکستان کی معزز ترین شخصیت ہیں۔ ہم سب جتنے بھی لڑکے ہیں یہ آپ کے جوتوں کی خاک کے بھی برابر نہیں ہیں۔ آپ ہماری سوچ سے بھی زیادہ معزز اور عزت کے قابل ہیں۔

اس لئے ہماری طرف سے بالکل بے فکر ہو جائیں، ہم آپ کو کوئی بھی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ ہم آپ کو مارنا بھی نہیں چاہتے ہیں اسی لئے چہروں پر نقاب پہنے ہوئے ہیں تا کہ آپ ہمیں پہچان نہ سکیں۔'' میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ بیٹا! تم واقعی اچھے خاندان سے ہو، مجھے بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟ میں تمہاری شرطیں پوری کرنے کی مکمل کوشش کروں گا۔'' میری بات سن کر انہیں تھوڑا حوصلہ ہو گیا۔

''جی جی! شرط تو کوئی نہیں ہے بلکہ آپ سے تھوڑے پیسے چاہیے تھے اس لئے اتنی محنت کی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ انسان کو پیسہ ہی لالچ میں مبتلا کرتا ہے۔ آپ بولو کتنا روپیہ چاہیے؟ میرا سارا پیسہ بزنس میں لگا ہوا ہے لیکن پھر بھی میں تمہارے مطالبات ضرور پورے کرنے کی کوشش کروں گا۔'' ان کے اندر کا بزنس مین اس وقت پورا بیدار تھا اور وہ کم سے کم پر سودے بازی کرنے کے لئے ماحول بنا رہے تھے۔

''چوہدری صاحب! سٹیڈیم کے اندر پورے پاکستان کی سیکورٹی لگی ہوئی تھی لیکن پھر بھی ہم اس پورے سیکورٹی حصار کو توڑ کر آپ کو اور آپ کے بیٹے کو اغوا کر کے یہاں لے آئیں ہیں۔ پیچھے پورے لاہور کی پولیس آپ کو ڈھونڈ رہی ہے لیکن آپ ان کی پہنچ سے بہت دور ہیں۔ ہم نے اس جگہ کو ہی اس طریقے سے بنایا ہوا ہے کہ وہ یہاں تک پہنچ بھی جائیں تو تب بھی آپ کو تلاش نہیں کر سکیں گے۔ ہم نے بہت محنت کی ہے آپ کو یہاں تک لانے میں۔۔۔ اور ظاہر ہے ہم اپنی محنت کا پورا معاوضہ بھی وصول کریں گے۔ اس لئے آپ بزنس مین مت بنیں اور ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ تا کہ آپ بھی واپس اپنے گھر جا سکیں اور ہمیں بھی اپنا کام کرنے میں آسانی ہو۔'' میں نے اس بار تھوڑے تیکھے لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! جیسا آپ کہتے ہو میں کرنے کو تیار ہوں۔ آپ بتاؤ آپ کو کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟ میں دینے کے لئے تیار ہوں۔'' انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو یار! کام ہو گیا ہے یا ابھی کچھ دیر ہے؟'' میں نے پیچھے مڑ کر اسد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنے لیپ ٹاپ کو آن کر کے کچھ سرچ کرنے میں مصروف تھا۔

''جی بھائی! صرف ایک منٹ اور چاہیے، سب کچھ ریڈی ہو جائے گا۔'' اس نے کمپیوٹر سے نظریں

ہٹائے بغیر کہا تو میں دوبارہ چوہدری صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''یہ کیا کر رہا ہے کمپیوٹر پر؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں بے اختیار مسکرانے لگا۔

''چوہدری صاحب! آپ کا ہی کام ہو رہا ہے۔ بس ایک منٹ دے دو، میں سب سمجھا دیتا ہوں۔'' اس بار اسد نے پیچھے سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ہم سب خاموشی سے اسد کے کام مکمل کرنے کا انتظار کرنے لگے۔ اس نے ایک منٹ کی بجائے پانچ منٹ لگائے اور وہ کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہو گیا ہے بھائی! اب آپ بات کر سکتے ہو۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! کتنا ہے ان کے پاس اور اکاونٹ میں کتنا کتنا ہے؟'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''بھائی! ٹوٹل بیس ہے، دو باہر ہے جبکہ اٹھارہ ملک کے اندر ہے۔ اٹھارہ میں سے صرف تین ہی فزیکل ہے، باقی سارا اثاثوں کی صورت میں ہے۔'' اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''اوہ! ٹھیک ہے لیکن باہر والا دو بھی تو فزیکل ہی ہوگا؟ یا وہ بھی اثاثوں کی صورت میں ہے؟'' میں نے اس سے دوبارہ پوچھا۔

''جی بھائی! وہ فزیکل ہے اور ان کی کوئی بھی پراپرٹی بیرون ملک نہیں ہے۔'' اس نے چوہدری صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! کھل کر بات کرو، مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔'' چوہدری صاحب نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل! اب میں ذرا کھل کر آپ سے بات کر لیتا ہوں۔ آپ کے کل اثاثوں کی تعداد 20 ارب ڈالر ہے۔'' میں نے کرسی کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو کمپنی کے اثاثے ہیں اور اس میں تقریباً ایک لاکھ کے قریب شیئر ہولڈر بھی ہیں۔'' انہوں نے جلدی سے بولتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ یہ کمپنی کے اثاثے ہیں۔'' میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''بیٹا! 20 ارب ڈالر تو بہت زیادہ رقم ہے۔ اتنی بڑی تو مائیکروسافٹ کی کمپنی بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی یہ

ساری رقم پراپرٹی کی صورت میں ہے اور میں ادھر بیٹھ کر زمین نہیں بیچ سکتا۔'' انہوں نے بے چارگی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

گورنمنٹ آف پاکستان نے زمین کی خرید وفروخت کا ایک قانون نافذ کیا تھا۔اس کے مطابق زمین خریدنے اور بیچنے والا دونوں مقامی آفس میں متعلقہ آفیسر کے سامنے بیٹھ کر دستخط کرتے تھے۔اس کے بعد ہی زمین دوسرے آدمی کے نام پر منتقل ہوتی تھی۔ یہ کوئی فلمی سین نہیں ہوتا تھا کہ ولن نے زبردستی زمین کے کاغذات پر دستخط لے لئے اور پھر ساری جائیداد ولن لے جاتا تھا۔اس کے لئے باقاعدہ دونوں پارٹیوں کو جج کے روبرو ہونا پڑھتا تھا۔ یہ بہت اچھا قانون تھا لیکن اس قانون سے بیرون ملک پاکستانیوں کو بہت نقصان ہوتا تھا۔ بیرون ملک مقیم اوورسیز پاکستانی زمین خریدنا چاہتے تھے لیکن انہیں زمین خریدنے کے لئے پاکستان آنا پڑتا تھا۔صرف رقم بھیج کر وہ زمین نہیں خرید سکتے تھے۔

عرب ممالک میں قانونی طریقے سے رہنے والے پاکستانیوں کو تو اس سے کوئی پرابلم نہیں تھی لیکن یورپ میں مقیم غیر قانونی تارکین وطن کو اس سے بہت پرابلم ہوتی تھی۔ان کے پاس ویزہ نہیں ہوتا تھا لیکن پیسہ بہت زیادہ ہوتا تھا۔ یورپ میں لڑکے دو دو لاکھ روپیہ ماہانہ کماتے ہیں اور اس پیسے سے زمین خریدنا چاہتے ہیں لیکن اس قانون کی وجہ سے وہ زمین نہیں خرید سکتے۔حکومت کو اس معاملے پر بھی توجہ دینی چاہیے اور قانون میں تھوڑی نرمی کرنی چاہیے۔زمین بیچنے والا تو جج کے سامنے جا کر دستخط کرے لیکن لینے والے کا صرف شناختی کارڈ ہی ہو تو اس سے بہت سے اوورسیز پاکستانیوں کا بھلا ہو جائے گا اور وہ بیرون ملک سے ہی پیسے ادا کر کے زمین خرید سکیں گے۔ پاکستان میں دو لاکھ کی جگہ خریدنی ہو تو ٹکٹ ہی دو لاکھ کی بن جاتی ہے۔ جو زمین دو لاکھ کی ہوتی ہے اس میں پاکستان آنے جانے کا خرچہ بھی ڈالو تو یہی زمین پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے ملک کے حکمرانوں کو اس طرف بھی متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ بیرون ملک مقیم نوجوان طبقے کو پاکستان میں زمین خریدنے میں آسانی ہو گی تو وہ پیسوں کو ضائع کرنے کی بجائے اس سے پراپرٹی خریدیں گے اور ملک کے اندر یورو اور ڈالر آئیں گے،جس سے ملک بھی خوشحال ہو گا۔

''بیٹا! میرے پاس اربوں روپیہ نہیں ہے۔ میں آپ کو بہت زیادہ پیسہ نہیں دے سکتا۔'' وہ اب بھی ہمیں کم قیمت مانگنے پر اکسا رہے تھے۔

''چوہدری صاحب! مجھے سب معلوم ہے۔ہم نے آپ کو اغوا کرنے سے پہلے سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔

آپ کے پاس کم از کم پانچ ارب ڈالر کیش کی صورت میں موجود ہے اور ہمیں اس میں سے ایک ارب چاہئیں۔'' میں نے نارمل انداز میں کہا۔

''کیا؟ ایک ارب؟ نہیں! نہیں! ایک ارب روپیہ بہت زیادہ ہے میرے لئے۔۔۔ میں ایک ارب روپیہ آپ کو نہیں دے سکتا۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ روپیہ دے سکتا ہوں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''چوہدری صاحب! ہم پاکستان کے امیر ترین آدمی کو اغوا کر کے لائے ہیں کسی پٹواری کو نہیں۔ ایک کروڑ روپیہ تو ہمیں لاہور کے کسی بھی پٹواری سے مل سکتا ہے۔ میں ارب کی بات کر رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ اتنے پیسے آرام سے دے سکتے ہیں۔ کیوں بھائی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' میں نے اسد کو آنکھ مارتے ہوئے پوچھا۔

''جی! یہ تو اس سے زیادہ بھی دے سکتے ہیں لیکن ہمیں زیادہ لالچ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے لئے اتنے ہی کافی ہیں۔'' اسد مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''بیٹا! یقین کرو میں اس قدر پیسہ آپ کو نہیں دے سکتا، ایک ارب روپیہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ آپ دس کڑور تک لے لو، اس سے زیادہ میں نہیں کر سکتا۔'' وہ ابھی تک ہم سے بارگینگ کرنے میں مصروف تھے۔

''چوہدری صاحب! میں پاکستانی روپوں کی بات نہیں کر رہا ہوں، شریف لڑکے ہیں لیکن بہرحال بیوقوف نہیں ہیں۔ پاکستانی روپوں میں کوئی بھی ڈیلنگ نہیں ہو رہی ہے۔ مجھے ڈالروں میں پیسہ چاہیے امریکن ڈالر۔۔۔ سنا ہے؟'' میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تو اس بار انہیں حقیقتاً جھٹکا لگا اور وہ کچھ بولتے بولتے اچانک ہی رک گئے۔ آواز ان کے حلق میں اٹک گئی تھی اور وہ مزید کچھ بھی نہیں بول رہے تھے۔

''کیوں چوہدری صاحب! اب بات سمجھ میں آ گئی ہو گی؟ مانا کہ آپ پاکستان کی سب سے بڑی شخصیت ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ ہمیں بے وقوف بنانے لگیں۔'' میں نے غصے سے بولتے ہوئے کہا۔

''آپ کا تعلق کس ایجنسی سے ہے؟ ملٹری کی کسی ایجنسی سے ہو، سول ایجنسی سے یا پولیس کی کسی خفیہ ایجنسی سے؟'' انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ وقتی شاک سے باہر نکل آئے تھے اور اب

مکمل پراعتماد لگ رہے تھے۔

''نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے، ہمارا تعلق کسی بھی ایجنسی سے نہیں ہے۔ ہم پرائیویٹ کام کر رہے ہیں۔'' اس بار میں بھی سیریس ہو گیا۔

''نہیں! میں یہ مان ہی نہیں سکتا۔ تم ضرور کسی حکومتی ایجنسی کے اہلکار ہو، عام مجرم لڑکے نہیں ہو۔ اس قدر فول پروف پلان بنا کر تماشائیوں سے بھرے ہوئے سٹیڈیم سے بغیر کسی نقصان کے تم ہم دونوں کو اغوا کر کے لے آئے ہو۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ تم ایجنسی کے اہلکار نہیں ہو۔ تمہیں میرے بارے میں مکمل معلومات ہیں۔'' وہ کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''چوہدری صاحب! میں صرف آپ سے دو باتیں کروں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا تعلق کسی بھی ایجنسی سے نہیں ہے اور ہم سب بالکل عام نوجوان ہیں۔ جنہوں نے ایک اچھا پلان بنایا اور کامیاب ہو گئے۔ میں آپ سے جھوٹ بول سکتا تھا کہ ہم ملٹری ایجنسی سے ہیں اور مجھے یقین بھی تھا کہ آپ ملٹری ایجنسی کا نام سن کر ہی آسانی سے رقم دے دیتے۔ یہ بہت آسان تھا لیکن میں جھوٹ بول کر اپنے ملک کی آرمی کو بدنام نہیں کر سکتا۔ میں ایک سچا پاکستانی ہوں اور پاکستان کو دل سے محبت کرتا ہوں۔ یہ تو ہوئی پہلی بات۔۔۔ جبکہ دوسری بات یہ ہے کہ ہم سب کچھ بھی غلط نہیں کر رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمارا طریقہ غلط ہے لیکن یقین کریں ہمارا مقصد غلط نہیں ہے۔ ہم اس ملک کے لئے کچھ بڑا کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ہمیں بہت زیادہ پیسوں کی ضرورت ہے۔ ہم وہی پیسہ آپ سے مانگ رہے ہیں۔ میں ایک پکا اور سچا پاکستانی ہوں اور میری ان رگوں میں مسلمان ماں باپ کا خون گردش کر رہا ہے۔ میں مسلمان ہوں اور مقصد صرف اور صرف انسانیت کی سربلندی ہے، میں انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ چوہدری صاحب! میرا طریقہ ضرور غلط ہے مگر مقصد غلط نہیں ہے، میں کچھ بھی غلط نہیں کر رہا ہوں۔'' میں نے جذبات میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! مجھے معلوم ہے کہ تم مجرم نہیں ہو بلکہ کسی اچھے گھر کے چشم و چراغ ہو۔ اس لئے تمہیں نصیحت کر رہا ہوں کہ پلیز! اس کام سے باز آ جاؤ۔ پولیس اور عدالت نیتوں کو نہیں دیکھتی بلکہ وہ صرف فیصلہ سناتی ہے۔ تم جتنے بھی تیز اور چالاک کیوں نہ ہوئے آخر پولیس کے ہاتھوں پکڑے جاؤ گے اور تمہاری ساری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ پلیز! یہ سب کچھ چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو، میں تمہیں خدمت کا موقع بھی دوں گا اور پیسہ بھی

دوں گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ بس سب کچھ قانونی طریقے سے کرو۔ میں تم جیسے نوجوان لڑکوں کو جیل میں سڑتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔'' وہ میرا جذباتی پن دیکھ کر خود بھی جذباتی ہو گئے تھے اور ہمیں اپنے ساتھ کام کی آفر کر رہے تھے۔

''نہیں سر! ہم جو کر رہے ہیں وہی صحیح ہے اور اگر اس کام کو کرتے ہوئے ہماری جان بھی چلی گئی تو ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہو گی۔ آپ ہماری فکر چھوڑ و اور اپنی فکر کرو۔ ہم آپ کو اغوا کر کے لائے ہیں تو اب پیسے بھی لے کر ہی جائیں گے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اسد اور طلحہ دونوں ہماری باتیں سن رہے تھے لیکن درمیان میں ٹوک نہیں رہے تھے۔ چوہدری شہباز کا بیٹا حارث بھی وہیں کرسی پر بندھا ہوا تھا۔ وہ ہم سب کی طرف سہمے سہمے انداز میں دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! جیسے تم کہتے ہو، میں رقم دینے کے لئے تیار ہوں۔۔۔لیکن پلیز! میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں، میں پچاس کروڑ روپیہ تک دے سکتا ہوں۔ تم سب کے لئے پچاس کروڑ بہت ہو گا اس سے زیادہ میں نہیں دے سکتا۔'' وہ دوبارہ کاروباری آدمی بن گئے۔

''سر جی! آپ پھر پاکستانی روپوں کی بات کر رہے ہو؟ ہمیں صرف اور صرف امریکن ڈالر ہی چاہئیں اس لئے بات چیت میں ڈالر کا لفظ استعمال کرو۔'' اس بار اسد نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔ میں پچاس کروڑ روپیہ دے سکتا ہوں جو کہ امریکن کرنسی میں پانچ ملین ہوں گے۔''

''دیکھو چوہدری شہباز صاحب! ہم یہاں کوئی بارگیننگ نہیں کر رہے ہیں بلکہ صرف اور صرف ایک ہی بات ہے، ایک ارب ڈالر۔۔۔۔ہم اس سے ایک روپیہ بھی کم نہیں لیں گے۔ آگے آپ کی مرضی ہے کہ آپ کیسے یہ پیسے دیتے ہو۔ آرام سے دے دو گے تو یہ آپ کے اور آپ کے بیٹے دونوں کے لئے اچھا ہو گا اور ہمارے لئے بھی یہی بہتر ہے۔ ورنہ ہم نے اتنا بڑا رسک لیا ہے تو پھر پیسوں کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ میں بہت شریف انسان ہوں لیکن اگر آپ مجبور کرو گے تو میں آپ کے بیٹے کا آپ کی نظروں کے سامنے گلا کاٹ سکتا ہوں۔'' میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔

''چوہدری صاحب! میں نے اتنی دہشت گردی دیکھی ہے جتنی آپ نے سوچی بھی نہیں ہو گی۔ میں

نے اپنے پورے خاندان کو تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں بہت معصوم تھا۔ اس دہشت گردی نے میرے ساری معصومیت چھین لی ہے۔ اگر یہ بات میری برداشت سے باہر ہوگئی تو میرے اندر کا جانور جاگ جائے گا۔ پھر یہاں پر نہ ہی آپ رہو گے اور نہ ہی آپ کا یہ معصوم سا بیٹا ہوگا۔ میں بہت شریف ہوں لیکن میری شرافت مجھے میرے مقصد سے دور نہیں کر سکتی۔ ایک ارب ڈالر بولا ہے تو پورا ایک ارب ڈالر ہی لوں گا۔ ورنہ ابھی اسی جگہ میں تمہارے بیٹے کا گلہ کاٹ دوں گا۔ بولو پیسے دیتے ہو یا اب بھی کوئی بہانہ ہے تمہارے پاس؟'' میں نے غصے سے غرّاتے ہوئے کہا۔ میرے غصے کو دیکھ کر سبھی اپنی اپنی جگہوں پر جم کر رہ گئے۔ حارث تو بے چارہ ڈر کر رونے لگا۔

''کیا بولتے ہو چوہدری صاحب! پیسے دیتے ہو یا پھر تماشہ دیکھنا ہے؟'' میں ایک بار پھر چنگھاڑا۔

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے۔۔۔ میں پیسے دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ لوگ خدا کے لئے میرے بیٹے کو کچھ مت کہیں۔'' وہ تیز تیز بولنے لگے۔ خوف سے ان کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

''یہ ہوئی نا بات! دیکھو کتنے آرام سے کام ہو رہا ہے۔'' اسد نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا تو مجھے بھی بے اختیار ہنسی آ گئی اور میں ہنسنے لگا۔

میں کوئی دہشت گرد نہیں تھا بلکہ راجستھان کا ایک سادہ سا نوجوان تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی بندوق ہی نہیں دیکھی تھی۔ میرے ماں، باپ اور بہن، بھائیوں کے بہیمانہ قتل نے مجھے درندہ بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرا تو اس دنیا سے ہی دل اٹھ گیا تھا۔ میں تو خود بھی مر جانا چاہتا تھا لیکن بچ گیا۔ آرمی کے دو ہیلی کاپٹروں نے شیلنگ کر کے پوری پہاڑی ہی اڑا کر رکھ دی تھی لیکن میں اس پہاڑی پر ہونے کے باوجود بھی بچ گیا تھا۔ رائفل کا ایک پورا برسٹ مجھے لگا تھا لیکن میں پھر بھی بچ گیا تھا۔ میرے اندر کا معصوم انسان مر چکا تھا اور اس کی جگہ ایک درندے نے لے لی تھی۔ میں اس درندے کو مذہب اور انسانیت کا سبق پڑھا پڑھا کر سکون دلاتا رہتا تھا اور یہ سویا رہتا تھا۔ خدا نے مجھے نئی زندگی دی تھی اور میں اس زندگی کو انسانیت کی بھلائی پر خرچ کرنا چاہتا تھا۔

چوہدری صاحب پیسے دینے پر آمادہ ہو گئے تو اگلا مرحلہ پیسے لینے کا تھا۔ اتنی بڑی رقم کسی سوٹ کیس میں تو نہیں ڈال کر لائی جا سکتی تھی۔ اب یہ ایک ارب ڈالر کی رقم تھی اور اتنی بڑی رقم کے لئے ایک بڑا ٹرک بھی ناکافی تھا۔

''بیٹا! میں ایک ارب ڈالر دینے کے لیے تیار ہوں لیکن اتنی بڑی رقم میں فوراً تو ادا نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کے لئے کچھ وقت چاہیے۔'' انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے بے چارگی سے کہا تو میری ہنسی نکل گئی۔

''سر جی! آپ واقعی ہمیں بے وقوف سمجھ رہے ہو۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم پڑھے لکھے ڈاکو ہیں اور ہمارے پاس سب انتظامات ہیں۔'' اسد نے مسکراتے ہوئے کہا اور واپس لیپ ٹاپ کی طرف چلا گیا۔

''چوہدری صاحب! آپ نے دو ارب ڈالر ایک سوئس اکاؤنٹ میں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے ابھی دس سال پہلے ہی یہ اکاؤنٹ بنوایا ہے، ہمیں ساری معلومات ہیں۔ ہم اس اکاؤنٹ میں سے ایک ارب ڈالر لیں گے۔'' میں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا

''بیٹا! وہ۔۔۔ میں یہ اکاؤنٹ بنوانا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے ایک دوست نے زور دے کر مجھ سے بنوایا تھا۔ وہ بولتا تھا کہ پاکستان کے حالات کا کوئی اعتبار نہیں ہے اس لئے اپنی ایک سیف سائیڈ ضرور رکھنی چاہیے۔ سوری بیٹا! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے اپنے ملک پر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔'' انہوں نے شرمندگی سے کہا۔ ان کی نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں اور وہ بہت شرمسار نظر آرہے تھے۔ مجھے بے اختیار اس عظیم شخص پر ترس آنے لگا۔

یہاں ملک کے ہر تیسرے سیاستدان کے بیرون ملک اکاؤنٹ تھے جن میں اربوں ڈالر پڑے ہوئے تھے۔ یہ سیاست دان ملک کی دولت لوٹ کر باہر لے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کے بڑے بڑے محل لندن اور امریکہ میں تھے جبکہ یہ شخص تو سب کچھ ہی پاکستان میں کر رہا تھا۔ یہ پاکستان میں ہی بیٹھ کر کما رہا تھا اور پاکستان میں ہی بیٹھ کر کھا رہا تھا۔ اس شخص نے لاکھوں پاکستانیوں کو روزگار دیا ہوا تھا۔ یہ اربوں روپیہ سالانہ ٹیکس دیتا تھا لیکن ہماری گورنمنٹ اس شخص کو بھی سیکورٹی دینے میں ناکام ہو رہی تھی۔ پورے پاکستان میں کوئی ایک بھی حکومتی عہدیدار ایسا نہیں تھا جو اسے گارنٹی دیتا، اس کے مال کی گارنٹی دیتا۔ اگر گورنمنٹ آف پاکستان ہمارے پیسے کے محفوظ ہونے کی گارنٹی دیں تو کسی بھی شخص کو ملک سے باہر پیسہ اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

''کوئی بات نہیں ہے سر! ہم سب انسان ہی ہیں اور ہم سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔ ملک سے باہر پیسہ چھپا کر رکھنا ایک جرم ہے۔ آپ کے دوست کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے ان کے کندھے پر

ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''لو جی! اب کام ہو گیا ہے، میں نے ایک اکاؤنٹ بنا لیا ہے۔ ہم چوہدری صاحب سے پیسہ لے کر دوسرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر سکتے ہیں۔'' اسد نے اونچی آواز سے کہا تو میں اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے سوئس بنک میں ایک علیحدہ اکاؤنٹ بنا لیا تھا۔ یہ عارضی اکاؤنٹ تھا۔

ہمارے سوئس بنک میں پہلے سے ہی تین اکاؤنٹ موجود تھے۔ ہم چوہدری صاحب سے ایک ارب ڈالر لے کر عارضی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرتے اور پھر وہاں سے آگے تینوں اکاؤنٹس میں منتقل کر کے اس عارضی اکاؤنٹ کو بند کر دیتے۔ یہ سارے فیک اکاؤنٹ تھے اور کہیں بھی پکڑے نہیں جا سکتے تھے۔ سوئس حکومت کبھی بھی ان بنک اکاؤنٹ کی تفصیل نہیں بتاتی تھی۔ آج پاکستان اور انڈیا کی تقریباً آدھی دولت انہی بنکوں میں پڑی ہوئی ہے اور صرف اسی وجہ سے پڑی ہوئی کہ یہ بنک گارنٹی دیتے ہیں کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے آپ کی یہ دولت ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

دنیا کی کوئی بھی عدالت یا حکومت آپ کی اس رقم کو نہیں چھین سکتی۔ یہی گارنٹی ان لوگوں کو اپنی دولت ادھر لانے پر مجبور کرتی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں ہماری حکومتیں تبدیل ہوتے ہی سب سے پہلے بنک اکاؤنٹ سیل کرتی ہیں۔ ایک عام آدمی اپنے پانچ روپے بھی کسی ایسے شخص کو نہیں دیتا جس سے واپسی کی امید نہ ہو تو پھر اربوں روپیہ کیسے بغیر گارنٹی کے دے سکتا ہے۔ ملک کے اندر پیسے لانے سے پہلے ہمیں یہ گارنٹی تو دینی ہو گی۔

ہم چوہدری صاحب سے ایک ارب ڈالر اسی سوئس اکاؤنٹ سے اپنی طرف ٹرانسفر کروانا چاہتے تھے۔ سوئس اکاؤنٹ جتنے محفوظ تصور کیے جاتے تھے اتنے تھے نہیں۔ کیونکہ یہ معلومات کو خفیہ رکھتے تھے۔ اس لئے آسانی سے رقم دوسرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جاتی تھی اور اکاؤنٹ کھولنے کے لئے کسی بھی قسم کی ذاتی معلومات درکار نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار پیسہ ٹرانسفر ہونے کے بعد نہ ہی پیسہ واپس آتا ہے اور نہ ہی اگلے اکاؤنٹ کی کوئی معلومات ملتی ہے۔ یہ پیسہ وصول کرنے کا دنیا کا سب سے محفوظ ترین طریقہ ہے۔

''جی بھائی! میں مکمل تیار ہوں۔ چوہدری صاحب کا بنک اکاؤنٹ نمبر اور پاس ورڈ چاہیے!'' اسد نے میرے قریب آ کر کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے! تم ایسا کرو کہ لیپ ٹاپ اور سکیننگ مشین ادھر ہی لے آؤ۔ ہم یہیں پر چوہدری صاحب

سے اکاؤنٹ نمبر اور پاس ورڈ لے لیتے ہیں اور سکیننگ بھی کرلیں گے۔'' میں نے لیپ ٹاپ کو پکڑ کر اوپر اٹھایا تو اسد نے اس کے نیچے سے کرسی اٹھالی اور ہم سارے سامان کو چوہدری شہباز کے قریب لے گئے۔ اسد نے چوہدری صاحب سے اکاؤنٹ نمبر مانگا تو انہوں نے آگے سے اکاؤنٹ نمبر برانچ نمبر اور بنک کا نام بتا دیا۔ جسے اسد نے انٹرنیٹ میں ڈالا اور چوہدری صاحب کا اکاؤنٹ اوپن کرلیا۔ اکاؤنٹ میں کوئی بھی رقم شو نہیں ہو رہی تھی۔ یہ صرف پاس ورڈ دینے سے ہی شو ہوتی تھی۔ اسد نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے آگے سے پاس ورڈ بتا دیا۔ جسے اسد نے جلدی سے اکاؤنٹ میں انٹر کر دیا۔

''واہ چوہدری صاحب! یہ تو دو ارب سے بھی زیادہ رقم ہے!'' میں نے کمپیوٹر کی سکرین پر نظر ڈالی جہاں 2.25 بلین کی رقم لکھی ہوئی تھی۔ یہ سوا دو ارب ڈالر بنتے تھے۔ یعنی 225 کروڑ ڈالر۔۔۔

''رقم ہمیشہ راؤنڈ فگر میں ہی بتائی جاتی ہے، دس بیس اوپر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے سوچا شاید بہت زیادہ رقم ہے۔'' میں نے نارمل لہجے میں کہا۔

''بھائی! یہ کونسا راؤنڈ فگر ہے جو پورے 25 کروڑ ڈالر کو ختم کر دیا؟ پاکستانی روپوں میں یہ پچیس کروڑ تیس ارب روپیہ بنتا ہے اور آپ اسے راؤنڈ فگر کر رہے ہو؟'' اسد نے میرا بازو پکڑ کر اسے ہلاتے ہوئے کہا۔

''چلو کوئی بات نہیں ہے، غلطی ہوگئی۔ سوا دو ارب ڈالر ہیں ان کے اکاؤنٹ میں۔۔۔ اب ایسا کرو کہ ایک ارب ڈالر نکالو اس اکاؤنٹ میں سے اور دوسرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرو۔'' میں نے مصنوعی غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''جی جی بھائی! ابھی کرتا ہوں، سوا ارب کرلوں نا؟ راؤنڈ فگر والی رقم بھی ہم لے لیتے ہیں؟'' اس نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ چوہدری صاحب کی شکل اس کے الفاظ سن کر ہی مسکین بن گئی تھی۔ ایک ارب ڈالر بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ پورے پاکستان میں شاید دس کے قریب لوگ ہوں گے جن کے پاس ایک ارب ڈالر سے اوپر رقم ہے۔ وہ ایک ارب کی بجائے سوا ارب لینے کی بات کر رہا تھا۔ پورے تیس ارب روپے زائد۔۔۔ چوہدری صاحب کی شکل تو واقعی ایسی ہی بنتی تھی۔

''نہیں! ہم نے ایک ارب ڈالر بولا ہے تو صرف ایک ارب ڈالر ہی لیں گے۔ اس سے ایک روپیہ بھی زائد نہیں لیں گے۔ ہمارے کام کے لئے ایک ارب ڈالر کافی ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو

اسد کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمودار ہونے لگے جبکہ چوہدری صاحب میری بات سن کر مطمئن ہو گئے۔

اسد نے چوہدری صاحب کے اکاؤنٹ سے ایک ارب ڈالر دوسرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر لئے۔ ٹرانزیکشن پوری ہونے کے لئے پاس ورڈ کے ساتھ ساتھ چوہدری صاحب کے فنگر پرنٹ اور آنکھ کی سکیننگ بھی ضروری تھی۔ ہم اپنے ساتھ ہی سکینر بھی لائے تھے۔ اسد سکینر کو آگے لے کر آیا تو میں نے چوہدری کے سیدھے ہاتھ کو کھول کر پہلے انگوٹھے کی سکیننگ کی اور پھر آنکھ کی بھی سکیننگ کر لی۔ اس سارے کام میں ہمیں پانچ منٹ لگ گئے۔ اسد ایک بار پھر کمپیوٹر کے ساتھ مصروف ہو گیا جبکہ میں چوہدری صاحب سے گپ شپ کرنے لگا۔

''بیٹا! یہ کام بہت خطرناک ہے جو تم کر رہے ہو۔ پیسہ تو اب تمہارے پاس آ گیا ہے، اس سے عیاشی مت کرنا بلکہ کوئی اچھا کام کرنا اور اس کام کو چھوڑ دینا! اگر زیادہ کا لالچ کرو گے تو مارے جاؤ گے۔'' چوہدری صاحب ابھی بھی ہم کو سمجھا رہے تھے۔

''سر جی! میرا یقین کرو، میں اس رقم کو اپنے ذاتی استعمال کے لئے نہیں لے رہا ہوں۔ مجھے ایک بڑا کام کرنا ہے اور اس کام کے لیے ہی مجھے اتنی بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ ہم سب اسلام اور انسانیت کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کچھ بھی غلط نہیں کریں گے۔'' میں ایک بار پھر جذباتی ہونے لگا۔

''بیٹا! کیا میں تمہارا کام جان سکتا ہوں کہ تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' اس نے سوال کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر! یہ بہت ہی خفیہ ہے، میں اس کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''یار! پھر بھی کچھ تو بتاؤ؟ کہیں ٹھیک کرنے کے چکر میں کچھ غلط مت کر بیٹھنا! کچھ فیصلے اور کچھ چیزیں ہمیں ٹھیک لگتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ غیر قانونی ہوتی ہیں اور اس سے ملک اور اسلام دونوں کو ہی ہم نقصان پہنچا بیٹھتے ہیں۔'' انہوں نے مجھے فلسفیانہ انداز میں بتاتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں ٹھیک کر رہا ہوں۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

''کہیں طالبان وغیرہ کے ساتھ تو نہیں ملے ہوئے ہو؟ یا داعش اور القاعدہ وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے؟ یہ

سب دہشت گرد ہیں، کوئی بھی جہاد نہیں کر رہا ہے۔ کسی معصوم انسان کی جان لینا جہاد نہیں ہوتا ہے بیٹا! مسجد کے منبر پر کھڑا ہو کر بولنے والا مولوی سچا نہیں ہوتا۔ کچھ مسجدیں مزار بھی ہوتی ہیں۔ صرف خدا اور اس کے رسول کا بتایا ہوا دین ہی سچا ہے۔ باقی لوگ جھوٹ بھی ہو سکتے ہیں اس لئے آپ سب کو احتیاط کا کہہ رہا ہوں۔ جان دینی ہے تو کسی اچھے مقصد کے لئے جان دینا! انسانیت پر ظلم کرو گے، کسی معصوم کی جان لو گے تو جنت نہیں ملے گی۔'' ان کو پیسوں سے زیادہ ہماری فکر ہو رہی تھی۔

''جی بھائی! ٹرانزیکشن مکمل ہو گئی ہے۔ ایک ارب ڈالر ہمارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو چکا ہے۔ بس اسے فعال ہونے کے لئے چوبیس گھنٹے لگتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اس اکاؤنٹ کو ہینڈل کر سکتے ہیں۔'' میرے بولنے سے پہلے ہی اسد بول پڑا۔ اس نے پیسے ہمارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر لیے تھے۔

''چلو یہ کام تو ہو گیا۔ اب یہ لوگ تو جا سکتے ہیں نا؟'' میں نے پیچھے مڑ پوچھا۔

''نہیں بھائی! ابھی چوبیس گھنٹے مزید انہیں ادھر ہی رہنا ہو گا۔ جب تک یہ سارا پراسیس مکمل نہیں ہو جاتا ہم کوئی خطرہ نہیں لے سکتے۔'' اس نے مجھے منع کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! آپ کا کام ہو گیا ہے تو ہمیں جانے دو نا؟ اب پیسے واپس میرے اکاؤنٹ میں تو ٹرانسفر نہیں ہو سکتے؟'' چوہدری باری باری ہم سب کی طرف دیکھنے لگا۔

''نہیں سر جی! پیسے ہمارے اکاؤنٹ میں ایک بار آ گئے ہیں، اب یہ واپس تو نہیں جا سکتے البتہ آپ اسے بلاک کروا سکتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ بنک والوں نے یہ سسٹم بھی رکھا ہوتا ہے۔ آپ چوبیس گھنٹوں میں کسی بھی وقت اس رقم کو بلاک کروا سکتے ہو۔ اس کے بعد یہ رقم دونوں پارٹیوں کے دوبارا اکٹھے بیٹھنے سے ہی واپس یا پھر ہمارے اکاؤنٹ میں آ سکتی ہے۔'' اسد نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آئی۔'' میں نے اپنے دماغ پر زور دیا لیکن مجھے اس کی سمجھ نہیں آئی۔

''بھائی جی! یہ رقم چوبیس گھنٹوں کے لئے نیوٹرل رہتی ہے۔ نہ ادھر اور نہ ہی ادھر جا سکتی ہے۔ اس دوران رقم بھیجنے والا اسے بلاک کر سکتا ہے لیکن واپس نہیں منگوا سکتا۔ واپس بھیجنے کے لئے اسے اگلی پارٹی کی ضرورت پڑتی ہے یعنی کہ ہم۔ ہم اسے واپس بھیج سکتے ہیں لیکن کسی دوسرے اکاؤنٹ میں نہیں لے جا سکتے۔ چوبیس گھنٹوں کے بعد یہ مکمل طور پر ہماری ہو گی اور پھر اسے کوئی بھی نہیں لے جا سکتا۔ اس لئے ہمیں اب صرف چوبیس گھنٹے انتظار کرنا ہے اور بس اس کے بعد ایک ارب ڈالر ہمارے ہو جائیں گے۔'' اس نے

پوری تفصیل سے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اوہ! تو یہ بات ہے۔سوری چوہدری صاحب! آپ کو ابھی چوبیس گھنٹے ادھر ہمارے ہی پاس رہنا ہو گا۔'' میں اس بار چوہدری شہباز کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ٹھیک ہے لیکن آپ میرے بیٹے کو تو چھوڑ سکتے ہو نا؟ یہ بے چارا بھی میرے ساتھ ادھر بندھا ہوا ہے۔'' اس نے بے چارگی سے کہا تو میں ایک بار پھر پیچھے اسد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''نہیں بھائی! ہم اس کو بھی چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتے کیونکہ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ہو سکتا ہے چوہدری صاحب کے علاوہ کوئی اور بھی اس اکاؤنٹ کو کنٹرول کرتا ہو اور وہ باہر سے ہی اسے بلاک کر سکتا ہے۔ابھی تو یہ دونوں ہی ہمارے قبضے میں ہیں اس لئے کوئی بھی یہ پنگا نہیں لے گا لیکن اگر ہم نے حارث کو چھوڑ دیا تو شاید کوئی مسئلہ بن جائے۔سوری سر! ہم یہ چانس نہیں لے سکتے۔صرف مزید ایک دن کی بات ہے، آپ کو ہم سے تعاون کرنا چاہیے۔'' میری بجائے اسد نے ہی انہیں جواب دیتے ہوئے کہا۔

''یار! یہ تو صرف بارہ سال کا ہے۔اسے ان سب چیزوں کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ یہ تو معصوم ہے۔ بندھے ہونے کی وجہ سے یہ بہت گھبرا رہا ہے۔ پتہ نہیں اسے ٹھیک ہونے میں کتنا عرصہ لگے گا۔یہ ڈر اس کے اندر بیٹھ جائے گا۔'' انہوں نے حارث کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔وہ معصوم سا نوجوان تھا۔اغوا کی وجہ سے اس کے دل میں اگر خوف بیٹھ جاتا تو پھر ساری زندگی اس کی شخصیت متاثر رہتی۔ یہ سب کچھ میں جانتا تھا لیکن ہماری مجبوری تھی۔ہم منزل کے بالکل قریب آ کر دھوکہ نہیں کھانا چاہتے تھے۔

''نہیں سر جی! ہم کچھ نہیں کر سکتے، یہ بہت بڑا خطرہ ہو گا۔ہم آپ دونوں میں سے کسی کو بھی ابھی آزاد نہیں کر سکتے۔کل آپ کو ہم چھوڑ دیں گے۔سوری سر! ہم مجبور ہیں۔'' میں نے ایک بار پھر سوری کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔اسد نے اتنی دیر تک کمپیوٹر کا سارا سامان کلوز کر لیا تھا۔ہم نے ان کو سلام کیا اور واپس گھر آ گئے۔

''ہاں اسد! ہمارے یورپ کے ویزوں کا کیا بنا ہے؟ وہ کام کہاں تک مکمل ہوا ہے؟'' میں نے گھر آتے ہی اسد سے پوچھنا شروع کر دیا۔

ہمارا ارادہ یہاں سے جرمنی کا ویزہ لگوانا تھا۔جرمنی سے ہم آسانی سے فرانس چلے جاتے اور پھر فرانس سے کینیڈا، ایجنٹ بحری جہازوں کی مدد سے لے جاتے تھے۔ہم ڈائریکٹ امریکہ کا ویزہ حاصل کر سکتے تھے۔

ہمارے پاس ایک ارب ڈالر تھا۔ ہم سب آسانی سے امریکہ کا ویزہ لے کر جا سکتے تھے لیکن سیدھا امریکہ جانا خطرناک تھا۔ امریکی ائیر پورٹ پر ہمارے سارے کاغذات اور انگلیوں کے نشانات ریکارڈ ہو جاتے جو کہ بعد میں بہت پرابلم کرتے ہیں۔ ہم امریکہ کے کسی بھی ڈیٹا بیس میں اپنا ریکارڈ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ہم ایجنٹ کو پیسے دے کر بحری جہاز کے ذریعے امریکہ پہنچنے اور وہاں سے جعلی کاغذات بنوا کر امریکی صدر کو اغوا کرنے کا پلان بناتے رہے۔ ایجنٹ کے ذریعے امریکہ جانے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ جب ہم صدر صاحب کو اغوا کر لیتے تو پھر اسے ہوائی جہاز کے ذریعے تو پاکستان واپس نہیں لا سکتے تھے۔ مجھے بحری جہازوں کی معلومات لینی تھی۔ میں انہی معلومات کے اوپر ہی اپنا اگلا پلان مرتب کرتا۔

کسی بھی بحری جہاز کا بغیر چیکنگ امریکہ جانا مشکل ہوتا ہے۔ امریکہ سے پاکستان بغیر چیکنگ شپ (Ship) کو لانا مشکل تو ضرور ہوتا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ ہم اگر صدر کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اس سے اگلہ مرحلہ بھی طے ہو جاتا۔ سب سے پہلے تو امریکہ صدر تک پہنچنا تھا۔

''جی علی بھائی! میں نے ایک ایجنٹ سے بات کی ہوئی ہے، وہ ہمارا کام کر سکتا ہے۔ میں صرف چوہدری صاحب کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ میری ساری توجہ ادھر سٹیڈیم سے چوہدری کو اغوا کرنے اور پھر پیسے ٹرانسفر کروانے پر مرکوز تھی اس لئے میں اس معاملے پر اپنی توجہ نہیں دے سکا۔'' اس نے مجھے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی! آج کا دن انتظار کر لیں، کل تک اکاؤنٹ میرے ہاتھ میں آجائے گا تو پھر میں اس سے ویزے کی بات بھی کروں گا اور پیسہ بھی پاکستان لانے کا کوئی بندوبست کر لیتا ہوں۔ اکبر اور راشد تو آج شام کی فلائیٹ سے اٹلی (Italy) جا رہے ہیں۔ ایک ہفتے تک وہ سیٹل ہو جائیں گے تو پھر اکاؤنٹ سے پیسے بھی نکالنا شروع کر دیں گے۔ میں کل ہی اس عارضی اکاؤنٹ سے پیسے تین مختلف اکاؤنٹس میں ڈال دوں گا اور پھر اس کے بعد ہم بھی جرمنی جا سکیں گے۔'' اسد نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

اکبر اور راشد آج دونوں اٹلی جا رہے تھے۔ انہوں نے اٹلی جا کر دو نمبر کاغذات بنوانے تھے۔ ان دو نمبر کاغذات کی مدد سے وہ سوئس اکاؤنٹ سے پیسے نکلواتے اور آگے جدھر بھی ادائیگی کرنی ہوتی وہ انہیں کاغذات کی مدد سے ادائیگی کرتے۔ میں ایک ایک قدم احتیاط سے اٹھا رہا تھا۔ اٹلی میں مہاجرین کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ وہاں پر امیگریشن کا سارا کام پولیس کے انڈر ہوتا تھا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ نے اس کام کے

لئے ہر ملک کے ترجمان بٹھائے ہوتے تھے۔ یہ ترجمان ہی سب کچھ ہوتے تھے اور ان کے پاس بہت پاور ہوتی ہے۔ چونکہ یہ ہمارے ہی ملکوں سے گئے ہوتے ہیں اس لئے ان کے اندر ناجائز آمدنی اور رشوت خوری کا عنصر کافی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ ترجمان پیسے لے کر دو نمبر کاغذات بنوا کر دے دیتے تھے۔ میں ایسے ہی کاغذات بنوانا چاہتا تھا اور آگے کی ساری کاروائی انہی کاغذات کے اوپر چلتی۔ میں بنک اور پیسوں کا سارا لین دین انہی کاغذات کے اوپر کرواتا۔

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ امریکی CIA اور FBI بہت طاقتور ایجنسیاں ہیں۔ ہم جتنا بھی چھپ جاتے انہوں نے ہمیں ڈھونڈ ہی لینا تھا اور سوئس حکومت آسانی سے ان کے سامنے ساری معلومات رکھ دیتی۔ یہ اکاؤنٹ جتنے بھی خفیہ کیوں نہ ہوں CIA کے سامنے ہر چیز عیاں ہو جانی تھی۔ وہ فوراً ہی ہمارے اس اکاؤنٹ کو بھی سیل کروا دیتے بلکہ چوہدری صاحب کے پاس بھی پہنچ جاتے۔ میں اس چیز سے بچنے کے لئے ہی پہلے اکبر اور راشد کے دو نمبر کاغذات بنوا رہا تھا۔ ان دونوں کے ابھی پاکستان میں بھی شناختی کارڈ نہیں بنے تھے۔ ان کے کہیں بھی انگلیوں کے نشانات نہیں تھے۔ پاکستان سے اٹلی بھی وہ دو نمبر کاغذات پر جا رہے تھے۔ امریکی CIA انکوائری کرتی ہوئی صرف ان کاغذات تک ہی پہنچ سکتی تھی اور ہم نے صدر صاحب کے اغوا کے فوراً بعد ہی ان کاغذات کو جلا دینا تھا۔ اکبر اور راشد دونوں اٹلی میں مہاجرین کے کسی کیمپ میں چلے جاتے اور اس کے بعد CIA اپنا پورا زور بھی لگا لیتی تب بھی انہیں تلاش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ عام لوگوں کے ساتھ گھل مل کر بالکل عام افراد بن جاتے۔ دوسرے دن اسد تو پیسوں کے معاملات کو دیکھتا رہا جبکہ میں طلحہ کے پاس شاہدرے آ گیا۔ جہاں چوہدری اور اس کا بیٹا حارث بندھا ہوا تھا۔

''کیسے ہو چوہدری صاحب؟ کھانے پینے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟'' میں ان کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔

''نہیں بیٹا! میں ٹھیک ہوں، تمہارا اگر کام ہو گیا ہو تو ہمیں آزاد کر دو؟'' اس نے کہا۔

''جی جی چوہدری صاحب! میں ابھی آپ کو آزاد کرنے کے لئے ہی آیا ہوں۔ ہمیں پیسے مل گئے ہیں، اب آپ کو ادھر باندھ کر ہمیں کیا ملے گا'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی پھیکا سا مسکرانے لگے۔

''بیٹا! جو بھی کام کرنا چاہو سوچ سمجھ کر کرنا۔ مجھ بہر حال تمہاری فکر رہے گی۔'' انہوں نے کہا۔

''جی چوہدری صاحب! میں آپ کے مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔ ابھی آپ کو چھوڑنے سے پہلے

ایک مشورہ ضرور دوں گا۔۔۔'' میں نے اپنی بات میں وقفہ دیا تو وہ میری طرف دیکھنے لگے۔

''چوہدری صاحب! یہاں سے چھوٹتے ہی آپ سب سے پہلے پولیس کو اپنے اغوا کی ساری کہانی سچ سچ بتا دینا، ایک پریس کانفرنس کرنا اور سوئس اکاؤنٹ میں دو ارب ڈالر کا اعتراف اور ایک ارب ڈالر کے تاوان کا سپیشل ذکر کرنا۔ بیرون ملک اکاؤنٹ رکھنا جرم نہیں ہے، اگر قانونی طریقے سے پیسہ کمایا گیا ہو۔ آپ میڈیا کے اوپر معافی مانگیں گے اور بقایا سوا ارب روپیہ واپس پاکستان میں لے آئیں گے تو آپ کو تھوڑا جرمانہ ضرور ہوگا لیکن سزا نہیں ہوگی۔ اس طرح آپ ایک بڑے طوفان سے بچ جائیں گے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کونسا طوفان؟ کونسی پرابلم؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھا ہوں۔'' انہوں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''یہ جو ایک ارب ڈالر آپ سے لئے ہیں، یہ بہت بڑی رقم ہے اور اس سے ہونے والا دھماکا بھی بہت بڑا ہوگا۔ سوئس حکومت جتنا بھی خفیہ رکھنے کی کوشش کرے مگر دھماکے کے بعد خفیہ ایجنسی والے آپ کے اکاؤنٹ کو بھی پکڑ لیں گے اور آپ کے گھر تک بھی پہنچ جائیں گے۔ میں اسی طوفان کی بات کر رہا ہوں اور آپ کو طوفان کے آنے سے پہلے پہلے بندوبست کرنے کا کہہ رہا ہوں۔'' ان کے ہاتھ پاؤں پہلے ہی بندھے ہوئے تھے، میں نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور انہیں اٹھا کر باہر بند گاڑی میں ڈال دیا۔

اس وقت پورے لاہور شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ چوہدری شہباز پورے پاکستان کا سب سے بڑا آدمی تھا اور اس کا بیٹے سمیت اغوا ہو جانا پورے پاکستانی اور انٹرنیشنل میڈیا پر ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ پورے ملک کی سیکیورٹی ایجنسیاں چوہدری صاحب کو ڈھونڈنے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ شہر کے اندر گاڑیوں کو روک کر تلاشی لے رہی تھیں۔ پورے ملک کے فون کال ٹیپ ہو رہے تھے۔ ہم نے کسی بھی جگہ پر اپنا سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ ہمارا سارا پلان پہلے سے طے شدہ تھا اس لئے ہمیں ایک بھی فون کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ سیکیورٹی ایجنسیاں چوہدری صاحب کو تلاش کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ میں گاڑی کو شہر کی طرف لے جانے کی بجائے راوی کے کنارے کنارے ہی بھگاتا رہا اور تقریباً ایک گھنٹے کے بعد چوہدری کو شاہدرہ ہی کے علاقے میں اتار دیا۔

''چوہدری صاحب! آپ ہمارے ملک کا ایک قیمتی سرمایہ ہو۔۔۔ ہمارا پورا ملک ہی آپ کی عزت کرتا ہے اور آپ کے لئے دعائیں کرتا ہے۔ اس لئے آپ کو مشورہ دے رہے ہیں کہ میڈیا کے اوپر آ کر سب

کچھ بتا دینا! ورنہ بہت برے پھنس جاؤ گے۔ بندریا کے جب پاؤں جلتے ہیں تو وہ اپنے بچوں کو پیروں کے نیچے رکھ لیتی ہے۔ ہم لوگ بھی ایسی ہی بندریاں ہیں۔ دھماکے سے جب پاؤں جلیں گے تو سب سے پہلے قربانی آپ کی دی جائے گی۔ اس لئے میرا مشورہ مان کر اقدام کر لینا، کسی دوست کے کہنے پر آ کر غلطی مت کر دینا۔'' میں نے ان کے پاؤں کی رسی کھول دی، ہاتھوں کی رسیاں البتہ رہنے دی تھیں۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

ہم وہاں سے نکل جاتے تو وہ ایک دوسرے کی مدد سے اپنی رسیاں کھول سکتے تھے اور پھر پٹیاں بھی کھول سکتے تھے۔ میں نے ان کو گاڑی سے نیچے اتارا اور کچے راستے پر گاڑی بھگا لے گیا۔ ہم نے گاڑی کو ایک ویرانے میں لے جا کر پیٹرول چھڑک کر آگ لگائی اور واپس اپنے گھر آ گئے۔ اسد نے پہلے ہی ٹرین کی ٹکٹیں بک کر رکھی تھیں۔ ہم اسی دن علیحدہ علیحدہ ٹرینوں کی مدد سے لاہور سے راولپنڈی چلے گئے۔ یہاں پر ہم نے دو کمرے علیحدہ علیحدہ کرائے پر لے کر رکھے ہوئے تھے۔ مالک مکان کو ہم نے اپنے بارے سٹوڈنٹ کا بتایا ہوا تھا۔ چونکہ ہمارے پاس یونیورسٹی کے کاغذات بھی تھے اس لئے مالک مکان کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ایک مہینے تک ہم اسی شہر میں رہے۔

چوہدری صاحب نے میری بات مان لی تھی۔ اس نے اسی دن پولیس تھانے میں رپورٹ بھی کروا دی تھی اور شام کو ایک پریس کانفرنس کر کے سوئس اکاؤنٹ اور تاوان کی مد میں ایک ارب ڈالر کی رقم ادا کرنے کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں میڈیا پر آ کر بتا دیا تھا کہ لڑکے کچھ بڑا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لئے اس نے سیکورٹی ایجنسی والوں کو بھی باخبر کر دیا تھا کہ ان لوگوں کو ہر حالت میں تلاش کریں، اس سے پہلے کہ وہ کوئی بڑا نقصان پہنچا دیں۔ پولیس اور خفیہ ایجنسی والے اب ہمیں پکڑنے کے لئے جگہ جگہ چھاپے مار رہے تھے۔ جبکہ ہم ان سے دور اسلام آباد میں بیٹھے یہاں کے سرد موسم کو انجوائے کر رہے تھے۔

ایک مہینے تک ہم نے اپنا سارا کاغذی کام مکمل کر لیا۔ ہم تھوڑے تھوڑے پیسے پنڈی اور حوالے کے ذریعے پاکستان میں منگوا چکے تھے۔ ہم نے مانسہرہ کے قریب ایک پہاڑی کے دامن میں گھر بھی لے لیا تھا۔ یہ بہت بڑا بنگلہ تھا۔ بنگلے میں میں نے ڈالر، یورو، پاکستانی کرنسی اور سونے کی صورت میں ایک بہت بڑا ذخیرہ زمین کھود کر دفن کر دیا تھا۔ دوسرا بنگلہ ہم نے اسلام آباد کے مضافات میں ہی لیا تھا اور یہاں بھی ایسے ہی دولت پڑی ہوئی تھی۔ آدھا پیسہ ہم پاکستان کے اندر لے آئے تھے جبکہ باقی رقم ادھر ہی پڑی ہوئی تھی۔ یہ رقم

مشن میں استعمال ہونی تھی۔ ہم نے سارے ایجنٹوں اور سہولت کاروں کو ادائیگی ادھر سے ہی کرنی تھی۔ وہ ساری رقم مشن سے پہلے پہلے استعمال ہونی تھی۔ صدر کے اغوا ہو کر پاکستان پہنچتے ہی ہم وہ اکاؤنٹ ویسے ہی چھوڑ دیتے اور اکبر اور راشد کے کاغذات بھی جلا دینے تھے۔ پاکستان میں سارا خرچہ پھر اسی رقم سے ہونا تھا جو ہم پاکستان میں لے آئے تھے۔ ہم ساری رقم بائی ہینڈ (By Hand) استعمال کرتے، اس طرح کوئی بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ہم اپنی طرف سے ساری تیاری مکمل کر چکے تھے جب اچانک امریکی صدر نے افغانستان جانے کا اعلان کر دیا۔ باراک اوباما نے جاتے جاتے یہ عندیہ دیا تھا کہ وہ افغانستان سے امریکی فوجوں کو نکال کر لے جائیں گے۔ انہوں نے اپنے دوسرے حکومتی دور میں ایسے بے شمار بیانات دیئے تھے۔ افغانستان کے اندر امریکی جنگ کو دس سال سے زائد کا عرصہ ہو گیا تھا اور اس جنگ میں امریکہ کو کافی جانی اور مالی نقصان بھی ہوا تھا۔ صدر باراک اوباما اس جنگ سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے لیکن چونکہ امریکن کانگرس اس کے حق میں نہیں تھی اس لئے وہ صرف بیانات ہی دیتے رہے۔ انہوں نے افغانستان سے آرمی کم ضرور کی تھی۔

باراک اوباما صدر بش کے مقابلے میں بہت نرم دل انسان تھے۔ انہوں نے افغان جنگ میں زیادہ سخت فیصلے نہیں کیئے اور افغان طالبان ایک بار پھر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے لگے۔ طالبان نے طاقت پکڑنی شروع کی اور آہستہ آہستہ وہ اتنے طاقت ور ہو گئے کہ پورے شہروں پر ہی قبضہ کرنے لگے۔ ڈونلڈ ٹرمپ صدر منتخب ہوئے تو انہوں نے افغانستان میں آرمی کو بڑھانا شروع کر دیا۔ وہ اس جنگ کو سرے سے ہی ختم کرنا چاہتے تھے۔ یہ پچھلے دونوں صدور سے زیادہ دلیر اور بہادر شخص تھے۔ امریکی تاریخ کے یہ پہلے صدر تھے جو کسی بھی قسم کے بیان دینے سے ڈرتے نہیں تھے۔ یہ اندر اور باہر دونوں طرف سے ایک جیسے تھے۔ انہیں سیاست کے اسرار و رموز نہیں آتے تھے۔ یہ دوسرے سیاست دانوں کی طرح بات کو دل میں نہیں رکھتے تھے بلکہ جو بھی دل میں ہوتا کہہ دیتے تھے۔ افغانستان میں طالبان نے سر اٹھانا شروع کیا تو انہوں نے آرمی بڑھانا شروع کر دی۔ اسٹرائیک اور ڈرون حملوں میں تیزی آ گئی ۔ امریکی عوام نے تھوڑا احتجاج کیا تو انہوں نے افغانستان کا دورہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ بہت بڑا اعلان تھا۔ انہیں صدر بنے ہوئے ابھی پہلا ہی سال چل رہا تھا اور وہ تازہ تازہ سعودی عرب کا ایک دورہ کر کے آئے تھے۔ افغانستان کے دورے کا اعلان ایک دھماکا ہی ثابت ہوا اور پوری دنیا کا میڈیا اس دورے کی بریکنگ نیوز چلانے لگا۔

''اسد بھائی! کیا ارادہ ہے؟ ہم تو ان کو لینے کے لئے امریکہ جانا چاہتے تھے اور وہ خود ہی ہمارے پاس چل کر آرہے ہیں۔ کیوں نہ ہم ادھر ہی ٹرائی کریں؟'' میں نے ٹی وی کی آواز آہستہ کرتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں اس وقت راولپنڈی میں موجود تھے۔

''یار! دیکھ لو، آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہو۔ اگر آپ کو لگتا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں جرمنی کے ویزے کینسل کروا دیتا ہوں۔'' اس کی ایجنٹ سے بات ہوگئی تھی اور وہ ہمیں جرمن پاسپورٹ پر جرمنی لے کر جا رہا تھا۔

جرمن پاسپورٹ دنیا کا پہلے نمبر پر پاسپورٹ ہے جس پر بغیر ویزے کے دنیا کے 176 ممالک میں جایا جاسکتا ہے۔ باقی سارے یورپ پہنچ گئے تھے۔ ان میں دو تو ایک مہینہ پہلے ہی اٹلی چلے گئے تھے جبکہ باقی تین میں سے ایک سپین میں تھا اور دو ڈنمارک چلے گئے۔ یہاں پاکستان میں صرف اسد اور میں تھے اور ہماری بھی ایجنٹ سے بات ہوگئی تھی۔ جرمنی سے دو لوگ پاکستان آتے اور پھر ہم ان سے پاسپورٹ لے کر واپس ان کی جگہ جرمنی چلے جاتے۔ پاکستان میں داخل ہوتے ہی ائیر پورٹ پر ان آؤٹ کی مہر لگتی ہے۔ چونکہ اس پاسپورٹ پر پاکستان کی انٹری کی مہر لگی ہوتی ہے اس لئے واپس جانا کوئی پرابلم نہیں ہوتی۔

''کیا کہتے ہو علی بھائی۔۔۔ میں پھر جرمنی کا پروگرام کینسل کروا دوں؟ اس نے دوبارہ مجھ سے پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں یار! ابھی رہنے دو، مجھے دیکھنے دو کہ کیا کرنا ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''جی جی! آپ اچھی طرح سوچ لو۔ ٹرمپ اگر افغانستان آرہے ہیں تو یہاں کی سیکورٹی بہت سخت ہو گی۔ امریکہ میں اتنی سیکورٹی نہیں ہوتی ہے کیونکہ وہ دنیا کے ایک کونے میں بالکل الگ تھلگ پرامن ملک ہے۔ اس لئے ادھر سب کچھ نارمل ملے گا۔ جبکہ افغانستان میں تو بالکل جنگی ماحول ہوگا۔ ادھر کامیابی کے امکانات صفر سے بھی نیچے ہوں گے۔'' اس نے بتایا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہو، یہ جنگی علاقہ ہے اور یہاں کی سیکورٹی بھی انتہائی سخت ہو گی۔ افغانستان سے صدر صاحب کو اغواہ کرنا بہت کٹھن ہوگا اور پھر افغانستان سے پاکستان لانا اس سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔ ہمیں طالبان اور آرمی دونوں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ آرمی بھی ایک نہیں بلکہ دو دو آرمی ہوں گی۔ ایک نیٹو کی آرمی جو افغانستان کے اندر ہوگی اور دوسری پاکستان آرمی۔۔۔'' اس نے میری بات کو درمیان

سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''جی! آپ صحیح کہتے ہو، میں اسی لئے تھوڑا سوچنا چاہتا ہوں۔تم مجھے اس دورے کی تفصیل بتا سکتے ہو کہ وہ کونسی جگہ پر آئیں گے اور پھر وہاں سے آگے کونسے ملک جا رہے ہیں؟ کیا وہ پاکستان تو نہیں آ رہے؟ اگر ادھر آ جاتے ہیں تو بھی ہم ایک کوشش کر سکتے ہیں۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں ایک دو دن تک معلومات لے کر بتاتا ہوں، ابھی تو انہوں نے صرف اعلان کیا ہے۔ایک دو دن تک ان کا پورا شیڈول آ جائے گا تو پھر میں آپ کو پوری تفصیل بتا سکتا ہوں۔'' اسد نے کہا تو میں نے ہلکا سا سر کو ہلایا اور دوبارہ ٹی وی کی آواز اونچی کر دی۔

جہاں ابھی بھی امریکی صدر کے افغانستان دوسرے کی نیوز ہی چل رہی تھی۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے نیوز کاسٹر مجھے ہی سب کچھ بتا رہی ہو، جیسے وہ میرا نام لے کر مجھے کہہ رہی ہو کہ ''علی! امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ افغانستان آ رہا ہے۔تمارے پاس آ رہا ہے، وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔اُٹھو اور اس سے ملنے کی تیاری کرو۔'' نیوز کاسٹر کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی اور آخر اتنی تیز ہوگئی کہ اس کی آواز میرے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ میں نے جلدی سے ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور اسے بند کر دیا۔ٹی وی بند ہو چکا تھا۔اس کی آواز بند ہو چکی تھی لیکن پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے نیوز کاسٹر میرے دماغ کے اندر آ کر بیٹھ گئی ہو۔ میں وہاں سے اٹھا، واش روم میں گھس گیا اور فوارا کھول کر ٹھنڈے پانی کو اپنے جسم پر گرانے لگا۔

اگلے ایک ہفتے تک ٹرمپ کے سارے دورے کی تفصیلات منظر عام پر آ گئیں اور میں نے جرمنی جانے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ وہ پہلے افغانستان کے بلگرام ائیر بیس (کابل) پر اتر رہے تھے۔ یہاں نیٹو آرمی کا سب سے بڑا اڈا ہے۔نیٹو آرمی ہیڈ کواٹر بھی یہیں ہے۔نیٹو افواج کا کمانڈر ان چیف جنرل مائیک تھا۔ یہ اٹالین ہے اور اٹلی کے شہر میلان کا (MILLAN) کا رہنے والا ہے۔میلان اٹلی کے دارالحکومت روم (Rom) کے بعد دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ شہر آسٹریا، سوئیزرلینڈ اور فرانس تینوں ملکوں کے نزدیک لگتا ہے۔ میلان سے سوئیزرلینڈ آدھے گھنٹے جب کہ آسٹریا اور فرانس ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر ہیں۔ یہ اٹالین دارالحکومت روم سے 570 کلومیٹر دور ہے۔جبکہ وینس (Venus) شہر سے 270 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

روم کے اندر دنیا کا سب سے چھوٹا اور عیسائیوں کا مقدس ترین ملک ویٹی کن سٹی ہے۔ جہاں عیسائیوں کے روحانی پیشوا سربراہ ہوتے ہیں۔ وینس دنیا کا حسین ترین شہر ہے جو کہ مکمل طور پر پانی میں بنا ہوا ہے۔

وینس شہر میں سڑکوں کی بجائے نہریں بہتی ہیں۔ پورے شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے گاڑیوں کی بجائے کشتیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ یہاں پر ٹیکسیاں اور بسیں بھی کشتیوں پر مشتمل ہیں۔اس طلسماتی اور جادوئی شہر وینس میں سینکڑوں کی تعداد میں نہریں بہتی ہیں۔ گہرا نیلا سمندر اور اس کے اوپر نیلا آسمان اس شہر کو پریوں کے کسی دور دراز دیس کی مانند دکھاتا ہے اور دیکھنے والا شخص اس شہر کے حسن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اٹلی کے ویٹی کن سٹی کے علاوہ ایک اور بھی چھوٹا سا ملک ہے جس کا نام سان مرینو (San Marino) ہے۔اس کا رقبہ 61 مربع کلومیٹر ہے اور آبادی 35 ہزار کے قریب ہے۔میلان شہر اٹلی کے انتہائی شمال میں واقع ہے اور شمالی یورپ آسٹریا، سوئیزرلینڈ، جرمنی، ڈنمارک اور ناروے سے آنے والے سبھی سیاح پہلے میلان شہر میں ہی پہنچتے ہیں اور اس کے بعد ہی ان کے آگے کی منزل وینس (مشرقی اٹلی) روم (جنوبی اٹلی) یا پھر سسلی جزیرے (Sicily) ہوتے ہیں۔

نیٹو افواج کے سربراہ جنرل مائیک (Mike) میلان شہر کے تھے۔ان کا صرف ایک ہی بیٹا تھا جو کہ آٹھ سال کا تھا اور وہ میلان میں ہی اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔صدر ٹرمپ صرف ایک گھنٹہ ہی افغانستان میں گزارتے، انہوں نے بلگرام ائیربیس پر ہی آرمی سے ایک خطاب کرنا تھا۔افغان لیڈرشپ سے بلگرام ائیربیس پر ہی ملاقات کرتے اور آگے انڈیا روانہ ہو جاتے، ان کی اگلی منزل نیو دہلی تھی۔ جنرل مائیک بھی ان کے ساتھ دہلی جارہے تھے۔انہوں نے وہاں انڈین آرمی چیف سے ملاقات بھی کرنی تھی۔امریکی صدر ٹرمپ سابقہ صدر اوباما کی طرح پاکستان کے صرف اوپر سے ہی گزر جاتے تھے۔وہ پاکستان نہیں آرہے تھے۔میں اپنے ذہن میں مختلف منصوبے بنانے لگا۔

امریکہ کے اندر حالات بالکل ٹھیک تھے۔وہ علاقہ جنگ زدہ نہیں تھا لیکن پھر بھی دنیا کی واحد سپر پاور کا صدر تھا۔اس کی سیکورٹی اتنی بھی عام نہ ہوتی۔صدر کو اغوا کرنا تو دور کی بات ہم اس تک پہنچ بھی نہیں سکتے تھے۔حالات تو افغانستان میں بھی ٹھیک نہیں تھے۔وہ صرف ایک گھنٹے کے لئے آرہے تھے اور اس ایک گھنٹے کے دوران بھی وہ ائیربیس سے باہر ہی نہیں نکل رہے تھے۔ایسے حالات میں اس کو وہاں سے کیسے اغوا کر کے لایا جاسکتا تھا۔میں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا۔

”علی بھائی! ہم افغانستان کی بجائے انڈیا میں کیوں ٹرائی نہیں کرتے؟ انڈیا میں تو وہ ایک دن پورا

گزار رہا ہے۔ دن کو وہ وزیر اعظم اور صدر سے ملاقات کرے گا اور رات کو دہلی ہی کے ایک ہوٹل میں قیام کرے گا۔ دوسرے دن انڈین پارلیمنٹ سے خطاب کے بعد آگے جاپان چلا جائے گا۔ ہمارے پاس ایک پورا دن اور رات ہوگی۔ ہم افغانستان کی بجائے انڈیا پر فوکس کرتے ہیں، وہاں ہمارا کام بن جائے گا۔'' اسد نے میرے پاس آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے یار! انڈیا ہمارے لئے تھوڑا آسان ٹارگٹ ہوگا۔ ہم انڈیا سے اسے اغوا کر سکتے ہیں لیکن بہرحال انڈیا سے پاکستان بارڈر کراس کروانا بہت مشکل ہوگا۔ انڈیا پاکستان بارڈر پر تو چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تو اسے ہم کس طریقے سے پاکستان لے کر آئیں گے؟'' میں ایک بار پھر سوچنے لگا۔

''بھائی! ہم سیدھا پاکستان لانے کی بجائے نیپال (Nipal) کی طرف لے جائیں گے اور پھر نیپال سے اسے پاکستان لے آئیں گے۔ یا پھر سمندر کے راستے بھی تو ہم اسے اس طرف لا سکتے ہیں؟'' اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! یہ بہت مشکل ہے، ہمیں اتنا موقع نہیں ملے گا۔ اغوا کے فوراً بعد دو تین گھنٹوں تک ہم انڈیا سے باہر چلے جائیں تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے بعد پورا انڈیا ہی سیل ہو جائے گا۔ ہم کسی بھی حالت میں وہاں سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ دو تین گھنٹے تو ہمیں دہلی سے باہر نکلنے میں ہی لگ جائیں گے۔ یہ دلی بہت بڑا شہر ہے اور اس کی ٹریفک بھی بہت زیادہ ہے جو چوبیس گھنٹے چلتی رہتی ہے۔ را اور سی بی آئی (Raw & CBI) والے ہمیں دہلی سے باہر ہی نکلنے نہیں دیں گے اور اس سے پہلے ہی پکڑ لیں گے۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی بھائی! کوشش تو کرتے ہیں۔۔۔ افغانستان کے مقابلے میں تو یہ زیادہ اچھا چانس ہے۔ افغانستان میں تو وہ صرف ایک گھنٹہ ہی رکیں گے اور وہ بھی ائیر بیس کے اندر۔۔۔ وہاں پر تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے انڈیا ہی ہمارے لئے بہتر آپشن ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں اسد! انڈیا بہتر آپشن نہیں ہے۔ اگر ہم سب کچھ مکمل بھی کر گئے تو پھر بھی پاکستان کے اندر سفر کرنا مشکل ہو جائے گا۔ انڈیا سے اغوا کرنے کی صورت میں سب سے پہلے الزام پاکستان پر ہی آئے گا اور امریکہ پاکستان میں بھی سیکیورٹی ہائی الرٹ کر دے گا۔ ہم اگر کراچی یا لاہور تک پہنچ بھی جاتے ہیں تو آگے ملتان تک کبھی بھی نہیں لے جا سکتے۔ جبکہ کراچی اور لاہور میں صدر صاحب کو رکھنا ناممکن ہے، یہ بالکل ناممکن

ہے۔ہمیں ایک ایک قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔افغانستان ہی ہمارے لئے سب سے بہترین آپشن ہے۔میں دیکھتا ہوں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔افغانستان کے اندر تم تھوڑی مزید تفصیلات اکٹھی کرو!'' میں نے اس سے کہا اور اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔میں اپنے اور اس کے لئے چائے بنانے لگا تھا۔

اس نے بھی ایک بار پھر کمپیوٹر کھولا اور دوبارہ مختلف لوگوں سے معلومات اکٹھی کرنے لگا۔وہ انٹرنیٹ سے بھی معلومات اکٹھی کرتا تھا اور اس کے رابطے کچھ ایجنسیوں سے بھی ہو گئے تھے۔ہم پیسے دے کر معلومات اکٹھی کر رہے تھے۔ایک ارب ڈالر بہت زیادہ رقم تھی اور ہمیں اس کے ختم ہونے کا بھی کوئی ڈر نہیں تھا۔اس لئے بلا دریغ رقم خرچ کر کے معلومات بھی اکٹھی کر رہے تھے اور اپنے مقصد کیلئے لوگ بھی اکٹھے کر رہے تھے۔ہمارے پاس تقریباً سو کے قریب لوگ اکٹھے ہو گئے تھے جو ہمارے ایک اشارے پر اپنی جان بھی دینے پر تیار تھے۔ہمارے اس گروپ میں اصل لوگ صرف چھ ہی تھے اور یہ چھ لوگ ہی ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ بلکہ پانچ لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میرے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔100 لڑکوں کو اٹلی سے راشد کنٹرول کر رہا تھا۔وہی ان کو پیسہ بھی دے رہا تھا۔جبکہ میں اور اسد ان سب سے بالکل الگ تھے۔میں نے چائے تیار کی اور اسے لے کر دوبارہ کمرے میں آ گیا۔میں نے ایک کپ اسد کی طرف بڑھایا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گیا۔اسد ابھی تک کمپیوٹر پر ہی مصروف تھا۔

''اسد! یہ جنرل مائیک کو چیک کرنا، ہم اسے بلیک میل کر کے شاید کوئی کام نکال سکیں۔'' میں نے اسد سے کہا تو وہ جنرل مائیک کے متعلق سرچ کرنے لگا۔

اگلے دو دن تک اس نے پوری معلومات اکٹھی کر لیں اور ہمارا پلان بھی تیار ہو گیا۔صدر کو افغانستان آنے میں ابھی پانچ دن باقی تھے۔میں نے طلحہ کو جنرل مائیک کا گھیراؤ کرنے کا کہا۔طلحہ میلان چلا گیا اور اس نے ٹرمپ کے دورے سے دو دن پہلے مجھے او کے کی رپورٹ دے دی۔ہم اب بالکل تیار تھے اور امریکی صدر کے دورے کا انتظار کر رہے تھے۔میں اور اسد اسی دن شام کو وانا پہنچ گئے۔یہ شہر میرا دیکھا بھالا تھا۔میں نے وانا میں ایک سال گزارا تھا۔اسی علاقے میں میرا سارا گھر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ہم نے شام وانا میں ہی گزاری اور رات کو انگورا اڈے پر پہنچ گئے۔میں جان بوجھ کر اپنے گاؤں نہیں گیا تھا۔میرا ارادہ ایک بار اپنا گاؤں اور گھر دیکھنے کا تھا لیکن میں اس طرف نہیں جا سکا۔رات کو گاڑی میرے گاؤں کے بالکل قریب سے گزری تھی۔میں نے ایک نظر صرف گاؤں پر ڈالی تھی اور اگلے ہی لمحے گاڑی گاؤں کو کراس کر کے

آگے بڑھ گئی تھی۔

گاؤں آج بھی ویسے ہی آباد تھا۔ یہاں اس گاؤں کے 100 سے زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔اس دن پورا گاؤں ہی خون سے سرخ ہوگیا تھا۔آج اس گاؤں کو دیکھا یہ پھر سے آباد ہو گیا تھا۔بجلی کی ایک لائین سڑک سے گزرتی تھی۔ یہ وانا سے نکلتی تھی اور آگے انگورا اڈے تک جاتی تھی۔آرمی نے راستے میں آنے والے سبھی گاؤں کو بجلی دی ہوئی تھی۔ یہ بالکل فری بجلی تھی۔ان دیہاتوں میں کوئی بھی بجلی کا بل نہیں دیتا تھا۔ گورنمنٹ اور آرمی والے کوئی سختی نہیں کرتے تھے۔آرمی والے ان قبائلی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کی کوشش کرتے تھے، یہاں کوئی ٹیکس نہیں تھا۔سمگلنگ کا سامان وانا میں بکتا تھا لیکن آرمی اس کو نہیں روکتی تھی۔آرمی والے ان قبائیلیوں کے دل جیتنے کے لئے سب کچھ کرتے تھے۔

میرا یہ گاؤں بھی اس وقت روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔گاؤں کے تقریباً ہر گھر میں ہی روشنی ہو رہی تھی۔ میرا گھر سڑک سے دور گاؤں کی دوسری طرف پہاڑی کے دامن میں تھا۔گاڑی تھوڑا آگے بڑھی تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجھے وہاں بھی روشنی نظر آگئی۔شاید کسی قبائلی نے اس گھر پر قبضہ کر لیا تھا۔میرا گھر طالبان کے ساتھ ہونے والی لڑائی میں مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ طالبان اوپر پہاڑی پر قبضہ جمائے ہوئے تھے اور نیچے گاؤں والے ان کا مقابلہ کر رہے تھے۔اس ساری لڑائی کی وجہ میں بنا تھا۔طالبان میرے باپ کو پھانسی دے کر میری دونوں بہنوں کو لے جا رہے تھے۔ایک بہت بڑی لڑائی ہوئی تھی اور میں دو بہنوں میں سے صرف ایک کو ہی بچا سکا تھا۔ میں نے ایک بہن کو بچانے کے لئے اپنی ماں ایک بہن اور دو چھوٹے بھائیوں کو کھو دیا تھا۔اس لڑائی میں نصیر چاچا اور ان کا بیٹا جاسم بھی مارا گیا تھا۔

میں نے اس جنگ میں اپنا سب کچھ ہی کھو دیا تھا۔کبھی کبھی میرا دماغ مجھے ملامت کرنے لگتا تھا کہ میں نے شاید بہت گھاٹے کا سودا کیا تھا بلکہ ابو نے ہی گھاٹے کا سودا کیا تھا۔دو بہنیں جا رہی تھیں اور باقی سارے بچ رہے تھے۔ہم اگر چپ کر جاتے تو باقی سارے بچ جاتے، پوری دنیا میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ماں، باپ اپنے دل پر پتھر رکھ کر بیٹیوں کو ان جہادیوں (داعش + طالبان) کے حوالے کر دیتے تھے اور باقیوں کو بچا لیتے تھے۔لیکن شاید میرے والد ہی سمجھدار نہیں تھے جو پھانسی پر چڑھ گئے لیکن بیٹیوں کو جانے نہیں دیا۔ایک میں پاگل تھا، میں نے پورے گھر کو ہی مروا دیا لیکن کسی کو بھی لے جانے نہیں دیا۔دونوں طرف کے دو سو آدمی مارے گئے اور ہم دونوں بہنوں میں سے صرف ایک کو ہی بچا سکے۔

''چلو بھائی! ابھی آپ لوگوں کو ادھر ہی اترنا ہوگا، آگے پاکستان آرمی کی چیک پوسٹ ہے۔'' ڈرائیور نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ ہم گاڑی سے نیچے اترے تو اس نے گاڑی کی ڈگی سے ہمارے بیگ بھی نکال کر دے دیئے۔ میرے اور اسد کے علاوہ تین اور لڑکے بھی تھے۔ یہ لڑکے بھی ہمارے لئے کام کر رہے تھے۔

''آپ اس سامنے والی پہاڑی پر چڑھ جائیں اور دوسری طرف اتر جائیں۔ وہاں آپ کو میرے آدمی مل جائیں گے جو آپ کو دوسری طرف افغانستان پہنچا دیں گے۔'' اس نے ہمیں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم سب رات کے اندھیرے میں پہاڑی پر چڑھنے لگے۔

یہاں سے انگور اڈا صرف دو کلومیٹر دور تھا جہاں پاکستانی چوکی تھی۔ اس سے آگے افغانستان شروع ہو جاتا تھا۔ ہم بالکل سیدھے چوکی سے افغانستان نہیں جا سکتے تھے۔ میں نے وانا میں ایک طالب سے بات کی تھی اور وہ پانچ لوگوں کو سرحد کے دوسری طرف افغانستان لے جانے پر تیار ہو گیا تھا۔ پاکستان سے افغان مہاجر روزانہ واپس افغانستان جا رہے تھے۔ پاکستان سے افغانستان واپس جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا، صرف کچھ کاغذات بنتے ہیں۔ پاکستانی گورنمنٹ انگلیوں کے نشانات لیتی ہے اور پیسے دے کر ان کے لئے واپسی کا بندوبست کرتی ہے۔ دوسری طرف افغانی گورنمنٹ انہیں وصول کرتی ہے اور عارضی بنے ہوئے کیمپوں میں رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ لوگ افغانی علاقوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اور ہم ان کیمپوں کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتے تھے اور نہ ہی اپنی انگلیوں کے نشانات دینا چاہتے تھے۔ ان سب چیزوں کے علاوہ ہمیں طالبان کے کسی بڑے لیڈر سے بھی ملنا تھا۔ میں صدر کو اکیلا اغوا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ساتھ افغانستان میں دو سو سے اوپر لوگ تھے لیکن یہ سارے دو سو افراد مجھے صدر کی حفاظت کے لئے چاہیے تھے۔ میں صدر کو طالبان کی مدد سے اغوا کرنا چاہتا تھا اس لئے میں یہاں طالبان کے لیڈر سے ملنے آیا تھا۔ ہم طالبان کی مدد سے ہی باڈر کراس کر کے افغانستان پہنچتے اور واپسی بھی انہی طالبان کے ذریعے آتے۔ ہم پہاڑی کے سرے پر پہنچ کر دوسری طرف اتر گئے۔ دوسری طرف جنگل تھوڑا زیادہ گھنا تھا۔ ہمیں دوسری طرف اترتے ہی کچھ طالبان نے گھیر لیا۔

''کدھر جا رہے ہو اور آپ کو کس نے بھیجا ہے؟'' ایک قدرے چھوٹے قد کے نوجوان لڑکے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''ہمیں اول خان نے بھیجا ہے، وہ ہمیں وانا سے یہاں تک لے کر آیا تھا اور پھر وہ تو آگے چیک

پوسٹ کی طرف چلا گیا ہے جبکہ ہمیں اس نے اس طرف جانے کا کہا ہے۔'' میں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ سب نے بارڈر کی دوسری طرف جانا ہے؟'' اس نے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ہمیں لے کر جنگل میں آگے بڑھنے لگا۔

''آپ نے طالبان کے امیر کمانڈر وقاص سے بھی ملنا ہے؟'' ہمیں جنگل میں چلتے ہوئے قریباً آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔

''جی! میں افغان کمانڈر وقاص سے ملنے ہی جا رہا ہوں۔'' میں نے مختصراً جواب دیتے ہوئے کہا اور ہمارے درمیان ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

''نام کیا ہے آپ کا؟'' اس بار میں نے گفتگو میں پہل کرتے ہوئے کہا۔

''میرا نام وجاہت خان ہے۔ میں ہرات (Herat) سے ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''اوہ! تو آپ ہرات سے ہو، فارسی ہو؟'' میں نے مزید پوچھا۔

''جی! میں فارسی ہوں لیکن پشتو بھی اتنی ہی روانی سے بول سکتا ہوں۔'' اس نے چلتے چلتے جواب دیا۔

''شیعہ ہو یا سنی؟'' میں نے اگلہ سوال کیا۔ ہرات ترکمانستان اور ایران کے بارڈر پر افغانستان کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ پانچ لاکھ کی آبادی والے اس شہر کی زیادہ تر آبادی اہل تشیع افراد پر مشتمل ہے۔

''جی نہیں! میں سنی ہوں۔ آپ کو ہرات کا پتہ ہے؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

''ہاں! مجھے سارے افغانستان کا ہی پتہ ہے۔ افغانستان کی ساری تاریخ اور جغرافیائی معلومات مجھے ازبر یاد ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی ہمارا ملک بہت اچھا ہے۔ بہت عظیم اور بہادر ملک ہے لیکن پتہ نہیں کس کی نظر اس ملک کو لگ گئی ہے۔ یہ جنگ اور کافر فوجی ہمارے ملک کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہے ہیں۔'' اس نے اداس لہجے میں کہا تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے بڑے مشکل سے اپنی ہنسی کو کنٹرول کیا۔

ملک کے حالات تو تبھی ٹھیک ہوتے ہیں جب وہاں کے نوجوان ٹھیک ہوتے ہیں، جب نوجوان

حکومت کی رٹ کوتسلیم کرتے ہیں اور حکومت کے احکامات کو مانتے ہیں۔ اگر نوجوان ہی طالبان بنے ہوئے ہوں، اپنی ہی ماؤں بیٹیوں کو اغوا کر کے زبردستی ان کو لونڈیاں بنا کر گھر میں رکھ رہے ہوں تو ملک کو نظر تو واقعی لگ جانی چاہیے۔ افغانستان اگر جل رہا ہے تو یہ افغانیوں کی بہادری نہیں بلکہ بزدلی کی وجہ سے جل رہا ہے۔ یہ لوگ ظالم کا ہاتھ پکڑنے کی سکت ہی نہیں رکھتے۔ اسی لئے تو طالبان پورے کے پورے شہر پر قابض ہو جاتے ہیں۔ ٹی وی پر بڑے بڑے اینکر آ کر بولتے ہیں کہ یہ امریکی مفاد ہے، یورپی مفاد ہے یا پاکستانی مفاد ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ افغانستان کے اندر کسی کا مفاد نہیں ہے۔ پاکستان، امریکہ اور یورپ بھی افغانستان میں امن لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کو ایک بڑی جنگ سے بچانا چاہتے ہیں۔ دنیا کو تیسری ورلڈ وار سے بچانا چاہتے ہیں۔

ہم سب تقریباً تین گھنٹے کا مسلسل سفر کر کے بارڈر تک پہنچ گئے۔ یہاں آرمی نے تار لگادی تھی۔ یہ گول گچھے کی طرح کی تار تھی جو زمین سے تقریباً پانچ فٹ اونچی تھی۔ سمگلرز اور طالبان نے اس تار کو جگہ جگہ سے کاٹ کر راستے بنا لئے تھے۔ وجاہت خان نے ہمیں ایک جگہ سے بارڈر کی تار کراس کرائی اور ہم دوسری طرف افغانستان میں داخل ہو گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ مزید افغانستان کے اندر چلنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے کچے راستے پر پہنچ گئے۔ یہاں پر پہلے سے ہی اول خان ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں کار میں بٹھایا اور ہمیں لے کر غزنی (Ghazni) کی طرف روانہ ہو گیا۔

وانا سے غزنی 240 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ افغان بارڈر شکین (Shakin) سے یہ فاصلہ 182 کلومیٹر ہے۔ اول خان نے ہمیں شکین کے قریب سے رسیو کیا تھا اور دو گھنٹے میں اس نے ہمیں غزنی پہنچا دیا۔ ڈیڑھ لاکھ کی آبادی والے اس شہر پر اسلام سے پہلے بدھ مت اور ہندومت دونوں کی حکومت رہی ہے۔ اشوکا کی حکومت انڈیا سے شروع ہوتی ہے اور تقریباً پورے افغانستان پر پھیلی ہوئی ہے۔ غزنی موریا سلطنت کا ایک بڑا شہر ہے جو انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں سارا تباہ ہو گیا۔ میرا یہاں یہ تحریر لکھنے کا مقصد ان افغانیوں اور پاکستانیوں کو بتانا ہے، جو کہتے ہیں کہ افغانستان پر آج تک کسی نے بھی قبضہ نہیں کیا۔ میرے خیال میں تقریباً پورا پاکستان ہی یہ سمجھتا ہے کہ افغانستان کو آج تک کسی نے بھی فتح نہیں کیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ ہم آج تک غلط ہی سمجھتے آئے ہیں۔

افغانستان پر صرف انگریز ہی حکومت نہیں کر سکے۔ انگریزوں کے علاوہ یہاں پر ہر قوم نے حکومت کی

ہے۔انگریزوں کو شکست دینے اور افغان قوم کی بہادری کی مثالیں بھی ہمیں ہر طرف سے سننے کو ملیں گی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کو مہاراجہ رنجیت سنگھ (Ranjit Singh) نے روکے رکھا تھا۔ رنجیت سنگھ کی حکومت دریائے راوی کے کنارے سے شروع ہوتی تھی اور آگے افغانستان تک جاتی تھی۔ انگریز اپنے عروج کے زمانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ہی لڑتے رہے اور انہیں ایک بھی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انگریزوں کو اپنی پوری زندگی میں راوی کے دوسرے کنارے تک ہی محدود رکھا۔ وہ 1829ء میں فوت ہوئے اور ان کے مرنے کے دس سال بعد 1849ء تک سکھوں کی حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد انڈیا میں ہی برسر پیکار رہے۔انہیں برصغیر میں ہر طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ویسے بھی انگریزوں کا عروج کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ امریکہ انگلینڈ کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ یورپ کے دوسرے ممالک بھی انگلینڈ سے مقابلہ کر رہے تھے۔ افریقہ اور یورپ کے اندر اقتدار حاصل کرنے کے لئے پورا یورپ آپس میں لڑ رہا تھا۔ انگلینڈ کو کئی کئی محاذوں پر لڑنا پڑتا تھا اس لئے اس کی افغانستان میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔انگریزوں کے علاوہ یہاں سب کی حکومت رہی ہے۔

اشوکا کی موریہ سلطنت پورے افغانستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں ہندوں اور بدھوں نے بھی حکومت کی ہے۔سکندر بھی افغانستان سے ہو کر گیا ہے۔چنگیز خان نے منگولیا سے نکل کر سب سے پہلے افغانستان کو فتح کیا ہے۔ایرانیوں نے بھی اس ملک پر اپنی حکومت بنائی ہے۔مغلوں کے جدامجد باہر کی سلطنت کابل شہر تک تھی۔ باہر کے دور میں انڈیا کابل تک پھیلا ہوا تھا۔مغل بادشاہ اکبر اعظم کی حکومت بھی کابل تک پھیلی ہوئی تھی۔سکھ مذہب دنیا کا سب سے نیا اور چھوٹا مذہب ہے۔اس مذہب کے ماننے والے پیروکاروں کی تعداد اڑھائی کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اس قوم نے اپنی پوری تاریخ میں صرف ایک بار (تقریباً چالیس سال) حکومت کی ہے۔ اور وہ حکومت انہی افغانیوں کے اوپر کی ہے جو کہتے ہیں ہم پر آج تک کسی نے حکومت نہیں کی۔آپ کو آج بھی پاکستان کے قبائلی علاقہ جات (Fata) میں سکھ ملیں گے۔ یہ وہی سکھ ہیں جو رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں یہاں رہتے تھے۔

ہمارا ڈرائیور اول خان ہمیں غزنی کے مضافات میں بنے ہوئے ایک بہت بڑے احاطے میں لے کر آ گیا۔ پورا احاطہ ہی مٹی اور پتھر سے بنا ہوا تھا۔ یہ جگہ کم از کم بھی دو کنال (32 مرلہ) پر مشتمل تھی۔ باہر سے یہ ایک عام سی عمارت لگتی تھی لیکن اندر داخل ہوتے ہی ہم اس عمارت کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔عمارت میں جنریٹر

کی مدد سے بجلی دی ہوئی تھی۔عمارت کے اندر تقریباً تیس کے قریب مسلح افراد گھوم پھر رہے تھے۔ چونکہ ہماری پاکستان سے ہی کمانڈر وقاص سے بات ہوگئی تھی اور اسی نے ہمیں ملاقات کے لئے بلوایا تھا۔ اس لئے عمارت کے گیٹ پر میں نے اپنا نام بتایا تو وہ ہمیں لے کر اندر آ گئے۔

یہاں پر انہوں نے سب سے پہلے ہماری تلاش لی اور ہمارا سارا سامان اور اسلحہ باہر ہی رکھوا کر ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ میں اور اسد تو کمانڈر وقاص سے ملنے کے لئے ایک پہریدار کے ساتھ ہو لیے جبکہ ہمارے باقی تین ساتھی ادھر ہی رک گئے۔کمانڈر وقاص ایک ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔سامنے کمرے کی دیوار پر ٹی وی لگا ہوا تھا جس پر ایک انڈین فلم چل رہی تھی۔ کمرے میں اس کے علاوہ مزید تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سب کی ہی آدھے آدھے فٹ کی داڑھیاں تھیں اور سروں پر بڑے پگڑ پہنے ہوئے تھے۔

داڑھی چہرے کو روحانیت دیتی ہے لیکن یہاں کسی کے بھی چہرے پر روحانیت نہیں تھی۔ سبھی طالبان تھے اور ان کا روحانیت سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں کمپیوٹر پیٹ کا میہ، چار پانچ سیٹلائٹ فون (آئی فون) اور ایک وائرلیس سیٹ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر سے ہی پورے کمرے کا جائزہ لے لیا۔

''اسلام علیکم!'' میں اونچی آواز میں سلام کیا تو وہ سارے ہی میری طرف متوجہ ہو گئے۔

''وعلیکم السلام! مراد شاہ صاحب آیئے آیئے۔۔۔بیٹھیں۔'' کمانڈر وقاص اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کے ساتھ باقی بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''نہیں کمانڈر صاحب! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں کھڑے ہونے کی۔۔۔۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔'' میں نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں! شاہ جی آپ سید ہو اور سید خاندان کے استقبال کے لئے کھڑا ہونا فخر کی بات ہے۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے اپنا غلط نام بتایا تھا اور نام کے ساتھ سید بھی لگا دیا تھا۔ یہ میں نے جان بوجھ کر لگایا تھا تا کہ وہ میری بات کو سنیں اور میری عزت بھی کریں۔ یہ سارے طالبان اسلام کے نام کو ہی استعمال کر کے اپنی جان دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ نبیؐ کی آل جو کہ سیّد کہلاتی ہے۔ یہ لوگ اس آل کی بھی عزت کرتے ہیں اور

انہیں دوسروں سے ممتاز رکھتے ہیں۔ انسانی جان کی قیمت ان کے نزدیک ایک چیونٹی کے برابر بھی نہیں ہوتی البتہ سید کو یہ اتنی جلدی تکلیف نہیں دیتے۔ مجھے ان سے کام تھا اور اسی لئے میں نے جھوٹ بولا تھا تا کہ وہ میرا کام بھی کر دیں اور مجھے اپنی جان کا بھی کوئی خطرہ نہ ہو۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس نے ہمارے ساتھ آنے والے پہریدار کو ہمارے لئے قہوہ لانے کا کہا تو وہ پہریدار سر جھکا کر واپس چلا گیا۔

''جی! تو شاہ جی، اب بتاؤ کہ آپ کو ہم سے کیا کام ہے؟'' پہریدار باہر چلا گیا تو کمانڈر مجھ سے پوچھنے لگا۔

''کمانڈر صاحب! کام بہت اہم اور راز داری کا ہے، اس کے لئے مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہوگی۔ معذرت کے ساتھ۔۔۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو؟'' میں نے اس سے کہا۔

''شاہ جی! یہ بھی ہمارے ہی آدمی ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیاں کچھ بھی راز نہیں ہے۔ آپ کھل کر بات کرو!'' اس نے مجھے سب کے سامنے ہی بات کرنے کا کہا۔

''نہیں کمانڈر صاحب! آپ پہلے راز داری میں میری بات سن لیں، اس کے بعد بے شک ان کو بلا کر سب کچھ بتا دیں۔۔۔ وہ آپ کی مرضی ہے۔ میں صرف اکیلے میں ہی آپ سے بات کروں گا۔'' میں ان سب کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر! آپ کا آدمی بھی باہر جائے گا۔ ہم دونوں ہی ادھر بات کریں گے۔'' اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

''جی! کوئی بات نہیں، میں اکیلا ہی بات کروں گا۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تو اس نے سب کو باہر جانے کا کہہ دیا۔ اسد بھی اٹھ کر انہی لوگوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔

''جی شاہ جی! اب بولو کونسی راز داری کا کام ہے؟'' جب سب لوگ باہر چلے گئے تو اس نے مجھ سے کہا۔

''مجھے ایک حملہ کروانا ہے۔۔۔ ایک بہت بڑا حملہ، نیٹو کی افواج پر۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا! یہ راز داری کی بات ہے؟ یہ حملے تو ہم ہر روز ہی کرتے رہتے ہیں۔ افغانستان کی مکمل آزادی تک ہم ایسے ہی حملے کرتے رہیں گے۔ آپ کونسے خاص حملے کی بات کر رہے ہو؟'' اس نے نارمل لہجے میں

کہا۔اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کے کوئی تاثرات نہیں ابھرے تھے۔

''میں نیٹو کی فوج پر حملہ کروانا چاہتا ہوں۔ایک بہت بڑا حملہ۔۔۔جس میں ہیوی مشین گن، دستی بم اور راکٹ لانچر تک استعمال ہوں۔ مجھے کم ازکم آدھے گھنٹے تک کی مسلسل لڑائی چاہیے اوراس کے لئے میں قیمت بھی دینے کو تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ کا تعلق کس ایجنسی سے ہے؟'' اس بار اس نے ڈائریکٹ مجھ سے ایجنسی کا سوال کیا۔

''کمانڈر صاحب! ایجنسی کا نہیں پوچھتے، پیسے پوچھتے ہیں۔آپ کو صرف پیسے سے غرض ہونی چاہیے۔'' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔نیٹو کی فوج پر حملہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہےاوراس کے لئے پیسے بھی زیادہ ہوں گے۔'' وہ بھی مطلب کی بات پر آ گیا۔

''کمانڈر صاحب! مجھے صرف حملہ کروانا ہے، جانی نقصان سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ان کا بے شک ایک بھی فوجی نہ مرے لیکن مجھے صرف آدھے گھنٹے سے زیادہ کی لڑائی چاہیے۔میں لڑائی کے ہی پیسے دوں گا، آپ ان کے فوجی مارتے ہو یا نہیں مارتے میں اس کے متعلق کوئی سوال نہیں کروں گا۔'' میں نے تفصیلاً بتاتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں آپ حکومتی ایجنسی سے ہو؟ ہم آپ کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔'' اس نے انکار کر دیا۔

''نہیں کمانڈر صاحب! میرا تعلق حکومتی ایجنسی سے نہیں ہے بلکہ میں صرف ان امریکیوں پر اپنی دھاک بٹھانا چاہتا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''نہیں شاہ جی! ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔'' اس نے ایک بار پھر انکار کر دیا۔

''دیکھو کمانڈر صاحب! میں اس کام کے منہ مانگے پیسے دے رہا ہوں۔کام بھی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اسلحہ اور بارود افغانستان میں کوڑیوں کے مول ملتا ہے اور جہاد کے نام پر جان دینے والے نوجوان بھی یہاں بہت مل جاتے ہیں۔آپ کا اس پورے علاقے پر کنٹرول ہے۔آپ یہاں کے بڑے طالبان کمانڈر ہیں اس لئے میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، حملہ کب اور کہاں کرنا ہے؟'' اس بار اس نے نیم رضامند لہجے میں کہا۔

''حملہ بلگرام ائیر بیس پر موجود ملٹری کیمپ پر کرنا ہے۔ امریکی صدر کابل میں آ رہا ہے، وہ ایک گھنٹہ افغانستان میں آئے گا اور پھر آگے انڈیا کی طرف چلا جائے گا۔ وہ بلگرام ائیر بیس سے انڈیا کے لئے روانہ ہوگا۔ مجھے اس کے جہاز ائیر فورس ون کے اڑنے کے ٹھیک دس منٹ بعد وہاں حملہ کروانا ہے۔'' میں نے پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''امریکی صدر کے جانے کے بعد کیوں؟ آپ امریکی صدر کی موجودگی میں بھی حملہ کروا سکتے ہیں۔'' اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

''نہیں کمانڈر صاحب! امریکی صدر کی موجودگی میں ہائی سیکورٹی ہوگی، اس وقت اگر آپ حملہ کرو گے تو وہ ناکام ہو جائے گا۔ مجھے صرف افغانستان کے اندر طالبان کی طاقت دکھانی ہے۔ امریکی صدر کے جانے کے فوراً بعد وہاں حملہ ہوگا تو پوری دنیا کا میڈیا یہی طالبان کی خبر نشر کر رہا ہوگا۔ اس کے بعد کوئی بھی امریکی صدر افغانستان کے اندر آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔'' میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

''واقعی! بہت زبردست پلان ہے۔ اس سے پوری دنیا طالبان کی طاقت جان جائے گی۔'' وہ میری باتوں کے جال میں پھنس گیا تھا۔

''میں یہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں، اب رقم کی بات کر لیں؟'' اس نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ بولو کتنی رقم لو گے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''مجھے پچاس لاکھ ڈالر چاہئیں اس کام کے لئے۔۔۔'' اس نے بہت بڑی رقم مانگتے ہوئے کہا۔

''اس لڑائی میں کتنے آدمی ہوں گے اور کونسا اسلحہ استعمال ہوگا؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''بیس آدمی ہوں گے اور اسلحے میں سب کچھ ہی ہوگا۔ اسلحے کے دو ٹرک ان کے ساتھ ہوں گے اور بیس کے بیس لوگوں کے پاس ہی راکٹ لانچر ہوں گے۔ ٹرک میں دو سو کے قریب راکٹ ہوں گے اور سارے ہی فائر ہوں گے۔'' اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔۔۔ لیکن مجھے اس حملے کے لئے پچاس آدمی چاہئیں اور کم از کم دس گاڑیاں بارود سے بھری ہوئی ہوں جو اس حملے میں حصہ لیں۔'' میں نے اس سے کہا تو اس نے حامی بھر لی۔

''آپ میرے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروا دیں۔'' اس نے کہا۔

''میں پہلے صرف پانچ لاکھ ڈالر خرچ کے لئے دوں گا۔ جب آپ اپنے آدمی لے کر بلگرام ائیر بیس کے

گرد گھیرا ڈال لیں گے تو اس وقت مزید پانچ لاکھ ڈالر دوں گا۔اس کے بعد ہر دس منٹ کے دس لاکھ ڈالر دوں گا۔آپ کو پچاس لاکھ ڈالر کے لئے کم از کم چالیس منٹ تک لڑنا ہوگا۔لڑائی ختم ہونے کے صرف آدھے گھنٹے کے اندر اندر ساری رقم آپ کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے گی۔'' میں نے اسے رقم کی منتقلی کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''نہیں! آپ کو آدھی رقم ایڈوانس دینی ہوگی اور باقی رقم کام ہونے کے بعد۔۔'' اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں کمانڈر صاحب! میں پیسے اسی حساب سے دوں گا۔ پہلے صرف پانچ لاکھ ڈالر دوں گا اور باقی رقم اسی طریقے سے دوں گا۔قہوہ آ گیا تھا، میں نے قہوے کی پیالی اٹھالی اور قہوہ پینے لگا۔

''مجھے اپنے باقی دوستوں سے بات کرنی ہوگی۔'' وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا اور پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اس کے باہر جاتے ہی اسد اور دوسرے تین لڑکے اندر آ گئے۔ ہم سب تقریباً ایک گھنٹے تک ادھر ہی بیٹھے رہے۔آخر ایک گھنٹے بعد کمانڈر یوسف اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی اندر داخل ہوا۔اس آدمی کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔

''شاہ جی! کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟'' اس آدمی نے اندر آتے ہی مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''اسد! تم ان لڑکوں کے ساتھ باہر چلے جاؤ۔'' میں نے اسد کو کہا تو وہ باہر چلا گیا۔

''آپ ان کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتے ہیں؟'' نئے کمانڈر نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی کمانڈر صاحب! یہ بہت خفیہ فیصلے ہوتے ہیں، آپ کو ابھی ان باتوں کی سمجھ نہیں آ سکتی۔'' میں ان لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے، وہ آپ کا اپنا معاملہ ہے۔۔۔ بہر حال! ہمیں آپ کی آفر قبول نہیں ہے۔ہمیں آدھے پیسے پہلے چاہئیں۔'' وہ ابھی تک آدھے پیسے پہلے لینے پر تلا ہوا تھا۔

''نہیں کمانڈر صاحب! یہ ممکن نہیں ہے۔ہم پچاس لاکھ ڈالر کی ادائیگی کر رہے ہیں اور اس کے لئے آپ کو میری شرائط پر چلنا ہوگا۔آپ کا ٹوٹل خرچہ ایک لاکھ ڈالر کا بھی نہیں ہوگا جبکہ ہم آپ کو پانچ ملین ڈالر

دے رہے ہیں۔ افغانستان کے اندر اور بھی مجاہدین کے گروپ کام کر رہے ہیں، وہ یہی کام پانچ لاکھ ڈالر میں کر دیں گے۔ آپ کا گروپ بڑا اور مضبوط ہے اسی لئے ہم یہ کام آپ کو دے رہے ہیں۔'' میں نے لفظ ہم پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ اس وقت ہمارے قبضے میں ہو، ہم زبردستی بھی اپنی شرائط منوا سکتے ہیں۔'' اس نے کہا تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''کمانڈر صاحب! آپ بچوں جیسی بات کر رہے ہیں۔ جو لوگ پچاس لاکھ ڈالر دے رہے ہیں ان کے نزدیک میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میں صرف ایک چھوٹا سا جاسوس ہوں جو اپنی ایجنسی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ ہم کوئی طالبان کا گروپ نہیں ہیں جو میرے بعد سب ختم ہو جائے گا۔ ایجنسیوں کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں ہوتی۔ ہمارے پاس لامحدود پیسہ اور وسائل ہوتے ہیں۔ اتنا پیسہ اور وسائل جتنا تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ جو لوگ پچاس لاکھ ڈالر صرف ایک حملے کے لئے دے سکتے ہیں ان کے لئے تمہارے جیسے کتنے بھی گروپ ہوں کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور آپ زبردستی کی بات کر رہے ہو۔ میرا صرف ایک اشارہ کرنے کی دیر ہے، یہاں اتنے میزائلوں کی بارش ہو گی کہ آپ لوگ گنتی بھول جاؤ گے۔'' میں اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔

''میرا شک ٹھیک ہے، آپ واقعی ایجنسی کے لوگ ہو۔۔۔ ہم آپ کے ساتھ کوئی ڈیل نہیں کر سکتے۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ کمانڈر وقاص بھی کھڑا ہو گیا۔

''کمانڈر صاحب! پچاس لاکھ ڈالر بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ آپ آسانی سے اس ساری دولت کے مالک ہو سکتے ہو، یہ اتنا مشکل کام نہیں ہے۔'' میں بھی اس کے سامنے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''شاہ جی! ایجنسی والے بہت مکار اور شاطر ہوتے ہیں۔ ہم لوگ ان ایجنسیوں کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتے۔'' اس نے ایک بار پھر انکار کر دیا۔

''ٹھیک ہے! آپ کی مرضی ہے، ہم کوئی زور نہیں دے رہے ہیں۔ آپ یہ کام نہیں کرو گے تو کوئی اور کرے گا۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کمانڈر صاحب! سب کچھ پیسہ ہی نہیں ہوتا، طاقت اور حکومت بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔ ہم لوگ جس کے کندھے پر ہاتھ رکھیں گے اس پورے خطے میں طاقت اسی کے ہاتھ میں ہو گی۔ ہم اس پورے افغانستان

میں صرف ایک ہی گروپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔صرف ایک ہی گروپ پورے افغانستان کو کنٹرول کرے گا اور اس کے لئے ہم نے آپ کے گروپ کو منتخب کیا تھا۔۔۔لیکن بہر حال کوئی بات نہیں ہے۔ میں اوپر بات کر کے منع کر دیتا ہوں، وہ کسی اور کو دیکھ لیں گے۔'' میں کمرے سے باہر نکلنے لگا لیکن انہوں نے مجھے روک لیا۔

''آپ اس کے بعد کس سے بات کریں گے؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھے اس کا علم نہیں، میرے سپرد صرف آپ سے بات کرنے کی ذمہ داری تھی۔ باقی گروپوں کے ساتھ کوئی اور ایجنٹ رابطہ کریں گے۔'' میں پھر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے،ہمیں منظور ہے۔آپ پانچ لاکھ ڈالر ادا کر دیں باقی رقم ہم بلگرام ائیر بیس پر کامیاب حملے کے بعد وصول کر لیں گے۔'' اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''اچھی بات ہے۔ میرے تین آدمی بھی آپ کے ساتھ رہیں گے اور یہ آپ کے لوگوں کے ساتھ مل کر ائیر بیس پر حملہ کریں گے۔'' میں نے مزید کہا تو وہ اس بات کو بھی مان گئے۔ان کے پاس میرے تین لوگ ضمانت کے طور پر بھی چلے گئے تھے جن کو وہ ایجنسی کے ہی آدمی سمجھ رہے تھے۔اسد نے ان لڑکوں کو خفیہ ایجنسی کی طرف سے ہی ہائر کیا تھا اور وہ اپنے آپ کو ایجنسی کے آدمی ہی سمجھ رہے تھے۔

''آپ پانچ لاکھ ڈالر دے دیں تا کہ ہم اپنا کام شروع کر دیں۔'' کمانڈر وقاص نے ایک بار پھر مجھے یاد دہانی کروائی تو میں نے اسے اسد کو اندر بلانے کا کہا۔

اسد اندر آیا تو میں نے پانچ لاکھ ڈالر ان کو دینے کا کہا۔اسد کمانڈر وقاص کو لے کر ایک کونے میں چلا گیا۔اس نے کمانڈر وقاص سے اس کا بیرون ملک میں موجود بینک کا اکاؤنٹ نمبر لیا اور اٹلی میں موجود راشد کو یہ اکاؤنٹ نمبر دے کر اسے پانچ لاکھ ڈالر اس اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروانے کا کہا۔اس دوران کھانا تیار ہو گیا تھا۔کھانے میں بُھنا ہوا بکرے کا گوشت اور تندور کی بڑی بڑی روٹیاں تھیں۔سلاد کے طور پر کھیرے اور پیاز کاٹ کر رکھے ہوئے تھے۔ہم سب نے مل کر خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔کھانے سے فارغ ہوئے تو اسد اٹلی میں کال ملا کر راشد سے بات کرنے لگا۔اس نے تقریباً دو منٹ بات کی اور پھر ایک کمپیوٹر پر بیٹھ کر کمانڈر وقاص کو اکاؤنٹ چیک کرنے کا کہا۔ وہ دونوں تقریباً دس منٹ تک ایک کونے میں رکھے ہوئے کمپیوٹر پر مصروف رہے اور پھر اٹھ کر ہمارے پاس آ گئے۔

''شکریہ شاہ جی! آپ کے پانچ لاکھ ڈالر ہمارے پاس آگئے ہیں۔ آپ اب بے فکر ہو جائیں، بلگرام ائیر بیس پر اتنے بڑے بڑے دھماکے ہوں گے کہ دنیا پچھلے سارے ہی دھماکے بھول جائے گی۔'' کمانڈر وقاص نے میرے پاس آکر کہا۔

''ٹھیک ہے کمانڈر صاحب! بس ٹائمنگ کا خاص خیال رکھنا ہے۔ صدر کے ائیر بیس سے نکلنے کے دس منٹ بعد ہی کاروائی کرنی ہے۔ اس سے ایک منٹ پہلے بھی حملہ کرو گے تو آپ میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا اور پیسہ بھی نہیں ملے گا۔ صدر کے ہوتے ہوئے سیکورٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ ہمیں صرف اپنی دہشت جمانی ہے اور بس زیادہ بہادری دکھانے کی کوشش مت کرنا! ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔'' میں نے اسے ایک بار پھر سمجھایا اور وہاں سے باہر آگیا۔ کمانڈر وقاص کے آدمی ہمیں باہر تک چھوڑنے آئے۔

غزنی میں ہمارے پہلے سے ہی آدمی موجود تھے جو ہمیں لے کر کابل آگئے۔ میں نے ایک رات کابل میں گزاری اور مکمل طور پر آرام کرنے کے بعد خوست (Khost) آگیا۔ میں نے خوست میں بھی موجود اپنے آدمیوں سے ملاقات کی۔ یہاں پر تقریباً 80 کے قریب ہمارے آدمی تھے جو مکمل طور پر مسلح تھے۔ ان کے پاس MG مشین گنیں اور راکٹ لانچر تھے اور وہ ایک بڑی لڑائی لڑنے کے لئے بالکل تیار بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے یہاں کے بھی انتظامات دیکھے۔ ان 80 سپاہیوں کے اوپر پانچ کمانڈر تھے۔ میں نے ان کمانڈروں کو ان کا کام سمجھایا اور اسی شام واپس کابل چلا گیا۔

بلگرام ائیر بیس کابل سے پچاس کلومیٹر شمال کی جانب تھا۔ امریکی صدر کل اسی ائیر بیس پر آرہے تھے اور یہاں پر ہی انہوں نے ایک گھنٹہ رک کر آرمی اور سول افسران سے ملاقات کرنی تھی اور پھر انڈیا چلے جانا تھا۔ بلگرام ائیر بیس اور اس سے متصل پورا شہر آرمی نے سیل کیا ہوا تھا۔ بلگرام ائیر بیس کے اندر ہی نیٹو افواج کا سب سے بڑا ہیڈ کواٹر تھا۔ نیٹو کی فوج کا سربراہ جنرل مائیک بھی یہیں رہتا تھا۔ ائیر بیس اور آرمی ہیڈ کواٹر کی پوری سیکورٹی نیٹو فوج کے سپرد تھی۔ جبکہ شہر میں افغانستان کی آرمی اور پولیس سیکورٹی کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔

اس وقت یہ پورا علاقہ ہی میدان جنگ بنا ہوا تھا اور کوئی بھی یہاں نہیں آسکتا تھا۔ میں اور اسد بلگرام ائیر بیس سے تقریباً آٹھ کلومیٹر آگے ایک چھوٹے سے گاؤں صیاد (Saiad) آگئے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں ایک بہت بڑے نالے کے گرد آباد تھا اور یہ سارا ہی علاقہ پہاڑوں اور جنگلات سے بھرا ہوا تھا۔ صیاد سے پانچ

کلومیٹر کے فاصلے پر محمود راقی (Mehmood Raqi) شہر تھا جس کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب تھی۔ یہ شمال مشرق کی طرف تھا جبکہ دوسری طرف شمال مغرب کی طرف چاریکار (Charikar) شہر تھا جس کی آبادی پونے دو لاکھ کے قریب تھی۔ ہم گاؤں سے ہٹ کر بالکل جنگل کے درمیان میں ایک اونچی چوٹی پر براجمان تھا۔ یہاں صرف ایک سنگل لائین ہی پہاڑیوں کی تھی اور باقی وادی نما میدانی علاقہ تھا جو جنگلات سے گھرا ہوا تھا۔

میرے اور اسد کے علاوہ یہاں بیس اور لوگ بھی تھے۔ ہم سب یہاں پر رہ کر صدر صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے پاس تقریباً ہر قسم کا اسلحہ اور گاڑیاں موجود تھی جو کہ ایک چھوٹی جنگ کے لئے کافی تھیں۔ صدر صاحب نے دوسرے دن چار بجے کے قریب آنا تھا اور پانچ بج کر پندرہ منٹ پر ان کا طیارہ بلگرام ائیر بیس سے اڑان بھر جاتا اور انڈیا کی طرف ان کا رخ ہو جاتا۔ ہمارا ایک آدمی جنرل مائیک کے پاس بھی پہنچ چکا تھا اور ابھی تک سارے معاملات ہمارے ہاتھ میں تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ ہر کام میرے بنائے ہوئے پلان کے مطابق ہو رہی تھا۔

''علی بھائی! ہمارا کیا کام ہے، کیا ہم نے یہاں پر رہ کر صرف انتظار ہی کرنا ہے؟'' ہمیں صیاد آئے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا اور اس ایک گھنٹے میں اسد نے یہ سوال تقریبا دس بار پوچھ لیا تھا۔

میرے منصوبے کا میرے علاوہ اور کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ سب لوگوں کو اپنا اپنا کام تو پتہ تھا لیکن میرے منصوبے کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ سبھی لوگ اسے صرف ایک دہشت گرد حملہ ہی سمجھ رہے تھے۔ صدر کے اغوا کا صرف مجھے اور راشد کو ہی پتہ تھا۔ باقی سارے اس پورے منصوبے سے لاعلم تھے۔ ہمارے ساتھ اس جنگل میں موجود 90 لوگوں کو بھی صرف اتنا علم تھا کہ انہوں نے ایک آدمی کو اغوا کرنا ہے اور بس، اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

ہم نے چوہدری شہباز سے ایک ارب ڈالر تاوان وصول کیا تھا اور یہاں پر میں ہر ایک آدمی کو (جو ہمارے لئے کام کر رہا تھا) دس دس ہزار ڈالر فی کس دے رہا تھا۔ یہ پاکستانی گیارہ لاکھ روپیہ بنتا ہے۔ افغانستان میں ایک مزدور مہینے کا پانچ ہزار بھی نہیں کما پاتا ہے۔ یہاں کی پچاس فیصد آبادی نے اپنی پوری زندگی میں کبھی ایک لاکھ روپیہ اکٹھا نہیں دیکھا ہوگا اور نوے فیصد آبادی نے تو دس لاکھ روپیہ دیکھنے کا خواب بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ میں یہاں ان کو ایک دن کے کام کا گیارہ لاکھ روپیہ دے رہا تھا، وہ بغیر کوئی سوال کئے

میرے ساتھ کھڑے تھے اور لڑنے مرنے کے لئے تیار تھے۔ میرے پاس اس وقت افغانستان اور پاکستان کے اندر دو سو کے قریب لوگ تھے جو کل کے آپریشن میں حصہ لینے والے تھے۔ میں ان دو سو لوگوں کی فوج کے ساتھ امریکی صدر کو اغوا کرنے والا تھا۔

''علی بھائی! اب بتا بھی دو یار، ہمارا ادھر کیا کام ہے؟'' اسد نے ایک بار پھر میرا کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

''جی جی! آپ ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمیں واقعی یہاں صرف انتظار ہی کرنا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا! اگر انتظار کرنا ہے تو یہ راکٹ لانچر اور میزائل کیوں ہیں؟'' اس نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ویسے ہی اپنی حفاظت کے لئے رکھا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

''حفاظت کے لئے تو سادہ اسلحہ ہی کافی ہوتا ہے۔ جبکہ یہاں پر میزائل بھی ہیں اور انکو چلانے کے لئے ہمارے پاس میزائل آپریٹر بھی موجود ہیں۔'' میں میزائلوں کے ساتھ ساتھ میزائل آپریٹر بھی لے کر آیا تھا۔ میں اور اسد دونوں نے باقاعدہ میزائل چلانے کی تربیت لی تھی اور اب ہم بھی میزائل چلا سکتے تھے۔

''بس تھوڑا انتظار کرو بھائی! سب کچھ تمہارے سامنے ہی ہوگا اور ہم انشاءاللہ کامیاب ہوں گے۔'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''جی بھائی! انشاءاللہ۔۔۔۔ ہم کامیاب ہوں گے، میں بس تھوڑی تسلی کرنا چاہتا ہوں اگر آپ کے پلان میں کہیں کوئی کمی ہوتی تو ہم مل کر اسے ٹھیک کر سکتے ہیں۔ یہ بہت بڑا آپریشن ہے اور ہماری معمولی سی غلطی بھی ہمیں مروا سکتی ہے۔'' اسد نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں اسے ایک سائیڈ پر لے گیا اور پورے منصوبے کی تفصیلات بتانے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک میں مسلسل بولتے ہوئے اسے سارا منصوبہ سمجھایا۔ درمیان میں وہ سوالات بھی کر لیتا تھا جس کا میں اسے جواب دینے کے بعد دوبارہ تفصیل بتانے لگتا۔

''جی اسد صاحب! اب آپ بتاؤ کوئی کمی ہے اس منصوبے میں؟ ہمیں اس میں مزید کچھ ایڈ کرنا پڑے گا یا ٹھیک ہے یہی؟'' میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''نہیں علی بھائی! یہ ٹھیک رہے گا، یہ بالکل پرفیکٹ منصوبہ ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کا کوئی جھول نہیں

ہے اور انشاء اللہ ہم کامیاب بھی ہوں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم دونوں واپس اپنے ساتھیوں کے پاس آ گئے۔

آج رات ہم نے اس پہاڑی پر ہی گزارنی تھی۔ میں نے پانچ پانچ آدمیوں کے چار گروپ بنائے اور ان میں سے ایک گروپ کو پہرا دینے کا کہا جبکہ باقی تین گروپوں کو سونے کا کہہ دیا۔ ہم نے یہ رات یہیں گزارنی تھی۔ کل دن کو چونکہ صدر صاحب نے آنا تھا اس لئے کل دن کو اس پورے علاقے میں کرفیو لگ جانا تھا اور اس کرفیو میں ہم ادھر نہیں آ سکتے تھے۔ اس لئے میں ایک دن پہلے ہی ادھر آ گیا تھا۔ آج کی رات اور کل کا دن ہم نے ادھر ہی گزارنا تھا۔ میں نے اسد کو سو جانے کا کہا اور خود جاگ کر باقی لوگوں کے ساتھ پہرہ دینے لگا۔ میں ساری رات جاگ کر پہرہ دیتا رہا۔ میں نے صبح پانچ بجے فجر کی نماز پڑھی تب تک اسد جاگ گیا تھا۔ میں نے اسد کو پہرے کا کہا اور خود سو گیا۔ اس کے بعد میں دو پہر دو بجے کے قریب اٹھ گیا اور اسد کو آنکھ لگانے کا کہا۔

''نہیں علی بھائی! اب نیند نہیں آ رہی ہے، میں نہیں سوؤں گا۔'' اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں! اسد تم لازمی سو جاؤ، پانچ بجے تک ہمیں کوئی بھی کام نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر دوبارہ پتہ نہیں کب سونا نصیب ہو۔ اس کے بعد بہت لمبا سفر ہے اور خطرناک بھی ہے۔ ہمیں پوری دنیا سے ہی مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہم ایک کونے سے دوسرے کونے تک بھاگتے ہی رہیں گے۔ اس کے بعد نیند نہیں ہوگی، اس لئے پہلے ہی سو جاؤ تا کہ تازہ دم رہو۔ تازہ دم رہو گے تو زیادہ جان سے لڑ سکو گے۔'' میں نے اسے زبردستی سلا دیا۔

اسد کے سونے کے بعد میں نے سیٹلائٹ فون سے کمانڈر وقاص کا نمبر ملایا۔ وہ بھی اپنی پوری تیاری کے ساتھ چاریکار شہر میں بیٹھا ہوا تھا۔ چاریکار سے ائیر بیس صرف بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ صدر نے سوا پانچ بجے بلگرام سے نکلنا تھا۔ کمانڈر وقاص اپنے آدمیوں کو لے کر پانچ منٹ پہلے ادھر سے نکلتا اور دس منٹ تک بلگرام ایئر بیس کے گرد اپنا گھیرا ڈال لیتا۔ ایئر بیس کے اندر اس وقت موبائل جیمر لگ چکا تھا اور ہماری کوئی بھی کال اب ائیر بیس کے اندر موجود ہمارے آدمیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ٹھیک چار بجے مجھے فضا میں ایک چھوٹا سا جہاز نظر آ گیا جو آہستہ آہستہ بڑا ہوتا گیا۔ میں اس وقت پہاڑی کے اوپر کھڑا تھا۔ میں نے دوربین لگا کر جہاز کی طرف دیکھا تو مجھے ائیر فورس ون (Air Force 1) کا بڑا سا مونوگرام نظر آ گیا۔ طیارہ فضا میں سیدھا ہوا اور ائیر پورٹ پر نیچے اتر کر میری نظروں سے غائب

ہو گیا۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ افغانستان پہنچ چکے تھے۔ ہم سب لوگ پچھلے دس مہینے سے ان کو پاکستان لانے کے لئے محنت کر رہے تھے۔ ہم انہیں لینے کے لئے امریکہ بھی جانے کو تیار تھے لیکن یہ خود ہی چل کر ہمارے ہمسائے کے گھر آ گئے تھے۔ اسد اتنی دیر میں اٹھ گیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی ہوائی جہاز کو نیچے اترتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

''علی بھائی! دیکھ لو، امریکی کتنے برے ہیں۔۔۔ یہ افغانستان بھی جا رہا ہے اور ہمارے اوپر سے گزر کر انڈیا بھی جا رہا ہے لیکن ہمارے ملک میں نہیں آ رہا ہے۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''نہیں یار! یہ غلط بات ہے۔۔۔ ہر ملک اپنے فیصلوں کا خودمختار ہوتا ہے۔ یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ کدھر جاتا ہے یا کدھر نہیں جاتا، ہم اعتراض نہیں کر سکتے۔'' میں نے اس کی بات مسترد کر دی۔

''لیکن پھر بھی۔۔۔ ہم نے بھی تو اس جنگ میں بہت کچھ کھویا ہے۔ کیا تھا اگر وہ آدھے گھنٹے کے لئے ہی سہی، کچھ پل تو پاکستان میں بھی گزار لیتا؟'' اس کا اعتراض ابھی تک اپنی جگہ پر قائم تھا۔

''نہیں! ہمیں اس کے آنے یا نہ آنے کی بحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہمیں خو کو ہی اتنا مضبوط بنا لینا چاہیے کہ وہ خود ہی ہمارے پاس آنے پر مجبور ہو جائیں، ہمیں کسی کو کہنے کا موقع ہی نہ ملے۔'' میں ابھی تک اس کی بات سے اتفاق نہیں کر رہا تھا۔

امریکی صدر کے طیارے نے بلگرام ائیر بیس پر لینڈ کیا۔ انہیں رن وے سے جنرل مائیک نے رسیو کیا اور ائیر بیس کے اندر بنے ہوئے آرمی ہیڈ کوارٹر چلے گئے۔ صدر نے وہاں نیٹو افواج کے دیگر افسران سے ایک مختصر خطاب کیا۔ افغانستان کے صدر اور افغانستان میں موجود امریکی سفیر بھی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ وہ بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ حیرت انگیز طور پر وہاں پاکستانی اور انڈین دونوں سفیر بھی اس تقریب میں موجود تھے اور دونوں کو تقریب میں جگہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہی ملی تھی۔ پاکستان اور انڈیا صرف اپنے اپنے ملکوں کے اندر ہی لڑتے ہیں۔ دونوں ملکوں کی فوج اور سیاست ہی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہے۔

انڈیا اور پاکستان کے باہر دنیا کے کسی بھی کونے میں آپ چلے جائیں تو آپ کو کہیں بھی انڈیا اور پاکستان کی لڑائی نظر نہیں آئے گی۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہر گھر اور ہر خاندان میں ہوتے رہتے ہیں لیکن ملک کے باہر ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے بھی نہیں ہوتے۔ یورپ اور عرب ممالک میں ہندو، سکھ اور

مسلمان سب ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں۔ یہاں صرف اور صرف پنجابی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی نہ صرف عزت کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ پاکستان کا سب سے بڑا دوست ہمسایہ ملک چین ہے اور باقی دو مسلمان ہمسائے ایران اور افغانستان ہیں۔ یورپ کے اندر چائنہ والے ہمیں پہچانتے ہی نہیں ہیں اور ہمارا ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایران کے باشندے یورپ میں ہوتے ہی نہیں ہیں۔ ایرانی ملک سے باہر جا کر کام نہیں کرتے، اس لئے ایرانیوں کا کوئی بھی فرد آپ کو یورپ میں نہیں ملے گا۔ افغانی بہت بڑی تعداد میں یورپ میں رہ رہے ہیں۔ چونکہ یہ بھی اردو یا ہندی زبان بولتے ہیں اس لئے ان کا واسطہ اکثر ہم سے پڑتا رہتا ہے۔ یورپ کے مہاجر کیمپ پاکستانیوں، افغانیوں اور انڈین کو ایک ہی کیمپ میں رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ لڑائی بھی ان افغانیوں سے ہی ہوتی ہے۔

آپ انٹرنیشنل میڈیا کا پچھلے بیس سال کا ریکارڈ نکال لیں۔ آپ کو سو فیصد پاکستانی لڑائیوں میں سے نوّے فیصد افغانیوں کے ساتھ نظر آئیں گے اور ایک فیصد پاکستانیوں کا آپس میں جھگڑا ہوگا۔ انڈین کے ساتھ آپ کو کوئی ایک بھی لڑائی نظر نہیں آئے گی۔ ایسا کیوں ہے، اس کا مجھے بھی علم نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان سے باہر نکلتے ہی انڈین اور پاکستانی دونوں اپنی قومیت بھول کر صرف پنجابی بن جاتے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک مذہب کے علاوہ اور کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو مشترک نہ ہو۔ ہماری زبان، ثقافت، کھیلیں یہاں تک کہ گالیاں بھی ایک جیسی ہیں۔ یورپ میں آپ کو انڈین دکانوں اور ہوٹلوں پر پاکستانی اور پاکستانی دکانوں پر انڈین لوگ کام کرتے نظر آئیں گے۔ یہ محبت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ ہمارا میڈیا جتنی بھی نفرت کا پرچار کر لے لیکن دونوں قوموں میں بسی ہوئی اس محبت کو کبھی ختم نہیں کر سکتا۔

ہمارے دونوں سفیر بھی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھے امریکی صدر کی تقریر سن رہے تھے۔ پاکستانی سفیر کی وہاں موجودگی تو بنتی تھی۔ کیوں کہ پاکستان تو افغانستان کا ہمسایہ ملک ہے اور دہشت گردی کی جنگ سرحد کے دونوں پار ہی ہو رہی تھی۔ طالبان سرحد کے دونوں طرف ہی موجود تھے اور کاروائیاں کر رہے تھے۔ پاکستانی سفیر کی وہاں موجودگی اور نیٹو افواج سے رابطہ تو بنتا تھا لیکن انڈین سفیر کی وہاں موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ انڈیا افغانستان کے اندر حد سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ افغانستان اور پاکستان ہمسایہ ملک تھے۔ سرحد کے اوپر بیٹھے ہوئے ہزاروں لوگ ایسے تھے جن کی رشتہ داریاں دونوں طرف تھیں۔ روزانہ ہزاروں کی

تعداد میں لوگ سرحد کے ایک طرف سے دوسری طرف جاتے تھے۔ افغانستان کی تقریباً ساری ہی تجارت پاکستان کے ذریعے ہوتی تھی اس لئے پاکستان کی دلچسپی افغانستان کے حالات سے تھی۔ افغانستان کے حالات ٹھیک ہوتے تو پاکستان کے حالات بھی ٹھیک ہوجاتے، اسی کے لئے پاکستان بھی محنت کر رہا تھا۔ پاکستان اپنی انٹیلی جنس معلومات نیٹو افواج سے شیئر کرتا تھا۔ انڈیا صرف افغانستان میں اس لئے دلچسپی لے رہا تھا کہ یہ پاکستان کا ہمسایہ ملک ہے اور یہ دلچسپی افغانستان کو مزید دہشت گردی کی طرف دھکیل رہی تھی۔

امریکی صدر نے اپنی تقریر ختم کی اور پھر سول حکومت سے سیاست کے معاملات پر گفتگو کرنے لگا۔ ٹھیک پانچ بجے میں اور اسد اپنی تیاریاں کرنے لگے۔ میں نے میزائل گنیں نکال کر انہیں پہاڑی پر پہلے ہی نصب کر دیا تھا اور اب جلدی جلدی سب کا ایک چکر لگا کر جائزہ لینے لگا۔ یہاں پانچ میزائل گنیں لگی ہوئی تھیں، اس کے علاوہ راکٹ لانچر بھی تھے۔ نیچے وادی میں بارہ کے قریب تیز رفتار جیپیں کھڑی ہوئی تھیں جو کہ بالکل تیار حالت میں تھیں۔ میرے کچھ لوگ ائیر بیس کی دیوار کے بالکل قریب چلے گئے تھے۔ کمانڈر وقاص بھی چار ریکار سے نکل آئے تھے اور وہ بھی آہستہ آہستہ ائیر بیس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

امریکی صدر نے اپنی ملاقات ختم کی اور انڈیا جانے کے لئے جہاز کی طرف بڑھنے لگے۔ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ بالکل تیار کھڑا تھا۔ صدر صاحب جہاز کے قریب آئے تو سیکورٹی پر معمور مستعد اہلکاروں نے صدر کو سلیوٹ کیا۔ صدر نے ان اہلکاروں کے سلیوٹ کا جواب دیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ان کے ساتھ ساتھ جنرل مائیک بھی جارہے تھے۔ انہوں نے بھی انڈیا میں صدر کے ساتھ جانا تھا۔ جہاز کے نیچے نیٹو افواج کے سیکنڈ ان کمانڈ، امریکی سفیر، افغان صدر اور دوسرے فوجی افسران کھڑے تھے۔ یہ سارے امریکی صدر کو الوداع کہنے کے لئے طیارے کے پاس کھڑے تھے۔ صدر اور جنرل مائیک سیڑھیاں چڑھ کر طیارے کے اوپر پہنچے تو انہوں نے پیچھے مڑ کر نیچے کھڑے افراد کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور طیارے کے اندر چلے گئے۔

امریکی صدر کا طیارہ ائیر فورس ون (Air Force 1) کے نام سے مشہور ہے اور یہ دنیا کا محفوظ ترین جہاز ہے۔ اس کے اندر اینٹی میزائل سسٹم لگا ہوا ہوتا ہے۔ آپ باہر سے کوئی بھی میزائل ماریں تو وہ جہاز کو ہٹ نہیں کرے گا بلکہ راستے میں ہی تباہ ہوجائے گا۔ ائیر فورس ون میں دنیا کے جدید ترین کروز میزائیل لگے ہوتے ہیں جو جہاز کی طرف بڑھنے والے ہر میزائل کو ٹارگٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی ہٹ کر جاتے ہیں۔ جہاز کی باڈی اور شیشے سارے بلٹ پروف ہیں، اس لئے ہیوی مشین گن کی گولیاں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ

سکتی تھیں۔ایئر فورس ون ایک مکمل طور پر بلٹ پروف جنگی جہاز تھا جو ہر قسم کے روایتی اور ایٹمی ہتھیاروں سے لیس تھا۔

اس جہاز کے ساتھ تین مزید جہاز (F-16) بھی اڑتے تھے جو صدر کی سیکورٹی کے لئے تھے۔ یہ سارا سیکورٹی نظام خاص طور پر افغانستان کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ نارمل حالات میں صرف ایئر فورس ون ہی اڑتا ہے اور اس کی اپنی بھی بہت سیکورٹی ہوتی ہے۔جبکہ یہاں پر سپیشل سیکورٹی کے لئے مزید تین F-16 طیارے ساتھ میں اڑ رہے تھے۔سب سے پہلے F-16 طیارے ہی فضا میں بلند ہوئے تھے اور وہ ہمارے اوپر سے گزر کر واپس مڑ گئے تھے۔انہوں نے صدر کے طیارے کو آگے بڑھنے کا راستہ دینا تھا۔ایئر فورس ون رن وے پر آہستہ آہستہ دوڑنا شروع ہوا اور پھر سپیڈ پکڑتے پکڑتے وہ انتہائی تیز رفتاری سے رن وے پر دوڑنے لگا۔اندر صدر اور جنرل مائیک دونوں ایک VIP کیبن میں بیٹھے افغان امور پر بات چیت کرنے لگے۔ طیارے نے ایک جھٹکا لیا اور فضا میں بلند ہو گیا۔اس کے بالکل پیچھے تینوں طیارے بھی نیچی پرواز کر رہے تھے۔

جیسے ہی صدر کا طیارا ہوا میں بلند ہوا اور اس نے ایئر بیس کو چھوڑا میں نے اشارہ کیا اور پانچوں میزائل فضا میں اٹھے اور انتہائی تیز رفتاری سے صدر کے طیارے کی طرف بڑھنے لگے۔صدر کا طیارہ چونکہ اینٹی میزائل سسٹم سے لیس تھا اس لئے وہ بچ گیا لیکن باقی تینوں F-16 طیارے ایک ہی جھٹکے میں میزائل سے ہٹ ہو گئے ۔میرے پاس یہاں سارے کروز میزائل تھے اور یہ حرارت کا پیچھا کرتے تھے۔ جہاز کا انجن چونکہ بہت زیادہ گرم ہوتا ہے اس لئے میزائل جہاز کے انجن کا ہی پیچھا کر کے اسے ٹارگٹ کرتے ہیں۔تینوں F-16 طیارے تباہ ہو کر زمین کی طرف گرنے لگے۔

F-16 جہاز دنیا کے سب سے تیز ترین جنگی جہاز ہیں اور ان کی رفتار اور طاقت کا مقابلہ دنیا کا کوئی بھی دوسرا طیارہ نہیں کر سکتا۔اس کی ساری خصوصیات فضا میں ایک مخصوص بلندی پر جا کر ابھرتی ہیں۔زمین سے صرف پانچ سو فٹ کی بلندی پر اس کی سپیڈ بالکل ہلکی ہوتی ہے۔اس بلندی پر درخت اور پہاڑیاں ہوتی ہیں۔ پائلٹ کی ساری توجہ ان پہاڑیوں پر ہوتی ہے اور رفتار بھی انتہائی کم ہوتی ہے۔ یہ بالکل چھوٹا سا ایک سیٹ والا جہاز ہوتا ہے جس کے اندر صرف ایک ہی پائلٹ ہوتا ہے۔ چونکہ ہر طرف مکمل امن تھا اور کہیں بھی کوئی گڑ بڑ نہیں تھی۔امریکی صدر کے آنے ، یہاں ایک گھنٹے سے زائد رکنے اور دوبارہ فلائی کرنے تک کچھ بھی نہیں ہوا

تھا۔اس لئے سارے ایزی ہو کر کام کر رہے تھے۔ یہ سارے طیارے ہم سے صرف پانچ سو فٹ کی بلندی پر تھے اس لئے آسانی سے ہٹ ہو گئے۔صدر کا طیارہ اینٹی میزائل سسٹم سے لیس ہونے کی وجہ سے بچ گیا۔تیس سکینڈ کے اندر اندر میں نے ایک بار پھر میزائل لوڈ کروا لئے۔اس بار پہلے میں نے وقفے وقفے سے راکٹ لانچر صدر کے جہاز کی طرف داغنے شروع کر دیئے۔

ائیر فورس ون اکیلا ہی فضا میں اڑ کر ہماری طرف آ رہا تھا اور ہم ائیر بیس سے دس کلو میٹر آگے پوزیشن سنبھالے بیٹھے تھے۔ جہاز نے رن وے پر دوڑ کر پہلے فضا میں اوپر اٹھنا تھا، یہ رن وے ہماری طرف تھا۔ جہاز ائیر بیس سے اوپر اٹھتا اور سیدھا ہماری طرف ہی آتا۔اس نے یہاں تک پہنچتے پہنچتے اپنی بلندی مکمل کرنا تھی اور پھر اپنی سمت مغرب کی طرف تبدیل کر کے دہلی کی طرف روانہ ہونا تھا۔ یہ بہت بڑا جہاز تھا اور اس کے اندر ائیر سیکورٹی کا پورا عملہ بیٹھتا تھا۔ انہوں نے پیچھے ائیر بیس کو پیغام بھجوا دیا۔ ویسے بھی تینوں F-16 طیاروں کی تباہی نیچے ائیر بیس پر بھی دیکھی گئی تھی جبکہ فضا میں اڑنے والے ڈرون بھی ان طیاروں کی تباہی کی ویڈیو پیچھے واشنگٹن تک دکھا رہے تھے۔ائیر فورس ون طیارہ ہمارے راکٹوں کا مقابلہ کرنے لگا۔وہ اپنی طرف آنے والے ہر راکٹ کو تباہ کر رہا تھا۔

پیچھے ائیر بیس پر مزید طیارے اڑنے کے لئے تیار ہوئے لیکن اتنی دیر تک کمانڈر وقاص نے ائیر بیس پر حملہ کر دیا۔ وہ ایک طرف سے حملہ کر رہا تھا۔نیٹو افواج اس طرف ان کا مقابلہ کرنے لگی تو دوسری طرف سے میرے باقی آدمیوں نے راکٹوں سے ائیر بیس پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔بلگرام ائیر بیس کو دونوں اطراف سے راکٹوں کے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔میرے آدمیوں کے پاس راکٹوں کا پورا ذخیرہ موجود تھا۔ہمارے پاس راکٹوں اور میزائلوں کی کمی نہیں تھی۔ بلگرام ائیر پر موجود طیارے واپس انڈر گراونڈ چلے گئے۔ان میں سے دو نے اڑنے کی کوشش کی تھی لیکن نا کام رہے۔ چونکہ میں بالکل تیار کھڑا تھا، جیسے ہی طیارے ائیر بیس سے باہر فضا میں اٹھے، میرے میزائلوں نے انہیں ادھر ہی چاٹ لیا۔وہ ائیر بیس سے ایک کلو میٹر بھی آگے نہ آ سکے۔ ہیڈ کواٹر کی دیواروں سے اڑ اڑ کر راکٹ اندر گر رہے تھے اس لئے انہوں نے جلدی سے باقی طیارے گراؤنڈ کر دیے اور مزار شریف اور کندھار سے ہوائی سپورٹ مانگنے لگے۔

کابل کو سب سے نزدیک پشاور اور جلال آباد پڑتا تھا۔جلال آباد کے اندر بھی ایک امریکی اڈا موجود تھا لیکن وہ چھوٹا اڈا تھا۔وہاں صرف چھوٹے جہاز یا ہیلی کاپٹر ہی اترتے اور چڑھتے تھے۔ پاکستان کے کوہاٹ

اور پشاور میں ائیرفورس کے بڑے اڈے تھے اور یہاں پر ہر قسم کے طیارے چوبیس گھنٹے تیار کھڑے رہتے تھے ۔ چونکہ اس وقت معاملہ امریکی صدر پر اٹیک کا تھا اس لئے واشنگٹن نے پاکستانی ائیرفورس سے بھی مدد مانگ لی اور پاکستان ائیرفورس بھی مقابلے پر تیار ہوگئی۔ بلگرام ائیربیس پر لڑائی اپنی پوری شدت سے چل رہی تھی جبکہ دوسری طرف امریکی صدر کا طیارہ ائیرفورس ون بھی ہمارے راکٹوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔

میں نے اسد کو اشارہ کیا اور پھر پہلے ایک میزائل کو نشانہ باندھ کر جہاز پر فائر کیا اور اس کے ٹھیک پانچ سیکنڈ بعد اکٹھے دو میزائل فائر کئے ۔ مزید ایک ایک سیکنڈ کے وقفے سے باقی دو میزائل بھی فائر کر دیئے۔ اس طرح پہلے تین میزائل تو اینٹی سسٹم سے ناکارہ ہو گئے جبکہ باقی دونوں میزائل جہاز سے ٹکرا گئے ۔ جہاز چونکہ بلٹ پروف تھا لیکن ایک میزائل کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں میزائل جہاز کو زیادہ نقصان تو نہیں پہنچا سکے لیکن پھر بھی اسے فضا میں بری طرح لڑکھڑا دیا۔ اتنی دیر میں پہلے تین میزائل پھر تیار ہو گئے تھے۔ اس بار میں نے اکٹھے تینوں میزائل فائر کئے اور تینوں میزائل ہی جا کر جہاز سے ٹکرا گئے ۔ اس بار انہوں نے جہاز کے ایک پَر کو تباہ کر دیا اور جہاز تیزی سے زمین کی طرف آنے لگا۔

میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی ہوئی تھی، مجھے جہاز سے پیراشوٹ کی مدد سے دو آدمی نیچے چھلانگ لگاتے نظر آ گئے ۔ یہ صدر ٹرمپ اور جنرل مائیک تھے۔ ان کے چھلانگ لگانے کے تھوڑی دیر بعد باقی عملہ بھی پیراشوٹ پہن کر نیچے چھلانگ لگانے لگا۔ میں نے باقی سبھی لوگوں کو اشارہ کیا اور ہم سب تیزی سے نیچے گاڑیوں کی طرف جانے لگے۔ گاڑیوں میں سوار ہوتے ہی ساری گاڑیاں وادی کی طرف بڑھنے لگیں۔ ہمیں اب ان میں سے صدر کو اغوا کرنا تھا۔ پیراشوٹ ہم سے صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔ ہم سب پانچ منٹ کے اندر اندر ادھر پہنچ گئے ۔ اچانک پہاڑی کے اوپر سے ایک MG مشین گن کا برسٹ لگا اور اس برسٹ نے امریکی صدر کے پیراشوٹ کو پھاڑ دیا۔

یہ میرا آدمی تھا جو پہاڑی کے اوپر مشین گن لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ افغانستان کا سب سے بڑا اسنائپر تھا جو طالبان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ وہاں سے اسے میں نے لے لیا تھا اور اب یہ میرے لئے کام کر رہا تھا۔ مشین گن کے برسٹ نے پیراشوٹ کا صرف ایک ہی حصہ پھاڑا تھا۔ وہاں سے ہوا کا گزر شروع ہوا تو وہ تیزی سے زمین کی طرف آنے لگے ۔ اگر وہ پیراشوٹ کی مدد سے زمین پر آتے تو تب تک پاکستانی اور نیٹو کی ائیر فورس نے اس پورے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لینا تھا۔ جبکہ طیارے سے باہر آنے والے دوسرے

سیکورٹی کے افراد بھی صدر کو اپنے گھیرے میں لے لیتے۔ اس وقت میں انہیں لے جا نہیں سکتا تھا اس لئے میں نے وہاں ایک سنائپر کھڑا کیا تھا جو صرف صدر کے پیرا شوٹ کو ہی برسٹ مارتا تا کہ وہ دوسروں کی نسبت تیزی سے زمین پر آتے اور ہم انہیں باقی فوج کے آنے سے پہلے ہی لے جاتے۔

مشین گن نے صدر کے سارے پیرا شوٹ کو نہیں پھاڑا تھا بلکہ صرف ایک سوراخ کیا تھا۔ وہی سوراخ صدر کو تیزی سے زمین کی طرف لے کر آ رہا تھا۔ ہم بھی وادی کے اندر ہی کھڑے صدر کے نیچے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ زمین پر گرے میں نے جلدی سے گاڑی آگے بڑھائی اور انہیں اٹھا کر گاڑی میں منتقل کر دیا۔ گاڑی اس بار ہمارا ایک آدمی چلانے لگا جبکہ میں اور اسد پیچھے صدر کے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے جلدی جلدی صدر کو ٹٹول کر دیکھا تو وہ بالکل ٹھیک تھے۔

''علی بھائی! کیسے ہیں یہ؟ ان کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟'' اسد نے فکرمندی سے کہا تو میں ایک بار پھر انہیں ہلا جلا کر دیکھنے لگا۔

وہ بالکل ٹھیک تھے، کہیں بھی کسی قسم کو چوٹ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ صرف بلندی سے گرنے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ میرے پاس کلوروفارم کی ایک بوتل تھی۔ میں نے وہ شیشی نکالی اور ایک کپڑے کے ٹکڑے پر کلوروفارم لگایا اور بے ہوش پڑے ہوئے امریکی صدر کے ناک سے لگا دیا۔ صدر صاحب صرف وقتی طور پر بے ہوش ہوئے تھے اور امید تھی کہ دس پندرہ منٹ بعد ہوش میں آ جاتے۔ ہم نے یہاں سے بہت لمبا سفر کرنا تھا۔ صدر صاحب اگر ہوش میں آ جاتے تو ہمارے لئے بہت پرابلم ہوتی۔ ہم باہر بھی ایک لڑائی لڑ رہے تھے اور گاڑی کے اندر انہیں بھی سنبھالنا پڑ جاتا۔ میں نے اسی لئے انہیں کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ اب یہ لمبے عرصے کے لئے بے ہوش ہو گئے تھے اور کم از کم بارہ گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہ آتے۔

باہر اس وقت پورے ایریے میں ہی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ کمانڈر وقاص اپنے پیسوں کا حق ادا کر رہے تھے۔ اس نے پورے ائیر بیس کو میدانِ جنگ بنا دیا تھا۔ اس وقت پورا ائیر بیس میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ راکٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ رائفل کی گولیوں کی یہاں کوئی وقعت ہی نہیں تھی۔ گولیاں راکٹوں کا مقابلہ کہاں کر سکتی ہیں؟ میں نے کمانڈر وقاص کو راکٹوں سے ہی حملہ کرنے کا کہا تھا۔ اسے بھی معلوم تھا کہ طالبان رائفل سے فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس کے لئے راکٹ اور میزائل ہی بہتر ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صرف راکٹ ہی فائر کر رہا تھا۔ ہیڈ کوارٹر کے اندر سارے ہی فوجی محصور ہو کر رہ گئے تھے اور وہ اب باہر سے ائیر سپورٹ کا ہی

انتظار کر رہے تھے۔ ان کے سارے کے سارے جہاز انڈر گراؤنڈ ہو گئے تھے اور وہ جلال آباد اور پشاور سے آنے والی فضائی امداد کے منتظر تھے۔

شہر کے اندر میرے بھی آدمی ایک طرف سے حملہ کر رہے تھے۔ ان کا کام صرف جنگی جہازوں کو اڑنے سے روکنا تھا۔ جب بھی کوئی جہاز رن وے پر باہر نکلتا تھا، وہ ایک ساتھ ہی پچاس کے قریب اکٹھے راکٹ جہاز کی طرف فائر کر دیتے تھے۔ ان پچاس میں سے دس بارہ ضرور جہاز کو ہٹ کر جاتے تھے اور جہاز تباہ ہو جاتا تھا۔ نیٹو نے اپنے تقریباً دس کے قریب جہازوں کی قربانی دے دی تھی۔ باہر امریکی صدر کا طیارہ ائیر فورس ون اور حفاظتی پہرے پر مامور تین F-16 طیارے اس نقصان کے علاوہ تھے۔

شہر کے اندر سیکورٹی پر افغان فوج اور پولیس لگی ہوئی تھی۔ یہ فورس پانچ سات طالبان کو تو کور کر سکتی تھی، پانچ سات افراد پر مشتمل طالبان کے چھوٹے سے گروپ کا تو یہ مقابلہ کر سکتے تھے لیکن یہاں پر تو ہر طرف سے ہی حملے ہو رہے تھے۔ طیاروں کے گرنے کے منظر نے ہی انہیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے پہلے پہل تو مقابلہ کرنے کے لئے ائیر بیس کی طرف پیش قدمی کی لیکن میرے ساتھیوں نے پلٹ کر ان پر حملہ کیا تو وہ سارے ہی غائب ہو گئے۔ ان کا جدھر کو منہ لگا وہ ادھر ہی بھاگ گئے۔ شہر کے اندر موجود افغان آرمی اور پولیس پسپا ہو گئی۔ ان لوگوں نے شہری علاقوں کے گھروں میں گھس کر پناہ لے لی۔ سارے فوجیں ہی شہر سے غائب ہو گئیں اور اب پورا شہر ہی ہمارے قبضے میں تھا۔

امریکی صدر کے طیارے ائیر فورس ون کا سیکورٹی کا عملہ پیراشوٹ کی مدد سے نیچے آ رہا تھا۔ وہ سارے کے سارے وادی میں موجود جنگل میں اتر رہے تھے۔ یہ طالبان کا سب سے آسان شکار تھے۔ وہ سارے طالبان کے ہتھے چڑھ جاتے تو طالبان ان کے بدلے میں اپنے سارے مطالبات منوا لیتے اور انہیں جان سے بھی مار دیتے۔ کمانڈر وقاص نے ان لوگوں کو طیارے سے نیچے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پچاس افراد پر مشتمل سیکورٹی، میڈیا اور صدر کا ذاتی عملہ تھا۔

میرے میزائلوں نے جہاز کا ایک پَر اڑا دیا تھا اور جہاز اچانک دھماکے سے نہیں پھٹا بلکہ آہستہ آہستہ زمین پر آ رہا تھا۔ میں ان سب کو موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ پیراشوٹ کی مدد سے جہاز کو چھوڑ کر نیچے بحفاظت اتر جائیں۔ میں ان سب کو مارنا نہیں چاہتا تھا بلکہ صرف صدر کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ باقی کسی سے بھی میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ کمانڈر وقاص نے ان لوگوں کو جہاز سے پیراشوٹ کی مدد سے نیچے اترتے ہوئے

دیکھا تو اس نے ایئر بیس پر حملہ بند کر دیا۔ اسے ائیر بیس پر حملہ کرتے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ اس نے میرا کام کر دیا تھا اور اب پیرا شوٹ کی مدد سے نیچے اترنے والے لوگوں کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ان چیزوں کا پہلے سے پتہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب پیرا شوٹ کی مدد سے لوگ زمین پر اتریں گے تو طالبان ان کو اغوا کرنے کی ضرور کوشش کریں گے۔

صدر کے ساتھ طیارے میں موجود افراد کوئی معمولی لوگ نہیں ہوتے بلکہ یہ سارے کے سارے پروفیشنل اور بڑے افسر ہوتے ہیں۔ انہی میں سے ایک جنرل مائیک بھی تھے جو افغانستان میں موجود پوری نیٹو فوج کے سربراہ تھے اور یہ کسی بھی طور صدر سے کم عہدے کے مالک نہیں تھے۔ جہاز سے نیچے آنے والے سبھی افراد قیمتی تھے اور ان کی قیمت کا مجھے بھی اندازہ تھا اور طالبان کو بھی۔۔۔۔اس لئے وہ ان کو اغوا کرنے کے لئے جنگل کا رخ کرنے والے تھے۔ شہر کے اندر میرے بیس کے قریب آدمی تھے جبکہ ادھر جنگل میں بھی میں نے دس آدمی چھوڑے تھے۔ یہاں میرے پیچھے تیس آدمی تھے جن کا سربراہ کمانڈر یوسف تھا۔ یہ بھی طالبان کے ایک چھوٹے گروپ کا سربراہ تھا۔ میں نے اسے بھی پچاس لاکھ ڈالر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا کام ائیر بیس سے اڑنے والے جہازوں کو صرف روکنا ہی نہیں تھا بلکہ طیارے سے نیچے گرنے والے افراد کی حفاظت بھی انہی کے ذمے تھی۔ میں نے اسے کمانڈر وقاص سے مقابلہ کرنے کے لئے بھی تیار کیا تھا۔ میں نے اس کو مشن کی پوری تفصیل نہیں بتائی تھی بلکہ صرف اتنا بتایا تھا کہ جنگل میں کچھ امریکن لوگ آئیں گے اس نے ان سب لوگوں کی حفاظت کرنی ہے اور انہیں اغوا کرنے کے لئے آنے والے لوگوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ جب جہاز سے نیچے لوگ آئیں گے تو انہیں اغوا کرنے کے لئے ضرور کمانڈر وقاص آئے گا اور مجھے ان لوگوں کی حفاظت کا بندوبست بھی کرنا تھا۔

کمانڈر وقاص نے اپنی جگہ چھوڑی اور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان سے پہلے ہی کمانڈر یوسف کے لوگ جنگل میں پہنچ چکے تھے۔ ائیر بیس کے اندر اور شہر میں موجود نیٹو اور افغان فوج مکمل طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ طالبان کے لئے یہ سنہری موقع تھا۔ پورا شہر ان کے لئے کھلا ہوا تھا اور سب کھل کر شکار کر سکتے تھے۔ شکاری شکار کرنے کے لئے تیزی سے جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ خود ہی شکار بن رہے ہیں۔ کمانڈر یوسف ان کی گھات لگا کر جنگل میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے جہاز سے نیچے آنے والے لوگوں کی جانوں کی فکر تو تھی ہی لیکن یہاں پر بھی میرا ایک مقصد تھا۔ میں حکومتی افواج اور طالبان کو اس جنگل میں

اکٹھا کر کے لڑوانا چاہتا تھا تا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ موقع مل سکے اور میں اس مقام سے جلد سے جلد دور ہو سکوں۔ صدر کی ٹانگ کی پنڈلی میں ایک کمپیوٹر چپ لگی ہوتی ہے اور اس چپ کا براہ راست رابطہ اوپر سیٹلائٹ پر مانیٹر ہوتا ہے۔ مجھے ان ساری معلومات کا علم تھا اس لئے میں نے صدر کی دائیں ٹانگ سے پینٹ اوپر کی تو مجھے چپ کے نشان نظر آ گئے۔ میں نے جیب سے چاقو نکالا اور ٹانگ کی پنڈلی میں ایک کٹ لگا کر چپ باہر نکالی اور زخم پر ایک بنڈ تیج لگا دی۔

''علی بھائی! ان کے کپڑے بھی اتار دیتے، سی آئی اے والے بہت خطرناک ہیں۔۔۔انہوں نے لازمی کوئی بیک اپ بھی رکھا ہوگا۔'' میں نے الیکٹرک چپ اسد کو پکڑائی تو اس نے اسے گاڑی سے باہر پھینک دیا۔

اسد واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا، سی آئی اے والوں نے لازمی کوئی متبادل پلان بنایا ہوگا۔ اسد نے پٹھانوں کے انداز میں ایک بہت بڑی چادر سر پر لپیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے وہ چادر لی اور ہم دونوں نے مل کر انہیں چادر باندھی اور ان کے سارے کپڑے بھی اتار کر باہر پھینک دیئے۔ اسد نے ایک بار پھر باریک بینی سے ان کا جائزہ لیا تو ہمیں دائیں پسلی کے نیچے ایک اور چپ مل گئی۔ میں نے وہاں سے بھی کٹ لگا کر اس چپ کو بھی باہر نکال کر پھینک دیا۔ اب ہمارے ساتھ صرف ایک چادر میں لپٹے ہوئے بے ہوش صدر تھے۔

دوسری طرف کمانڈر وقاص اپنے ساتھ دس گاڑیاں اور چالیس کے قریب طالبان لے کر جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دس طالبان اور باقی گاڑیاں نیٹو کی فوج کی جوابی کاروائی سے ہلاک ہو گئے تھے۔ وہ جیسے ہی جنگل کے قریب پہنچا کمانڈر یوسف نے پہلا راکٹ فائر کیا جو سیدھا سب سے آگے والی گاڑی سے ٹکرایا اور گاڑی ایک دھماکے سے دس فٹ فضا میں اچھل کر دوبارہ زمین پر گر گئی۔ گاڑی زمین پر گرتے ہی اسے آگ لگ گئی۔ اس کے فوراً بعد ہی اس کے پیچھے پیچھے مزید تین اور راکٹ آئے اور ان میں سے ایک مس ہو گیا جبکہ باقی دو نے پیچھے آنے والی مزید دو گاڑیوں کو اڑا دیا۔ ان کی تین گاڑیاں تباہ ہو گئیں تھیں۔ ان سے پیچھے آنے والی گاڑیاں رک گئیں۔

گاڑیوں میں موجود طالبان جلدی سے باہر نکلے اور انہوں نے باہر سڑک کے کنارے موجود چٹانوں میں پوزیشنیں لے لیں۔ کمانڈر یوسف نے سڑک پر کھڑی پہلی گاڑیوں کو اڑا دیا۔ اس نے کچھ راکٹ چٹانوں پر بھی مارے لیکن یہ بے کار تھے۔ راکٹ ان چٹانوں کو تو نقصان پہنچا سکتے تھے لیکن اتنے بڑے

ایریے میں یہ صرف راکٹوں کی لڑائی نہیں ہوسکتی تھی۔ سارے طالبان الگ الگ پوزیشن لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔

راکٹ ایک بھاری اسلحہ ہوتا ہے اور یہ ایک وقت میں صرف ایک ہی فائر ہوسکتا ہے۔ یہ گاڑیوں ٹینکوں یا عمارتوں کو تباہ کرنے کے لئے تو مفید ہوتا ہے لیکن دو بدو لڑائی میں یہ بے کار ہے۔ اس کے مقابلہ میں رائفل زیادہ کار آمد ہوتی ہے۔ رائفل AK-47 طالبان کا سب سے پسندیدہ ہتھیار ہے۔ اس کی میگزین میں چالیس راؤنڈ ہوتے ہیں۔ یہ سب سے ہلکا پھلکا اور کار آمد ترین ہتھیار ہے۔ ہر آدمی کے پاس یہاں کم از کم تین میگزینیں فل بھری ہوتی ہیں اور دو سو سے اوپر گولیوں کے راؤنڈ بیگ میں موجود ہوتے ہیں۔ تین سو راؤنڈ کے ساتھ آپ آرمی کی ایک چھوٹی یونٹ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

یہاں اب راکٹوں سے نکل رائفلوں سے مقابلہ ہونے لگا۔ چونکہ کمانڈر یوسف پہلے سے جنگل میں آ گیا تھا اور اس نے مقابلہ کرنے کی باقاعدہ پلاننگ کی تھی اس لئے اس کے پاس محفوظ پوزیشن تھیں۔ جبکہ اس کے مقابلے میں کمانڈر وقاص بالکل اچانک آ گیا تھا۔ وہ بغیر پلاننگ اور منصوبہ بندی کے آیا تھا۔ اسے کسی بھی قسم کی مزاحمت کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، اس لئے وہ ایزی ہو کر آیا تھا۔ یہاں پر اسے اپنے ہی طالبان سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ دونوں طرف کے بڑے بڑے سردار تو صرف اور صرف پیسے کے لئے لڑ رہے تھے۔ ایک کے لئے پچاس لاکھ ڈالر کی رقم تھی اور وہ اس رقم کے لئے امریکیوں کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ دوسرا پچاس لاکھ ڈالر کما چکا تھا اور امریکیوں کو اغوا کر کے مزید کمانا چاہتا تھا۔

دونوں طرف سے طالبان کمانڈر پیسے کے لالچ میں اندھے ہو کر لڑ رہے تھے جبکہ ان کے ساتھ موجود چھوٹے طالبان اپنی طرف سے جہاد کر رہے تھے۔ کچی عمر کے چھوٹے چھوٹے افغان نوجوان رائفلیں ہاتھ میں لئے اپنی طرف سے دین کی حفاظت کر رہے تھے۔ ہمارے دین نے شاید اسی لئے تعلیم کی اہمیت پر روز دیا ہے۔ ہمارے نبی محمد ﷺ نے اسی لئے مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے کا کہا تھا۔ یہ صرف تعلیم کی ہی کمی تھی جس کی وجہ سے یہ نوجوان اپنی جانیں اسلام پر قربان کرنے کی بجائے اسلام کے خلاف لڑتے ہوئے ضائع کر رہے تھے۔ افغان طالبان تو طاقت، اقتدار اور پیسے کے لئے لڑ رہے ہوتے ہیں اور یہ نوجوان ان بڑے مگرمچھوں کے ہاتھ چڑھ کر اپنی جانیں ایک ان دیکھی جنت کی تلاش میں ضائع کر کے دوزخ کا ایندھن بن رہے ہیں۔ کسی معصوم انسان کو مارنے والا کبھی بھی مجاہد نہیں ہوسکتا اور نہ ہی وہ جنت میں جا سکتا ہے۔

جنگل کے کنارے پر دونوں افغان گروپ آپس میں لڑ رہے تھے۔ ایک امریکیوں کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرا ان کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں گروپ ہی جہاد کے نام پر دہشت گردی کر رہے تھے۔ ان دونوں گروپوں سے پرے امریکی عملہ پیراشوٹوں کی مدد سے زمین پر اتر چکا تھا اور اب صدر کی سیکورٹی کے افراد، میڈیا کی ٹیم اور دوسرے سول لوگوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ سیکورٹی کے افراد صدر کو بھی ڈھونڈ رہے تھے۔ چونکہ جنگل کافی گھنا تھا اور صدر سیدھے جنگل میں گرے تھے اور وہاں سے میں نے انہیں اٹھا لیا تھا، اس لئے وہ انہیں اوپر سے نہیں دیکھ سکے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صدر کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ وہ جنگل کے اندر احتیاط سے صدر کو تلاش کر رہے تھے۔ باہر دونوں گروپوں کی جنگ بھی ہو رہی تھی۔ کمانڈر یوسف نے کمانڈر وقاص کے 25 کے قریب طالبان مار دیے تھے۔ کمانڈر وقاص کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ آگے نہیں جا سکتا ہے اس لئے اس نے پیچھے کی طرف پسپا ہونا شروع کر دیا۔

دونوں گروپوں نے ائیربیس کو چھوڑ دیا تھا۔ وہاں فائر بندی ہوئی تو نیٹو افواج کو باہر نکلنے کا موقع مل گیا اور ان کی آرمی بھی باہر آ گئی۔ پشاور سے اڑنے والے پاکستانی ائیرفورس کے طیارے بھی بلگرام ائیربیس کے اوپر چکر لگانے لگے۔ انہیں پیچھے کی طرف پسپا ہوتا ہوا کمانڈر وقاص کا گروپ نظر آ گیا۔ پاکستانی انٹیلی جنس نے ایک طویل آپریشن قبائلی علاقہ جات میں کیا تھا۔ اسی انٹیلی جنس نے سوات اور بلوچستان میں بھی کئی آپریشن کیئے تھے۔

یورپی اور امریکن پائلٹ چونکہ صرف اپنی اکیڈمیوں میں پڑھ کر آتے ہیں اس لئے یہ انٹیلی جنس کی معلومات پر انحصار کرتے ہیں، اور انہی کی معلومات کے مطابق علاقوں میں بمباری کر کے واپس آ جاتے تھے۔ ان کو گراؤنڈ وار بغیر ٹیکنالوجی اور بغیر انٹیلی جنس کی جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ جبکہ پاکستانی ائیرفورس ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ تجربے پر بھی مہارت رکھتی تھی۔ یہ F-16 طیاروں کو بالکل گراؤنڈ لیول پر بھی اڑانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور بالکل نیچی پرواز کرتے تھے۔ ان پائلٹوں نے پہلے چکر میں ہی کمانڈر وقاص کو پیچھے کی طرف پسپا ہوتے ہوئے دیکھ لیا، اس لئے وہ تیزی سے واپس گئے اور دو جہازوں نے بالکل متوازی اڑتے ہوئے ان پر فائر کھول دیا۔

طیارے کے اندر ہیوی مشین گن لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک منٹ میں آٹھ سو سے اوپر راؤنڈ فائر کرتی تھی۔ دونوں F-16 طیاروں کا ایک برسٹ ہی کمانڈر وقاص اور اس کے ساتھ موجود پندرہ کے قریب ساتھیوں کو

چاٹ گیا۔ مشین گن کی گولی ایک ہاتھ کے برابر لمبی ہوتی ہے اور یہ گولی پتھروں کو بھی پھاڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دونوں طیاروں کا پہلا راؤنڈ ہی کمانڈر وقاص کے پورے گروپ کو ختم کر گیا۔ پشاور ائیر پورٹ سے پاکستان ایئر فورس کے چار F-16 طیارے اس آپریشن میں حصہ لے رہے تھے۔ کمانڈر یوسف نے اس ائیر فورس کے طیاروں کو دیکھا تو وہ بھی اپنی جان بچانے کے لئے جنگل میں اندر کی طرف بھاگنے لگا۔ دوسری طرف سے امریکی سیکورٹی فورس کے افراد آ رہے تھے۔

یہ صدر کی سیکورٹی کے لوگ تھے اور انتہائی تربیت یافتہ کمانڈرز تھے۔ ان میں امریکی CIA اور FBI کے ایجنٹ تھے۔ انہوں نے طالبان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو جلدی سے درختوں کی اوٹ میں پوزیشنیں لے کر فائر کھول دیئے۔ کمانڈر یوسف کے تیس میں سے بارہ لوگ کمانڈر وقاص کے ساتھ لڑائی میں مارے جا چکے تھے اور اب اس کے اٹھارہ طالبان رہتے تھے۔ یہاں امریکی فورس کے پہلے ہی جھٹکے میں اس کے مزید تین اور آدمی ڈھیر ہو گئے۔ اب صرف اس کے پندرہ طالبان رہ گئے تھے۔ اس نے بھی جلدی سے درختوں کے درمیان میں جگہ بنائی اور ایک بار پھر جنگ شروع ہو گئی۔

کمانڈر یوسف امریکی سیکورٹی کے لوگوں کو بچانے کے لئے ہی ادھر آیا تھا۔ اس نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کمانڈر وقاص کو ان تک نہیں پہنچنے دیا تھا۔ اب جب ان کا خاتمہ ہو گیا تھا تو جن لوگوں کی حفاظت کے لئے آیا تھا ان سے ہی لڑ رہا تھا۔ دونوں طرف سے گولیوں کے برسٹ چل رہے تھے۔ طالبان کے پاس اسلحہ بہت زیادہ تھا۔ وہ آتے ہی سپیشل مقابلہ کرنے کے لئے تھے، اس لئے ان کے پاس حد سے زیادہ اسلحہ تھا۔ جبکہ ان کے مقابلے پر بے شک تربیت یافتہ ایجنٹ تھے لیکن چونکہ وہ ایمرجنسی میں جہاز سے پیراشوٹوں کی مدد سے نیچے اترے تھے، اس لئے ان کے پاس بہت کم اسلحہ تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ زمین پر اترتے ہی انہیں طالبان سے مقابلہ کرنا پڑے گا اس لئے وہ جہاز سے اپنے ساتھ اسلحہ لے کر آئے تھے۔ یہ اسلحہ بہت کم تھا اور اس سے طالبان کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔

کمانڈر یوسف ائیر فورس کے جنگی جہازوں کو دیکھ کر ڈر گیا تھا اور وہ جلدی سے جنگل کی طرف بھاگا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بھاری اسلحہ لے کر نہیں بھاگ سکتا تھا اس لئے اس نے راکٹ لانچر وغیرہ ادھر ہی پھینک دیئے تھے۔ اسے اس کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کا مقابلہ جنگل میں امریکی ایجنٹوں سے ہو جائے گا۔ اگر اسے پہلے اندازہ ہو جاتا اور وہ راکٹ لانچر بھی اپنے ساتھ لے کر آتا تو پھر امریکی ایجنٹ کبھی بھی اس کے آگے نہیں ٹھہر

سکتے تھے۔اس نے غلطی کر دی تھی کہ راکٹ لانچر اور بڑا اسلحہ ادھر ہی چھوڑ کر آ گیا۔ابھی دونوں گروپ چھوٹے ہتھیاروں سے لڑ رہے تھے۔ائیربیس سے نیٹو کی فوج بھی جنگل کی طرف ہی آ رہی تھی۔ایک بہت بڑی جنگ اس جنگل میں ہونے والی تھی۔

امریکی ایجنٹ طالبان کے مقابلے پر کمزور پڑ رہے تھے۔وہ وائرلیس سے پیچھے ہیڈ کواٹر میں رابطہ کر رہے تھے اور مزید کمک منگوا رہے تھے۔انہوں نے پیچھے ہیڈ کواٹر میں اپنی لوکیشن بھیج دی تھی کہ وہ جنگل میں کہا پوزیشن لئے ہوئے ہیں۔یہ پوزیشن ہیڈ کواٹر نے فضا میں اڑنے والی پاکستانی ائیرفورس کے جنگی جہازوں کو بھی بھجوا دی تھی۔پاکستانی پائلٹوں نے فائرنگ بند کر دی تھی اور وہ صرف فضا میں چکر لگا کر فضائی نگرانی کر رہے تھے۔ایئربیس نے امریکی اہلکاروں کی پوزیشن بتا کر اچھا کیا تھا ورنہ جنگی جہازوں کی فائرنگ سے سبھی ہلاک ہو جاتے۔

چار جہازوں کے اس بیڑے کی کمانڈ ونگ کمانڈ الیاس تھے۔یہ سرگودھا کے رہنے والے تھے۔80 کی دہائی کے بعد یہ پاکستان کی افغانستان کے اندر پہلی کاروائی تھی۔ونگ کمانڈر الیاس نے طالبان کی ایک ٹکڑی کو ختم کر دیا تھا لیکن دوسری ٹکڑی جنگل کے اندر امریکی فورس سے نبرد آزما تھی۔اسے امریکی فورس کی پوزیشن کا پتہ تھا اور وہ دوسری ٹکڑی جو کہ امریکی فورس سے لڑ رہی تھی اسے بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔اچانک ایئربیس کے اندر سے احکامات آ گئے تھے کہ انہیں صرف فضائی نگرانی کرنی ہے۔ائیراٹیک کی صورت میں امریکی اہلکاروں کی جان کو بھی خطرہ تھا۔

''ہیلو! ہیلو! ونگ کمانڈر الیاس بول رہا ہوں۔۔۔پاکستانی بیڑے کا کمانڈر، مجھے بلگرام ائیربیس کے ہیڈ کواٹر میں بات کرنی ہے۔'' ونگ کمانڈر الیاس نے وائرلیس پر پیغام دینا شروع کر دیا۔

''یس پائلٹ الیاس! میں لیفٹننٹ جنرل جیمز بول رہا ہوں۔'' بلگرام ائیربیس سے انہیں جواب موصول ہوا۔

''سر! یہاں صرف طالبان کے دو گروپ لڑ رہے تھے۔ان میں سے ایک گروپ کو ہم نے ختم کر دیا ہے جبکہ دوسرا گروپ ائیرفورس ون (Air Force One) سے اترنے والے عملے سے مقابلہ کر رہا ہے۔آپ ہمیں بھی اس لڑائی میں حصہ لینے کی اجازت دیں۔'' پائیلٹ الیاس نے ایک چکر جنگل کے اوپر سے لگایا۔اس کی عقابی نظریں جنگل کے اندر چھپے ہوئے طالبان کو تلاش کر رہی تھیں۔

''نہیں، مسٹر الیاس! یہ بہت خطرناک ہوگا۔ اس حملے میں امریکی اہلکاروں کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو گا۔ ائیربیس سے جانے والی افواج جنگل میں پہنچتی ہی ہوں گی۔'' جنرل جیمز نے انہیں منع کرتے ہوئے کہا۔

''سر! ہم نیٹو افواج کے پہنچنے سے پہلے ہی انہیں ختم کر دیں گے۔ نیٹو کی افواج بھی ان کے عقب میں پہنچ گئیں تو وہ سارے مقابلے پر اتر آئیں گے۔ یہ پندرہ سے بیس کے قریب طالبان کا ایک چھوٹا سا گروپ ہے۔ اگر لڑائی ہوئی تو یہ جنگ پوری رات میں پھیل جائے گی۔'' ونگ کمانڈر الیاس نے جلدی سے بولتے ہوئے کہا۔

''نہیں! پھر بھی ہم کوئی رسک نہیں لیں گے۔'' جنرل جیمز ائیر اٹیک کا بڑا فیصلہ لیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ جنگل میں اس وقت امریکی صدر، نیٹو کے جنرل اور دوسرے بڑے بڑے افسران تھے۔ اگر غلطی سے ایک بھی گولی ان میں سے کسی کو لگ جاتی تو جواب دینا مشکل ہو جاتا۔

''سر! آپ ائیربیس سے نیٹو افواج کو بھیج کر رسک لے رہے ہو۔۔۔ طالبان نے بھی ایئرفورس ون کے جہاز سے لوگوں کو اترتے ہوئے دیکھا ہے اور ان کو بھی آگے والے لوگوں کی اہمیت کا اندازہ ہے۔ اگر آپ عقب سے فائرنگ کرو گے تو وہ پیچھے کی بجائے آگے حملہ کریں گے۔ یہ لوگ موت سے نہیں ڈرتے اور ان کے پاس اسلحے کی بھی کمی نہیں ہے۔ یہ بلاخوف ہو کر لڑیں گے تو آگے والے لوگوں میں سے آدھے سے زیادہ لوگوں کو مارنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ صدر اور جنرل صاحب دونوں کی جان کو سب سے زیادہ خطرہ ہوگا۔ میڈیا ٹیم اور سول لوگ جو صدر کے ساتھ ہیں انہیں اس جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے، وہ سب مارے جائیں گے۔ اس لئے پلیز! مجھے ائیر اٹیک کا حکم دیں۔ ابھی موقع ہے اور ہم ان کو ختم کر سکتے ہیں۔'' ونگ کمانڈر الیاس نے پوری تفصیل سے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ونگ کمانڈر صاحب! میں اتنا بڑا فیصلہ نہیں لے سکتا۔ میں تمارا رابطہ ڈائریکٹ جنرل مائیک سے کروا دیتا ہوں، تم ان سے رابطہ کر لو اور ساری تفصیل ان کو بتا دو۔۔۔ وہی یہ فیصلہ لے سکتے ہیں۔'' جنرل جیمز نے ونگ کمانڈر الیاس سے کہا اور ساتھ ہی ان کا رابطہ جنزم مائیک سے کروا دیا۔ ونگ کمانڈر الیاس نے جنرل کو سلام کیا اور انہیں آپریشن کی پوری تفصیل بتا دی۔

''سر! یقین کریں اگر نیٹو کی فوج نے طالبان کو عقب سے گھیرا اور مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو آپ میں

سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ان طالبان کو مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔۔۔یہ سارے نوجوان ہیں اور موت سے بے خوف ہو کر لڑتے ہیں۔انہوں نے آپ کو جہاز سے اترتے ہوئے دیکھا ہے اور آپ سب کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔عقب سے نیٹو کی فوج بھی ڈائریکٹ فائرنگ نہیں کرے گی کیونکہ ان کو بھی یہی ڈر ہو گا کہ گولیاں ان کو کراس کر کے آپ لوگوں کو لگ سکتی ہیں۔ہمیں ائیر اٹیک کا حکم دیں، ہم نے پاکستان میں ان سے بہت مقابلہ کیا ہے اور ہم آسانی سے انہیں مار سکتے ہیں۔'' ونگ کمانڈر الیاس انہیں اپنا پلان بتانے لگا۔

''ٹھیک ہے مسٹر الیاس! مجھے آپ لوگوں کی کارکردگی پر اعتماد ہے۔میں آپ کو اس ائیر اٹیک کی پرمشن دیتا ہوں۔بس تھوڑی احتیاط سے کام لینا۔۔۔یہاں جنگل میں امریکہ کے بڑے بڑے لوگ ہیں اور ہم ان میں سے کسی ایک کے مرنے کا خطرہ بھی نہیں مول لے سکتے، یہ بہت قیمتی لوگ ہیں۔'' جنرل مائیک نے انہیں ائیر اٹیک کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں سر! میں ابھی چکر کاٹ کر اوپر آتا ہوں۔آپ نے ایک راکٹ آسمان کی طرف فائر کرنا ہے تاکہ ہمیں اوپر سے آپ کی پوزیشن نظر آئے۔'' ونگ کمانڈر الیاس نے جلدی سے باقی طیاروں کو بھی پوزیشن لینے کا آرڈر دیا اور چاروں طیارے فضا میں ایک چکر لگا کر امریکی اہلکاروں کے عقب میں پہنچ گئے۔اتنی دیر میں نیچے سے ایک راکٹ فائر ہوا جو بالکل سیدھا آسمان کی طرف گیا۔

''مسٹر الیاس! احتیاط سے۔۔۔پورا مشن آپ کے کندھوں پر ہے۔'' جنرل مائیک کی آواز وائرلیس پر ابھری۔

''بے فکر رہیں سر! ہم پروفیشنل ہیں۔'' ونگ کمانڈر نے وائرلیس پر جواب دیا اور چاروں طیارے اکٹھے نیچی پرواز کرتے ہوئے طالبان کی طرف بڑھنے لگے۔

امریکی سیکورٹی کے اہلکاروں نے راکٹ فائر کرتے ہی تیزی سے جنرل مائیک اور امریکی صدر کے ساتھ آئے ہوئے سول عملے کو زمین پر لٹایا اور ان کے اوپر بالکل سیدھے لیٹ گئے۔یہ ائیر اٹیک سے بچنے کے لئے کیا گیا تھا۔اگر اوپر سے کوئی گولی نیچے آتی بھی تو اس سے سیکورٹی کا فرد ہی مرتا، ان کے نیچے لیٹا ہوا سرکاری مہمان بچ جاتا۔پاکستانی فضائیہ کے طیارے بالکل نزدیک آ گئے اور انہوں نے راکٹ والی جگہ سے دس میٹر آگے سے فائرنگ شروع کی اور اس سے آگے کا پورا جنگل ہی چھلنی کر دیا۔ہزاروں کی تعداد میں گولیاں طیاروں سے فائر ہوئیں اور انہوں نے امریکی اہلکاروں سے دس میٹر کے فاصلے پر موجود ہر چیز کو اڑا

کرر کھ دیا۔

کمانڈر یوسف اوراس کے ساتھ موجود سارے طالبان طیاروں کے پہلے حملے میں ہی ہلاک ہو گئے۔ فضائیہ کے طیارے حملے کے بعد اوپر اٹھے اور دوبارہ ایک غوطہ لگا کر واپس پلٹے۔ انہوں نے وائرلیس پر نیچے جنرل مائیک سے رابطہ کیا اور او کے کی رپورٹ کے بعد دوسرا وار کیا۔ اس بار چونکہ پائلٹوں کو جگہ کا پتہ چل گیا تھا اور وائرلیس پر نیچے موجود امریکی اہلکاروں کی سلامتی کی اطلاع بھی مل چکی تھی، اس لئے اس بار پہلے سے زیادہ طاقت سے حملہ کیا گیا۔ طالبان تو پہلے ہی حملے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ دوسرے راؤنڈ نے ان کی لاشوں کو بھی ادھیڑ کر رکھ دیا۔

گولیوں نے ان کے جسموں کو پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس حملے نے درختوں کو بھی اکھیڑ کر رکھ دیا تھا اور ان کے سارے پتے اور ٹہنیاں ٹوٹ کر نیچے گر گئیں تھیں۔ اوپر سے جنگل بالکل کلیئر نظر آ رہا تھا۔ کمانڈر الیاس کو جنگل میں طالبان کے پھٹے ہوئے اجسام اوپر سے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر غوطہ لگایا اور تیسرا برسٹ مار کر جنرل مائیک کو او کے کی رپورٹ دے دی۔ سیکورٹی اہلکاروں نے جلدی سے عملے کو اپنے پیچھے کور کیا اور فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ وہ فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے لیکن آگے ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ سارے ہی طالبان مارے جا چکے تھے۔

میں نے دونوں گروپوں کو پانچ پانچ لاکھ ڈالر ایڈوانس دیئے تھے جبکہ پینتالیس لاکھ ڈالر دینے تھے۔ وہ بقایا لینے سے پہلے ہی مارے جا چکے تھے۔ میرا ویسے بھی ان کو بقایا رقم دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں ان طالبان کو پیسے دے کر مضبوط نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ میرے اسلام اور خاندان کے دشمن تھے۔ انہوں نے میرے پورے خاندان کو مار ڈالا تھا اور میں یہ جنگ بھی ان کو ختم کرنے کے لئے ہی لڑ رہا تھا۔ جنرل مائیک اور دوسرے امریکی اہلکار جنگل سے باہر نکلے اور انہیں نیٹو کی فوج نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ امریکی صدر ابھی تک غائب تھے۔ جنرل مائیک نے امریکی اہلکاروں کو تو ائیر بیس پر موجود ہیڈ کواٹر میں بھیج دیا اور خود آنے والی فوج کی کمان کرتے ہوئے جنگل میں صدر صاحب کو ڈھونڈنے لگے۔

پاکستانی فضائیہ کے طیاروں کا کام ختم ہو چکا تھا اس لئے انہیں واپس پاکستان بھیج دیا گیا اور خود امریکی ڈرون اور سیٹلائٹ کے ذریعے امریکی صدر کی تلاش کرنے لگے۔ یہ ساری جنگ ایک گھنٹے سے اوپر تک چلی گئی تھی اور اتنی دیر میں ہم صدر کو لے کر کابل شہر سے باہر آ گئے تھے۔ ہماری جیپ انتہائی تیز رفتاری سے گردیز

شہر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بلگرام سے گردیز 185 کلومیٹر دور افغان صوبے پکتیا (Paktia) میں واقع تھا۔

گردیز کی آبادی تقریباً ایک لاکھ کے قریب ہے۔ یہ شہر پاکستان بارڈر سے صرف 70 کلومیٹر دور ہے۔ ادھر سے خرم ایجنسی (Khurram Agency) اور شمالی وزیرستان (North Wazristan) کے پاکستانی علاقے لگتے ہیں۔ یہ سب سے خطرناک علاقہ ہے۔ گردیز کو طالبان کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ امریکی، اسرائیلی اور انڈین ایجنسیاں اس پورے علاقے میں گھومتی ہیں۔ انڈیا کی پوری توجہ اسی علاقے پر مرکوز ہے اور یہاں لاتعداد انڈین قونصل خانے ہیں۔ یہ بظاہر تو یہاں انفراسٹرکچر کا کام کرتے ہیں، مختلف سڑکیں اور پل بناتے ہیں۔ یہ سب کچھ صرف باقی دنیا کو دکھانے کے لئے ہیں۔ اصل میں انڈیا یہاں سے پاکستانی علاقے پر نظر رکھتا ہے اور مختلف کاروائیاں ہوتی ہیں۔ یہاں انڈین ایجنٹ بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ (میرا یہاں لکھنے کا مقصد انڈین دشمنی نہیں ہے، میں انڈیا سے بالکل نفرت نہیں کرتا بلکہ میں یہاں پر صرف حقائق لکھ رہا ہوں)۔

ہر ملک اپنی بقا کی جنگ لڑتا ہے، زیادتی دونوں طرف سے ہوتی ہے۔ بارڈر پر گولی صرف ایک طرف سے ہی نہیں چلتی بلکہ دونوں طرف سے فائرنگ ہوتی ہے اور دونوں طرف کے لوگ مرتے ہیں۔ ہمارے ملکوں میں بہت زیادہ غربت ہے۔ جب بارڈر پر ایک فوجی مرتا ہے تو چاہے وہ انڈیا کا ہو یا پاکستان کا ہو، اپنے پیچھے بوڑھے ماں باپ ایک بیوہ اور یتیم بچے چھوڑ جاتا ہے۔ جن کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے۔ میں اس نفرت کے خلاف ہوں۔ ستر سال ہو گئے ہیں لڑتے لڑتے اور دونوں طرف کی ایک انچ بھی جگہ اپنے ملک میں شامل نہیں کر سکے۔ جو لکیر 1947ء میں انگریز کھینچ کر گیا ہے دونوں ملکوں کی فوجیں اسی لکیر کے اوپر آج تک کھڑی ہیں۔ لکیر تو آج بھی ادھر ہی ہے لیکن اس لکیر کے دونوں طرف لاکھوں ماؤں کے بیٹے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبر کے اندھیروں میں چلے گئے ہیں۔ فوجی سترہ سال کی عمر میں بھرتی ہوتا ہے اور بیس سال کی عمر میں شہید۔۔۔ یہ عمر تو نہیں ہوتی ہے شہادت کی؟ دونوں ملکوں کے کروڑوں لوگ اس دشمنی کی آگ میں جل رہے ہیں۔

انڈیا، چائنہ اور پاکستان دنیا کی ٹوٹل آبادی کا ساٹھ فیصد ہے اور دنیا کے ساٹھ فیصد لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ یقین کریں کہ نفرت کرنا بہت آسان ہے۔ میں ایک ناول ہی انڈیا کے خلاف لکھ دوں تو راتوں رات مشہو ہو جاؤں گا۔ پاکستان میں مجھے ایک بڑا رائٹر مانا جائے گا، جیسے مشرف ہے۔ جس نے

میڈیا کے اوپر آ کر انڈیا کے خلاف چار اچھے بیانات دیئے ہیں اور پورا پاکستان ہی اسے بہادر مان رہا ہے۔ یقین کریں کہ یہ بہت آسان تو ہے لیکن غلط ہے۔نفرت سے آج تک کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکا۔ہمیں محبت سے مل جل کر رہنا چاہیے۔ستر سال ہو گئے ہیں لڑتے لڑتے۔۔۔اب محبت سے رہنے کا وقت ہے۔ یہ نفرت دونوں ملکوں کو ایک دن تباہ کر دے گی۔ مجھے نہیں معلوم خدا نے میرے اندر کتنی صلاحیت رکھی ہے۔ پتہ نہیں میں کتنے ناول اور کتابیں لکھ سکوں گا لیکن میں کبھی بھی نفرت پر مبنی اردو ادب نہیں لکھوں گا۔ مجھے انڈیا اور پاکستان دونوں سے محبت ہے اور میں دونوں ملکوں کی محبت میں ڈوب کر لکھوں گا۔پھر چاہے پڑھنے والا ایک ہو یا ایک کروڑ،اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہمیں بلگرام سے چلے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا اور اس وقت ہم گردیز سے صرف پچاس کلو میٹر دور تھے۔ہم مین روڈ سے جانے کی بجائے کچے پکے راستوں پر اڑے چلے جا رہے تھے۔امریکی سیٹلائیٹ ، ڈرون اور جاسوسی طیارے اس وقت کابل کے ارد گرد کا سارا علاقہ چھان رہے تھے لیکن انہیں کہیں بھی صدر کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔نیٹو کی فوج نے کابل شہر میں مکمل کرفیو لگا دیا تھا اور فوج پورے شہر کو کنگھال رہی تھی۔اگلے آدھے گھنٹے تک ہم گردیز شہر پہنچ گئے۔ہم شہر کی طرف جانے کی بجائے خوست (Khost) کی طرف روانہ ہو گئے۔مغرب کے قریب ہم نے خوست کو بھی کراس کیا اور پاکستانی بارڈر سے صرف پانچ کلو میٹر دور ایک بھیڑوں کے باڑے میں جا کر رک گئے۔یہاں پر تقریباً پچاس کے قریب طالبان تھے۔بارڈر کے دونوں طرف مزید پچاس اور طالبان تھے۔ یہاں پر میرے پاس سو سے اوپر طالبان بھی تھے اور یہ سارے بارڈر کراس کروانے میں میری مدد کرنے والے تھے۔میں یہاں اس احاطے میں صرف آدھا گھنٹہ ہی ٹھہرا۔میں نے صدر کو کپڑوں کا ایک جوڑا پہنایا اور اچھی طرح سے ان کا معائنہ کیا۔وہ ابھی تک بے ہوش تھے لیکن اچھی حالت میں تھے۔میں نے ان کی نبض اور ٹمپریچر چیک کیا،سب کچھ معمول پر تھا۔میں نے مکمل اطمینان کیا اور احاطے سے ہم سب باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔گاڑی ہمیں لے کر تیزی سے بارڈر کی طرف جانے لگی۔ مجھے جلد سے جلد باڈر کراس کر کے پاکستان کی حدود میں داخل ہونا تھا۔میں اگر بارڈر کراس کر کے پاکستان کی حدود میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر میری کامیابی کے امکانات پچاس فیصد سے اوپر چلے جاتے۔امریکی ایجنسیوں نے پورے افغانستان کو کور کیا ہوا تھا۔ان کے صدر کو اغوا کر لیا گیا تھا۔دنیا کی سپر پاور کا سب سے طاقتور ترین آدمی اغوا ہو گیا تھا۔یہ امریکہ کی عزت کا سوال تھا اور وہ اپنی عزت بچانے

میں لگا ہوا تھا۔ پورے افغانستان کی فضائیں جنگی طیاروں سے بھری ہوئی تھیں۔ نیٹو افواج بھی جگہ جگہ آپریشن کر رہی تھی۔ میں اور اسد کچھ طالبان کے ساتھ بارڈر کے بالکل اوپر کھڑے تھے۔ ہمارے ساتھ مقامی افراد بھی تھے جو اپنے ساتھ گدھے بھی لے کر آئے تھے۔ امریکی صدر اس وقت ایک گدھے کے اوپر ہی بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔

''علی بھائی! اب کس کا انتظار ہے؟ رات ہو گئی ہے اور بارڈر بھی بالکل خاموش ہے۔ ہم یہاں سے بارڈر کراس کر سکتے ہیں۔'' اسد نے میری کان کے قریب سرگوشی کی۔

ہم سب اس وقت ایک بہت بڑے نالے کے کنارے کھڑے تھے۔ یہ نالہ افغانستانی شہر خوست سے نکلتا تھا اور پاکستانی شہر بنوں جاتا تھا۔ بنوں سے آگے کچھ مزید نالے بھی اس میں شامل ہو جاتے تھے اور یہ ایک بڑا دریا بن جاتا تھا جو آگے عیسیٰ خیل (Esa Khel) کے مقام پر دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے. عیسیٰ خیل سے اوپر شمال کی طرف چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر کالا باغ ہے. یہ وہی کالا باغ ہے جہاں پاکستان کا سب سے متنازعہ ڈیم ہے. اصل میں دریائے سندگ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس علاقے سے سینکڑوں نالے آ کر دریائے سندھ میں گرتے ہیں اور دریائے سندھ کو ایک عظیم الشان دریا بناتے ہیں۔

جو لوگ میڈیا کے اوپر آ کر ہمیں ڈراتے رہتے ہیں کہ پاکستان پانی کی کمی کا شکار ہو جائے گا، اس کی زمینیں پانی کے بغیر بنجر ہو جائیں گی اور انڈیا ہمارے حصے کا سارا پانی روک لے گا، وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ سندھ طاس معاہدے کے مطابق پاکستان کے حصے میں جو تین دریا آتے ہیں ان میں سے صرف ایک دریا انڈیا سے نکلتا ہے جبکہ باقی سبھی دریا پاکستان کی حدود سے نکلتے ہیں۔ کہتے ہیں آنے والے زمانے میں زیادہ تر جنگیں پانی پر ہوں گی۔ پوری دنیا پانی کی کمی کا شکار ہو جائے گی اور پانی کے حصول کے لئے ملک ایک دوسرے سے لڑائی کریں گے۔

میں اس چیز کو مانتا ہوں کہ مستقبل کی جنگیں پانی پر ہوں گی لیکن پاکستان اور انڈیا کبھی بھی پانی کی کمی کا شکار نہیں ہوں گے۔ ہمارے پاس شمال میں دنیا کا دوسرا سب سے بڑا گلیشئر ہے جو 76 کلومیٹر طویل ہے اور یہ انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں کی سرحدوں میں آتا ہے۔ دنیا کا درجہ حرارت جب بڑھے گا تو قطبین کی برف پگھل کر وہیں سمندر میں چلی جائے گی۔ جبکہ یہاں جب گلیشئر پگھلے گا تو اس پانی کو پورے پاکستان اور انڈیا سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔ پاکستان اگر چاہے تو اس پانی کا ایک قطرہ بھی سمندر میں نہیں جانے دے سکتا۔ یہ دنیا

کا دوسرا بڑا گلیشئر ہے اور اسے ختم ہونے میں بھی ہزار بارہ سو سال لگیں گے۔

پاکستان اور انڈیا کے پاس کوہ ہمالیہ اور کوہ ہندوکش جیسے دنیا کے بلند ترین سلسلے ہیں۔ کوہ ہمالیہ دنیا کا سب سے بلند ترین سلسلہ ہے جو آٹھ ہزار میٹر سے بھی بلند ہے۔ دنیا کا درجہ حرارت بڑھنے سے گرمی بڑھے گی تو سمندر سے پانی بخارات بن کر فضا میں جائے گا۔ بادلوں کو برسنے کے لئے رکاوٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آتے ہیں اور پھر برستے ہیں۔ پانی سے بھرے ہوئے یہ بادل زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر کی بلندی پر ہوتے ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں کوہ ہمالیہ آٹھ کلومیٹر کی بلندی پر ہے۔ بحیرہ عرب کے سمندر سے اٹھنے والے بادل کا ایک ٹکڑا بھی ہمالیہ کراس کر کے چائنہ نہیں جا سکتا۔ یہ ساری بارش پاکستان میں ہی برستی ہے جو بعض اوقات برف باری کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔ پاکستان اور انڈیا سیلاب میں ڈوب کر تو خدانخواستہ تباہ ہو سکتے ہیں لیکن کبھی بھی پانی کی کمی کا شکار نہیں ہو سکتے۔

''علی بھائی! اب کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟'' اسد نے ایک بار پھر مجھے پوچھتے ہوئے کہا۔

''بس! صرف کچھ دیر اور انتظار کر لو، یہاں پہ اب بھی نگرانی ہو رہی ہے۔ میں مکمل محتاط ہو کر ہی بارڈر کراس کروں گا۔'' میں نے اسد سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں اپنے بائیں جانب شمال کی طرف کچھ دھماکوں کی آواز سنائی دی۔ یہ دھماکے علی زئی (Ali Zai) کی طرف ہو رہے تھے۔ ان دھماکوں کے ساتھ ہی دوسری جانب میران شاہ (Miran Shah) کی طرف بھی دھماکے شروع ہو گئے۔ دونوں جانب میرے ہی آدمی تھے جو افغانستان کے اندر سے پاکستانی چیک پوسٹوں پر راکٹ فائر کر رہے تھے۔ دھماکے پہلے وقفے وقفے سے ہو رہے تھے، آہستہ آہستہ ان میں تیزی آنے لگی۔ یہ پاکستانی آرمی تھی جو جوابی گولہ باری کرنے لگی۔ بارڈر کی دوسری طرف افغان آرمی بھی بیدار ہو گئی اور دونوں اطراف سے مسلسل گولہ باری ہونے لگی۔

میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی، میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے دونوں ملکوں کی فوج کو لڑوا دیا تھا اور اب دونوں افواج ایک دوسرے پر بھاری گولہ باری کر رہی تھیں۔ مجھے یہیں سے دھماکے اور ان سے نکلنے والی آگ کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہمارے ساتھ والے طالبان گھبرا گئے تو میں نے انہیں تسلی دی اور انہیں بتایا کہ یہ سب کچھ میری پلاننگ کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔ سرحد کے دونوں جانب افواج ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں اور ایسے میں یہ جگہ محفوظ ہو گئی تھی۔ اب ہم آسانی سے ادھر سے بارڈر کراس کر

کے پاکستان میں داخل ہو سکتے تھے۔ میں نے اپنے گائیڈ کو اشاہ کیا اور وہ ہمیں لے کر نالے کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ہم نے آدھے گھنٹے کا پیدل سفر کیا اور پاکستانی حدود میں داخل ہو گئے۔

پاکستانی حدود میں داخل ہوتے ہی ہم نے نالوں کو چھوڑا اور ایک پتلی سی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے اوپر پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ یہاں سے نالے کا سفر خطرناک تھا۔ پاکستان آرمی نے طالبان سے بچنے کے لئے یہاں بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی تھیں۔ نالہ چونکہ اونچے اونچے پہاڑوں کے بالکل درمیان بہت نیچے تھا اور یہاں پر کوئی سڑک وغیرہ بھی نہیں تھی،اس لئے آرمی کی رسائی یہاں تک نہیں تھی۔ طالبان نالے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے دتہ خیل تک چلے جاتے تھے اور پھر وہاں سے وہ وزیرستان یا پھر خرم ایجنسی کی طرف پیدل جاتے تھے۔آرمی نے ان کو روکنے کے لئے اس نالے کے اردگرد بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی تھیں اور یہ روٹ ختم ہو گیا تھا۔ نالے والا راستہ بند ہو گیا تو طالبان نے پہاڑی کے اوپر دوسرا راستہ نکال لیا تھا۔ یہ راستہ پہلے والے راستے کے مقابلے میں بہت مشکل تھا لیکن پھر بھی گدھوں کی مدد سے ہم اس پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔امریکی صدر ابھی تک بے ہوش تھے اور ایک گدھے کی پشت پر نہایت آرام سے سفر کر رہے تھے۔

''علی بھائی! ان کی پارٹی کا نشان بھی گدھا ہے اور یہ بھی اس وقت گدھے کی ہی سواری کر رہا ہے۔'' اسد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! یہ (Republican) پارٹی کا امیدوار ہے اور ان کا انتخابی نشان ہاتھی ہے جبکہ گدھا باراک اوباما کی ڈیموکریٹک پارٹی کا نشان ہے۔'' میں نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

ہم لوگ پہاڑی کے بالکل اوپر چوٹی تک جانے کی بجائے اس سے کوئی سوفٹ نیچے ہی ایک چھوٹے سے راستے پر آ گئے۔ یہ پتلا سا راستہ بالکل سیدھا نالے کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ ہمارا گائیڈ سب سے آگے تھا۔ چاند کی سفید روشنی اوپر آسمان پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کی معمولی سی روشنی پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے جنگل کے درختوں سے چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ ہم اس راستے پر مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے ابھی تک شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ دونوں ملکوں کی فوج ایک دوسرے کی چیک پوسٹوں پر اندھا دھند فائرنگ کر رہی تھی۔افغان فوج کے پاس بہت زیادہ گولہ بارود تھا کیونکہ نیٹو اور انڈیا افغانستان کو لامحدود اسلحہ اور گولہ بارود دیتا تھا۔ دوسری طرف پاکستان کے پاس اسلحہ اور گولہ بارود تو تھوڑا محدود تھا لیکن ان کو پچھلے تیس بتیس سال سے انڈیا کے ساتھ بارڈر پر گولہ باری سے بہت تجربہ مل چکا تھا۔ پاکستانی آرمی صرف چھیڑ چھاڑ کرتی تھی۔ وہ

آرام سے تین چار گولے پھینکتے تھے اور پھر افغان فوج کا تماشہ دیکھنے لگتے تھے۔ افغان فوج ایک گولے کے مقابلہ میں بیس گولے فائر کرتی تھی۔

یہاں بارڈر کے پاس سارے چیک پوسٹس زیرِ زمین اور ریت کی بوریوں کی مدد سے بنائی جاتی تھیں، اس لئے گولہ باری کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ دونوں طرف سے جانی نقصان بہت کم ہوتا تھا۔ پاکستانی فوج انتہائی پروفیشنل اور تجربہ کار تھی۔ یہ مارٹر گولوں کو چیک پوسٹوں کے اندر تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن صرف انسانی ہمدردی کی بناء پر کبھی بھی ڈائریکٹ ہٹ نہیں کرتی تھی۔ ہم سب انتہائی تیزی سے پاکستانی سرحد سے دور ہو رہے تھے۔ دونوں طرف سے ایک گھنٹے تک مسلسل گولہ باری ہوتی رہی۔ اس کے بعد اگلے دو گھنٹے تک وقفے وقفے سے دونوں اطراف کی فوج ہلکی پھلکی فائرنگ کرتی رہی۔

امریکہ اور نیٹو افواج کابل اور اس کے گرد و نواح میں امریکی صدر کو تلاش کر رہی تھی۔ ہمارے پیچھے پورے افغانستان میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ CIA اور FBI والے اپنی پوری طاقت لگا رہے تھے لیکن ان کو کہیں بھی کامیابی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ امریکی تنظیم بلیک واٹر بھی اس جنگ میں کود چکی تھی اور وہ CIA کی انٹیلی جنس معلومات پر افغانستان کے بڑے بڑے شہروں میں چھاپے مار رہی تھی۔ پورے افغانستان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ بلیک واٹر کے ایجنٹ طالبان کے بڑے لیڈروں کو تو پکڑ کر ہیڈ کواٹر لے جاتے تھے لیکن باقی چھوٹے طالبان کو ادھر ہی مار دیتے تھے۔ سوا پانچ بجے یہ جنگ شروع ہوئی تھی اور ابھی رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

چھ گھنٹے کی اس کاروائی میں ایک ہزار سے اوپر لوگ مارے جا چکے تھے۔ ان میں نیٹو فوج اور امریکی ایجنسیوں کے پچاس کے قریب اہلکار ہلاک ہو چکے تھے جبکہ باقی سارے ہی افغان طالبان تھے۔ میرے حملے میں صرف بیس اہلکار ہی ہلاک ہوئے تھے جس میں سے دس پائلٹ اور دس کے قریب ہی آرمی کے اہلکار تھے۔ میں نے اس ساری کاروائی میں انتہائی احتیاط سے کام لیا تھا۔ میں نے یہ سارا آپریشن اس طریقے سے ترتیب دیا تھا کہ کم سے کم جانی نقصان ہو۔ مجھے طالبان کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا کیونکہ میں نے پلان ہی ایسا بنایا تھا جس میں آرمی کا نقصان ہونے کی بجائے الٹا ہمارا (طالبان) ہی نقصان ہوتا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ دونوں گروپ آپس میں لڑے تھے اور آخری گروپ کو پاکستان ایئر فورس کے جنگی طیاروں نے ہلاک کر دیا تھا۔ یہاں بارڈر پر بھی پاکستانی بمباری سے طالبان ہی ہلاک ہوئے تھے۔ ہم مسلسل سفر کرتے ہوئے

صبح چار بجے کے قریب سپن وام (Spin Wam) پہنچ گئے۔

سپن وام شمالی وزیرستان میں دتہ خیل کے قریب واقعہ ہے۔ دتہ خیل میں امریکن ائیر اٹیک میں 44 آدمی شہید ہو گئے تھے۔ یہ میر علی سے تھل جانے والی مین روڈ کے اوپر واقع ہے۔ سپن وام سے تھل 25 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جو کہ پاکستانی صوبہ خیبر پختونخواہ کی ہنگو ڈویژن کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ تھل قبائلی علاقہ جات کی بجائے KPK کا علاقہ ہے۔ سپن وام سے باہر دریا کے پل کے نیچے تین جیپیں پہلے سے تیار ہی کھڑی تھیں۔ ہم ادھر پہنچے تو جیپوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ہمیں رسیو کیا۔

میں نے اسد کے ساتھ مل کر صدر ٹرمپ کو جیپ میں ڈالا اور اندر خود بھی اسی جیپ میں اسد کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہاں تین جیپوں میں چار لوگ تھے۔ ہمارے جیپ میں بیٹھتے ہی ان لوگوں نے اسلحہ نکالا اور ہمارے ساتھ آنے والے گائیڈ اور دوسرے طالبان کو مار دیا۔ رائفلوں کے برسٹ نے سبھی لوگوں کو ایک ہی جھٹکے میں ہلاک کر دیا۔ یہ سارے کے سارے ہی طالبان تھے اور انہوں نے پاکستان کے اندر دہشت گردی ہی پھیلانی تھی۔ میری ان سے ایک لاکھ ڈالر میں بات ہوئی تھی جس میں سے پچاس ہزار امریکن ڈالر میں نے ان کو رستے میں چلتے ہوئے دے دیئے تھے۔

ہماری جیپ کے ڈرائیور کا نام اکرام الدین تھا۔ اس نے رائفل سے فائرنگ بند کی اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ جلدی سے آگے بڑھ کر ان جیپوں کی تلاشی لینے لگے۔ ان لوگوں کی جیپ میں میرے پچاس ہزار ڈالر کے علاوہ اور بھی بہت سی رقم تھی جو افغانی اور پاکستانی کرنسی میں تھی۔ انہوں نے وہ ساری رقم اور دوسرا ضروری سامان ان کی جیپ سے نکال کر اپنی جیپوں میں منتقل کر دیا۔ طالبان کی لاشوں کو نالے میں پھینک دیا گیا اور سب لوگ جلدی سے واپس آ کر جیپوں میں بیٹھے اور ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

ہم میر علی یا تھل جانے کی بجائے چھوٹے چھوٹے کچے راستوں پر چلتے ہوئے بنوں کی طرف جانے لگے۔ میں تھل کی طرف نہیں جا رہا تھا۔ وہاں سے ایک روڈ KPK اور خرم ایجنسی کی سرحدی حدود کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ہنگو اور کوہاٹ تک جاتی ہے۔ جبکہ دوسری سڑک خرم ایجنسی کے مرکزی شہر پاڑا چنار کی طرف جاتی ہے اور پھر وہاں سے سیدھی آگے افغانستان چلی جاتی ہے۔ یہ روڈ معاشی اور فوجی لحاظ سے بہت اہمیت

کی حامل ہے، اس لئے یہاں سیکورٹی بھی بہت زیادہ ہے۔ مجھے KPK میں داخل ہونا تھا لیکن میں اس طرف سے KPK نہیں جا سکتا تھا کیونکہ یہاں بہت خطرہ تھا۔ ہم لوگ چھوٹے چھوٹے کچے پکے راستوں پر چلتے ہوئے بنوں شہر پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے کچا راستہ چھوڑا اور بڑی سڑک پر آ گئے۔

بنوں KPK کا ایک بڑا شہر ہے اور یہاں سے مہذب علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ آرمی کی بجائے پولیس کی عمل داری اس علاقے میں تھی اور جہاں پولیس ہوتی ہے وہاں سب کچھ ہی پیسوں کی مدد سے ہو جاتا ہے۔ یہاں سے آگے ہمیں کوئی بھی پوچھنے والا نہیں تھا۔ ہم آسانی سے مین روڈ پر سفر کر سکتے تھے۔ میرے پاس پولیس کو دینے کے لئے بہت پیسہ تھا۔ پیسے کے علاوہ تینوں جیپیں اس وقت اسلحے سے لیس تھیں۔ ہمارے پاس رائفل سے لے کر راکٹ تک سب کچھ موجود تھا اور ہم ہر قسم کے مقابلے کے لئے تیار تھے۔ ہمارے آگے اور پیچھے دونوں جیپیں انتہائی تیز رفتاری سے سفر کر رہی تھیں۔ جبکہ ان دونوں جیپوں کے درمیان میں اور اسد صدر ٹرمپ کو لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک بار ہوش میں آ گئے تھے لیکن میں نے انہیں پھر کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کر دیا تھا۔

بنوں سے ہم سرائے نورنگ پہنچے اور وہاں سے لکی مروت جانے کی بجائے شہباز خیل کی طرف مڑ گئے۔ یہ سرائے نورنگ سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ شہباز خیل سے آگے دو روڈ ہیں۔ ایک KPK کے آخری شہر ٹانک کی طرف جاتا ہے جو آگے شمالی اور جنوبی وزیرستان کی طرف چلا جاتا ہے۔ ٹانک میں آرمی کی ایک پوری بریگیڈ لگی ہوئی ہے۔ یہاں سے شمالی اور جنوبی وزیرستان کے لئے آرمی بھیجی جاتی ہے۔ دوسری روڈ ڈیرہ اسماعیل خان کی طرف جاتی ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔

دن کے بارہ بجے ہم ڈی آئی خان پہنچ گئے۔ ہم شہر کے اندر داخل ہونے کی بجائے شورکوٹ کے قریب بائی پاس سے دائیں طرف مڑ گئے۔ بائی پاس سے تقریباً پندرہ منٹ کا سفر کرنے کے بعد جیپیں مین روڈ سے نیچے اتریں اور کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والی ایک کچی سڑک پر چلتے ہوئے ایک ڈیرے پر پہنچ گئیں۔ یہاں پر ایک بند گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ہم نے صدر ٹرمپ کو اس میں ڈالا اور ڈیرے سے باہر آ گئے۔ اس بار ہمارے ساتھ صرف ڈرائیور ہی تھا جبکہ باقی جیپیں ادھر ہی رک گئی تھیں۔ میں نے ان لوگوں کو ادھر ہی رقم کی ادائیگی کر دی تھی۔ ڈیرے کے مالک نے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ وہ لوگ ادھر ہی کھانا کھانے لگے جبکہ ہم لوگ وہاں سے نکل آئے۔

جیسے ہی ہماری گاڑی کچے روڈ سے آگے آئی میں نے جیپ سے ایک ریموٹ کنٹرول نکالا اور اس کا بٹن دبا دیا۔ میرے پیچھے ڈیرے پر ایک بہت بڑا دھما کا ہوا اور اس کے ساتھ ہی مزید بڑے بڑے دھماکے ہوئے اور پورے کا پورا ڈیرا ہی راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ اس دھماکے کی دھمک مجھے یہاں تک محسوس ہوئی اور میں زیرلب مسکرانے لگا۔ میں نے وہاں انتہائی طاقت ور ریموٹ کنٹرول بم نصب کئے ہوئے تھے۔ یہ تعداد میں دس کے قریب تھے، جنہوں نے وہاں موجود سبھی لوگوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ میں اپنے پیچھے سبھی نشانیاں مٹاتا آرہا تھا۔ میرے پیچھے سبھی لوگ مر چکے تھے اور میں نے کہیں بھی کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔

اب صرف میں اور اسد ہی جانتے تھے کہ ہمارے ساتھ بے ہوش آدمی امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ ہے اور اسے ہم افغانستان سے اغوا کر کے لا رہے ہیں۔ ہمارے ڈرائیور کو کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ ڈی آئی خان سے بھکر 35 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ گاڑی کی مدد سے ہم نے دریائے سندھ کا پل عبور کیا اور پنجاب کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ گاڑی بھکر شہر کے اندر داخل ہوئی اور ہم شہر کے ایک نسبتاً کھلے علاقے کی ایک کوٹھی میں چلے گئے۔ یہاں اس کوٹھی میں ایک ایمبولینس کھڑی تھی اور کوٹھی پر سافی (Safi) ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

سرفراز سافی کا تعارف میں پہلے بھی کروا چکا ہوں۔ میں اور میری بہن عریج سافی کے گاؤں میں ہی رکے ہوئے تھے۔ روہی کے بالکل درمیان میں پندرہ گھروں پر مشتمل اس گاؤں کا کوئی نام نہیں تھا۔ اصل میں یہ گاؤں بھی نہیں تھا۔ روہی (Rohi) کے اندر موجود گاؤں کے نام ٹوبوں کے نام سے ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر جس ٹوبے کے کنارے پر موجود تھے اس ٹوبے کا بھی کوئی نام نہیں تھا۔ سافی ایک ایمبولینس لئے بھکر شہر کی اس کوٹھی میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم جیسے ہی کوٹھی میں داخل ہوئے تو سافی جلدی سے باہر آ گیا۔ اس نے ایمبولینس کو سٹارٹ کیا۔ میں نے اور اسد نے مل کر صدر ٹرمپ کو گاڑی سے ایمبولینس میں منتقل کیا اور کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک سائیلنسر لگے پسٹل سے ڈرائیور کو گولی ماردی۔ وہ بے چارہ وہیں ایک کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

''علی بھائی! کیا ہم ٹھیک کر رہے ہیں؟'' اس نے ڈرائیور کو ایک کونے میں کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار! ہم صحیح کر رہے ہیں۔ ایک بڑا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہمیں چھوٹی چھوٹی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔'' میرا لہجہ تھوڑا بھیگ گیا۔ مجھے اس ڈرائیور کو مارتے ہوئے تھوڑا افسوس ہو رہا تھا۔ وہ بے چارا بھی چند پیسوں کے لالچ میں آ کر مارا گیا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اس کی لاش کو بند گاڑی میں منتقل کر دیا اور دوبارہ

کمرے میں آگئے۔ یہاں سے میرے اور اسد کے راستے الگ الگ ہو جانے تھے۔ وہ واپس پشاور چلا جاتا جبکہ میں سافی کے ساتھ روہی کی طرف نکل جاتا۔

''کیا آپ مجھے بھی مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' اس نے میرے ہاتھ میں پسٹل دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! یہ سب کچھ میں نے تم لوگوں کی مدد سے ہی تو کیا ہے۔ تمہارے بغیر تو میں صدر ٹرمپ کے نزدیک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ تم لوگوں کی محنت ہی تھی جو ہم آج ان کو اغوا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! میں تم کو نہیں مار سکتا۔ تم میرے حلیے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں جانتے ہو اور اس سارے معاملے کی اہمیت کو بھی جانتے ہو۔ اس لئے میں تم کو یہ مشورہ دوں گا کہ مکمل طور پر غائب ہو جاؤ! میں نے باقی چاروں کو بھی بول دیا ہے کہ وہ بھی سارے کاغذات جلا کر مہاجر کیمپوں میں چلے جائیں۔ یورپ میں لاکھوں کی تعداد میں مہاجر ہیں اور ان کے درمیان وہ آسانی سے چھپ جائیں گے۔ تم بھی لیبیا چلے جاؤ اور وہاں سے سپیڈ بوٹ کی مدد سے اٹلی چلے جانا! وہاں تم آرام سے چھ مہینے نکال جاؤ گے۔ اتنی دیر میں یہاں حالات ٹھیک ہو جائیں گے، پھر بے شک تم سب واپس آ جانا۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اسد بھائی! مجھے تم پر پورا پورا اعتماد ہے اور میں تمہاری خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔'' میں نے رومال کی مدد سے اچھی طرح پسٹل کو رگڑ کر صاف کیا اور اسے اسد کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے خاموشی سے میرے ہاتھ سے پسٹل لیا اور جیب میں ڈال لیا۔

سافی نے ایمبولینس کو باہر نکالا تو میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے صدر ٹرمپ کو سٹریچر سے اچھی طرح باندھ دیا تھا۔ اس کے علاوہ احتیاطی طور پر ان کے ہاتھ بھی باندھ دیئے تھے۔ ویسے وہ مکمل طور پر بے ہوش تھے اور سٹریچر سے بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھ باندھنے کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن پھر بھی میں نے پوری پوری احتیاط برتی تھی۔ سافی نے ایمبولینس کوٹھی سے باہر نکالی اور ہم لوگ بھکر شہر سے باہر نکل کر جھنگ (Jhang) کی طرف بڑھنے لگے۔ بھکر سے ہم لیہ اور کوٹ ادو کی طرف سے بھی ملتان جا سکتے تھے لیکن یہ سارے سرائیکی ہیں اور یہاں پر بھی پولیس نے کافی سختی کر دی ہے۔ یہ سارا علاقہ وڈیروں کا ہے اور یہاں کے حالات بھی کافی خراب ہیں۔ انگریزوں کے زمانے سے چلے آ رہے ان وڈیروں کے خلاف پتہ نہیں کیوں گورنمنٹ آف پاکستان کوئی ایکشن نہیں لیتی ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے جنگ آزادی کے خلاف انگریزوں کی مدد کی تھی اور بدلے میں انگریز انہیں جاگیریں اور سرداری دے گئے تھے۔ یہ ساری زمینیں انگریزوں کی ہی دی ہوئی ہیں جن پر یہ لوگ آج تک فرعون کی طرح بیٹھ کر غریب لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ میں سب وڈیروں کی بات نہیں کرتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ نوے فیصد جاگیرداروں نے انگریز کی وفاداری کے صلے میں ہی زمینیں لی ہیں۔ انہیں مسلمانوں سے غداری کے صلے میں جاگیریں ملی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کارخانے اور فیکٹریاں قومی ملکیت میں لے کر غلطی کی تھی۔ انہیں زمین اور جاگیریں قومی ملکیت میں لینا چاہئیں تھیں۔ سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور گجرات میں لوگوں کے پاس کنالوں کے حساب سے زمین ہے اور ان علاقوں میں آپ کو ایک کنال بھی خالی اور بے کار نظر نہیں آئے گی۔

وہ لوگ ایک سال میں اس ایک کنال پر چار چار فصلیں بھی لے لیتے ہیں۔ جبکہ ہمارے سرائیکی خطے میں ان وڈیروں کے پاس مربعوں کے حساب سے زمینیں ہوتی ہیں اور زیادہ تر خالی ہی ہوتی ہیں۔ یہاں زیادہ سے زیادہ سال میں ایک فصل اگائی جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ گورنمنٹ ساری زمین ہی واپس لے جائے۔۔۔ نہیں، زمین کسانوں کے پاس ہی رہے۔ یہ انہی کی زمین ہے، بس ایک لمٹ ہو۔ ایک شخص کے پاس ایک مربع سے زیادہ زمین ملک سے بھی اور ملک کی عوام سے بھی زیادتی ہے۔ کمرشل زمین اس میں نہیں آتی، وہ بے شک دس مربع بھی ہو۔ کیونکہ کمرشل زمین پر حکومت کو برابر ٹیکس ملتا ہے۔ رہائشی مکانات اور فیکٹریاں گورنمنٹ کو ٹیکس دیتی ہیں اس لئے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ گورنمنٹ صرف بڑے زمینداروں اور وڈیروں سے زمین واپس لے لے تاکہ یہ لوگ ظلم بند کردیں۔

بھکر سے جھنگ 140 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم ایمبولینس کی مدد سے ڈیڑھ گھنٹے میں آسانی سے جھنگ پہنچ گئے۔ دریائے چناب کے کنارے آباد وسطی پنجاب کے اس خوبصورت شہر کی آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔ یہ سارا علاقہ میدانی ہے۔ صرف اوپر شمال کی طرف سے کیرانا پہاڑیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جھنگ سے نیچے جنوبی پنجاب کے آخری گاؤں تک سارا علاقہ میدانی ہے۔ یہیں سے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے جو شمال کی طرف چائنہ تک چلا جاتا ہے۔ احمدی مذہب کا مرکزی شہر ربوہ بھی اسی جھنگ میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب کی لوک داستان کے کردار ہیر اور رانجھا بھی یہیں کے رہنے والے تھے۔ وارث شاہ نے اپنی مشہور ترین کتاب ہیر وارث شاہ اسی جھنگ میں لکھی تھی۔

پاکستان کے حصے میں سندھ طاس معاہدے کے تحت آنے والے تین دریاؤں میں سے ایک دریا دریائے چناب اسی شہر کے اوپر سے گزر کر جاتا ہے۔ دریائے چناب مقبوضہ کشمیر میں سے نکلتا ہے اور اسی دریا کے اوپر ہی انڈیا ڈیم بنا رہا ہے۔ باقی دونوں دریا پاکستانی حدود سے ہی نکلتے ہیں۔ سندھ طاس معاہدہ کرنے والا شاید دنیا کا بے وقوف ترین انسان تھا جس نے ایک دریا لیا اور تین قیمتی ترین دریا انڈیا کی جھولی میں ڈال دیئے۔ انہی دریاؤں میں سے ایک دریائے راوی بھی ہے۔ دریائے چناب کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم ملتان کی طرف بڑھنے لگے۔ جھنگ سے ملتان 160 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم دو گھنٹے میں ملتان آ گئے۔

ملتان جنوبی پنجاب کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ پاکستان کا پانچواں بڑا شہر ہے جس کی آبادی 32 لاکھ سے زیادہ ہے۔ ملتان سے مزید ایک گھنٹے کا سفر کرتے ہوئے ہم بہاولپور پہنچے اور وہاں سے بہاولپور کی سب سے بڑی تحصیل منڈی یزمان آ گئے۔ بہاولپور رقبے کے لحاظ سے پنجاب کا سب سے بڑا ضلع ہے اور اس کی تحصیل یزمان منڈی بھی رقبے کے لحاظ سے پنجاب کی سب سے بڑی تحصیل ہے۔ منڈی یزمان ریگستان کے کنارے پر واقع ہے۔ یہاں کے صحرا کو روہی کہتے ہیں جو آگے جا کر سندھ کے صحرا تھر سے جا ملتا ہے۔

روہی اور تھر انڈین ریاست راجستھان کا ہی حصہ ہیں۔ یہ پورا صحرا جو جے پور سے شروع ہوتا ہے اور بدین تک جاتا ہے اسی راجستھان کا حصہ ہے جسے پاکستان میں روہی اور تھر کے ناموں سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اس صحرا کے کنارے پر دریائے سندھ بہتا ہے جو نیچے بحیرہ عرب تک چلا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کی وجہ سے یہاں ستر سے پچھتر کلومیٹر چوڑی ایک نخلستانی پٹی بن گئی ہے جو راجستھان کو بلوچستان کے صحرا سے الگ کرتی ہے۔

ہم پہلے یزمان پہنچے اور پھر وہاں سے ریگستان کے بالکل وسط میں موجود اپنے گھر آ گئے۔ گاؤں پہنچتے ہی میں نے اسد کے ساتھ مل کر صدر ٹرمپ کو جلدی سے ایمبولینس سے باہر نکالا اور ایک جھونپڑے میں منتقل کر دیا۔ میں نے جلدی سے ان کے ہاتھ بھی کھول دیئے اور پانی کے کچھ چھینٹے ان کے منہ پر مارے اور ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔

”ساقی بھائی! آپ ابھی چلے جاؤ اور اس ایمبولینس کو ملتان شہر کے اندر چھوڑ کر اپنا ٹرک واپس لے آؤ۔“ میں نے ساقی کو کہا جو کہ بڑے غور سے صدر ٹرمپ کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”علی بھائی! آپ تو واقعی اس کو یہاں تک لے آئے ہو۔“

''اچھا! اب اس کو گھورنا بند کرو، یہ ادھر ہی ہے۔ تم رات تک واپس آجاؤ گے تو پھر جی بھر کر دیکھ لینا۔ یہ ابھی اگلے ایک سال تک ادھر ہی ہے۔'' میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

''جی علی بھائی! میں جاتا ہوں، بس ذرا ایکسائیٹڈ ہو رہا تھا۔ آپ نے واقعی کمال کر دیا ہے، دنیا کا سب سے طاقت ورترین انسان دنیا کے سب سے غریب ترین علاقے میں آ گیا ہے۔'' وہ اس کے چہرے کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔

''اچھا! اب چھوڑ دو اور جلدی کرو! اس ایمبولینس سے پیچھا چھڑاؤ، یہ بہت تنگ کرے گی۔'' میں نے اس کا کندھا پکڑ کر کھینچا اور اسے لے کر باہر آ گیا۔

''ٹھیک ہے بھائی! میں نکلتا ہوں۔'' اس نے مجھ سے کہا اور ایمبولینس میں بیٹھ کر گاؤں سے باہر یزمان کی طرف نکل گیا۔

منصوبے کے مطابق وہ ایمبولینس کو ملتان کے قریب کسی جنگل میں چھوڑتا اور اسے آگ لگا دیتا۔ میں نے اسے پٹرول کے دو کین دیئے تھے اور اسے احتیاط سے آگ لگانے کا کہا تھا۔ وہ ایمبولینس کو آگ لگا کر تباہ کر دیتا، وہاں سے بس پکڑ کر بہاولپور آ جاتا اور وہاں سے پھر یزمان آ جاتا۔ یزمان میں اس کا ٹرک کھڑا تھا، وہ وہاں سے ٹرک لے کر رات تک ادھر واپس پہنچ جاتا۔

وہ وہاں سے باہر چلا گیا تو میں واپس جھونپڑے میں آ گیا جہاں صدر صاحب کو ہوش آ رہا تھا۔ عریج بھی ادھر ہی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس پورے گاؤں میں صرف عریج اور سافی ہی پڑھے لکھے تھے اور ہمیں ہی صدر ٹرمپ کی حقیقت معلوم تھی۔ باقی پوری گوٹھ میں کوئی بھی انہیں نہیں جانتا تھا۔ سافی تو انگلش بھی نہیں بول سکتا تھا بلکہ صرف میں اور عریج ہی انگلش بول سکتے تھے۔ میں نے بی اے کر لیا تھا، عریج نے میٹرک جبکہ سافی نے آٹھویں میں ہی سکول چھوڑ دیا تھا۔

''علی بھائی! یہ واقعی صدر ڈونلڈ ٹرمپ ہیں؟'' میرے اندر آتے ہی عریج نے مجھ سے سوال کیا۔

''ہاں عریج! یہ ٹرمپ ہی ہیں۔۔۔ دنیا کا سب سے طاقتور ترین انسان۔'' میں نے عریج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ امریکہ بہت طاقتور ملک ہے، آپ نے اس کو اغوا کر کے بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ امریکہ اور اس کی فوج یہاں تک پہنچ جائے گی اور ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ وہ بہت

سفاک ہیں۔'' عریج کے چہرے پر مجھے خوف کی ایک جھلک نظر آئی۔

''عریج! کوئی بھی ثبوت نہیں چھوڑا ہے۔۔۔کسی کو بھی پتہ نہیں ہے کہ یہ ادھر ہے۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ یہاں کی قریب ترین آبادی بھی سوکلومیٹر دور ہے اور آج تک اس گوٹھ میں سے تمہارے اور میرے علاوہ صرف سافی نے ہی مہذب علاقہ دیکھا ہے۔ اس گوٹھ سے باہر کی دنیا صرف ہم تینوں نے دیکھی ہے۔ نہ کوئی یہاں آتا ہے اور نہ ہی یہاں سے باہر جا سکتا ہے تو پھر اس ٹرمپ کی خبر باہر کیسے جائے گی؟ کچھ بھی نہیں ہو گا۔'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''بھائی! اسے لازمی آپ نے یہاں اغوا کر کے لانا تھا؟ آپ نے خوامخواہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالا ہے۔ بھائی! اتنا خطرہ مول لینے کا کیا فائدہ ہے؟'' عریج کو ابھی تک اس اغوا کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''عریج! یہ جو شخص تمہارے سامنے بے ہوش پڑا ہے نا! یہ دنیا کا سب سے طاقت ور ترین انسان ہے۔ اس کے ہاتھ میں بہت پاور ہے، یہ دنیا کی قسمت بدل سکتا ہے۔ میں اور تم کچھ بھی نہیں ہیں بلکہ معمولی انسان ہیں اور یہ شخص پوری دنیا کی تقدیر بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دنیا کے سارے بڑے بڑے فیصلے اس شخص کی اجازت سے ہوتے ہیں۔'' میں نے بے ہوش پڑے ٹرمپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا بھائی! یہ کوئی سپر مین ٹائیپ کی چیز ہے؟'' عریج نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں عریج! یہ واقعی سپر مین ہے اور ہم اس سپر مین کی مدد سے دنیا کو بدلنے والے ہیں۔'' میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا اور پانی کے کچھ مزید چھینٹے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے چہرے پر پھینکے۔ وہ پہلے ہی ہوش میں آ رہا تھا، میرے پانی کے چھینٹوں نے اسے پورا ہوش میں لا دیا اور وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ویلکم ٹو روہی ٹرمپ صاحب! ہم آپ کو دنیا کے سب سے محفوظ ترین علاقے میں خوش آمدید کہتے ہیں۔'' میں نے اس کے سامنے خالصتاً ہندوستانی انداز میں ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ (میں سارے انگلش مکالمے اردو ٹرانسلیشن کے ساتھ ہی لکھوں گا کیونکہ یہ اردو ناول ہے اور میرے مطابق اردو ناول میں انگلش لکھنا غلط ہوگا)

''تم کون ہو اور یہ روہی (Rohi) کونسا ملک ہے؟'' وہ روہی کو کوئی ملک سمجھ رہے تھے۔

''اوہ صدر صاحب! روہی کوئی ملک نہیں ہے بلکہ یہ پاکستان کا ایک صحرائی خطہ ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم لوگوں نے مجھے اغوا کر لیا ہے؟'' ان کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نظر آئے اور وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''جی! آپ کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے۔ ہمارے کچھ مطالبات ہیں، امریکن گورنمنٹ جب ان مطالبات کو مان لے گی تو ہم آپ کو رہا کر دیں گے۔'' وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جھونپڑے سے باہر آئے اور میں بھی ان کے پیچھے باہر آ گیا۔

یہاں اس گاؤں کی ٹوٹل آبادی تقریباً 50 افراد پر مشتمل تھی اور اس وقت ان میں سے آدھے سے زیادہ لوگ اس قت جھونپڑے سے باہر کھڑے اس مہمان کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی ٹرمپ باہر نکلے سبھی لوگوں کی نظریں بیک وقت ان پر مرکوز ہو گئیں۔ انہوں نے ایک نظر ان پر ڈالی اور دوسری نظر تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے صحرا پر ڈالی اور وہیں سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ رنگین کپڑوں اور بڑی بڑی جہازی سائز کی مونچھوں والے آدمی انہیں گھور رہے تھے۔ عورتوں نے بھی بڑے بڑے گھا گھرے پہنے ہوئے تھے۔

''صدر صاحب! اندر آ جاؤ، ہم بات کر لیتے ہیں۔'' میں نے انکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو انہوں نے مجھے گلے سے پکڑ لیا۔

''تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو مسٹر! امریکی آرمی مجھے پاتال سے بھی تلاش کر کے نکال لے گی، تم نے ان سب کی زندگیاں بھی داؤ پر لگا دی ہیں۔'' اس نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

''سر جی! امریکہ کا واسطہ اس بار ایک سرائیکی سے پڑا ہے۔ یہ دنیا کی سب سے معصوم ترین اور انتہائی سادہ اور شریف قوم ہیں۔ جنہیں کسی بھی قسم کی کوئی چالاکی نہیں آتی۔ اس جگہ سے باہر پوری دنیا میں کوئی ایک بھی آدمی ایسا نہیں ہو گا جسے ایک فیصد بھی ہم پر شک ہو۔ سر! جب کسی کو شک ہی نہیں ہو گا تو پھر تلاش کیسے کریں گے؟'' میں نے طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا۔ میرا گلا ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے جب ٹرمپ کو میرا گلا پکڑتے ہوئے دیکھا تو وہ تیزی سے آگے آئے لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کر دیا۔

''دیکھو گاؤں والو! میں امریکہ کا صدر ہوں۔ آپ لوگوں نے مجھے اغوا کر کے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ امریکی ائیر فورس کے طیارے اس پوری جگہ کو اُڑا کر رکھ دیں گے اور تم میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔ اس لئے مجھے واپس بھیج دو تو تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ یہ بندہ تم سب لوگوں کو مروا دے گا۔'' انہوں

نے مجھے چھوڑا اور چیخ چیخ کر گاؤں والوں کو بتانے لگے۔

''علی! یہ کیا بول رہا ہے؟ ہمیں تو کوئی ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا۔ سافی کے والد رفیق (Rafiq) نے میرے پاس آ کر کہا۔

''او بھائی صاحب! یہ لڑکا تم سب کو مروا دے گا، اس کی باتوں میں مت آؤ۔'' چاچے رفیق کو میرے پاس آتے دیکھ کر وہ ان سے کہنے لگے۔

سبھی گاؤں والوں میں سے رفیق چاچا ہی آگے بڑھ کر بولے تھے۔ اس لئے ٹرمپ کے اندازے کے مطابق یہی اس گاؤں کے سردار تھے۔ (سافی کے والد رفیق چاچا اس گاؤں کے سردار ہی تھے کیونکہ سافی ٹرک چلاتا تھا اور پورے گاؤں والوں کے لیے کھانا اور دوسری اشیاء شہر سے لے کر آتا تھا۔ اس لئے سب لوگ رفیق چاچا کی عزت کرتے تھے)

''علی بیٹا! یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' رفیق چاچا مجھ سے پوچھنے لگا۔

''کوئی بات نہیں چاچا! ابھی نیا نیا ہے نا یہاں پر۔۔۔ چار دن یہاں رہے گا تو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور صدر صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''سر جی! پورے گاؤں میں سے کسی کو بھی انگریزی نہیں آتی۔ انہیں پاکستان، ہندوستان اور انگلستان کے علاوہ اور کسی ملک کا پتہ نہیں ہے۔ ہاں! سعودی عرب کا بھی پتہ ہے اور بس! اس کے علاوہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے ہیں۔ جس امریکہ کے آپ صدر ہو، یہ اس ملک کا نام بھی نہیں جانتے ہیں۔'' میں نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا۔

''او مائی گاڈ! میں کن جاہلوں کے درمیان پھنس چکا ہوں۔'' انہوں نے غصے سے دھاڑتے ہوئے کہا اور تالاب (ٹوبہ) کی مخالف سمت میں گاؤں سے باہر جانے لگے۔

یہاں ٹوٹل 15 گھر تھے جو سارے کے سارے تالاب کے کنارے پر واقع تھے۔ یہ پورا علاقہ ریگستان پر مشتمل تھا اور یہاں چاروں طرف ریت ہی ریت ہوتی ہے۔ صرف تالاب کے اندر اور اس کے کناروں پر چکنی مٹی ہوتی ہے۔ ہم لوگ اس مٹی سے دیواریں بناتے ہیں اور ان کے اوپر درختوں کی ٹہنیاں ڈال کر پھر مٹی سے لیپ دیتے ہیں۔ اس علاقے میں چھوٹی چھوٹی جنگلی جھاڑیوں کی بہتات ہے۔ یہ جھاڑیاں سارا سال ہی رہتی ہیں۔ بھیڑ بکریاں اور گائیں وغیرہ انہی جھاڑیوں کو سارا دن چرتی رہتی ہیں۔ یہ

سدابہار جھاڑیاں ہوتی ہیں۔ سال میں ایک مہینہ بارش ہوتی ہے جس میں یہ جھاڑیاں کافی پھلتی پھولتی ہیں اوراگلے پورے سال تک کارآمد رہتی ہیں۔ جانوروں کے لئے خوراک تو تقریباً پوری ہوجاتی ہے لیکن صرف پانی کی ہی کمی ہوتی ہے جو پورے چولستان میں ہے۔

ان جھاڑیوں کے علاوہ کھجوراور بیری کے درخت بھی یہاں عام ہیں۔ کھجوراور بیری کوزیادہ پانی کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے یہ ریگستان میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ انہی بیری اور کھجور کے درختوں کے بڑے بڑے ٹہنے چھتوں پر شہتیر کا کام دیتے ہیں جبکہ کھجور کی ٹہنیاں اس کے اوپر ڈال کر مٹی سے لیپ دیا جاتا ہے۔ تالاب سے نکلنے والی مٹی سے اور گائے کے گوبر کو مکس کر کے جو لیپ بنایا جاتا ہے یہ لیپ بہت زبردست ہوتا ہے۔اس سے پانی نہیں گزرتا اور چھت نہیں ٹپکتی۔

صدر صاحب گاؤں سے باہر نکلے تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میرے ساتھ گاؤں کے چاراور نوجوان بھی آ گئے اور ہم سب خاموشی سے صدر صاحب کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ریگستان میں ابھی تک رات نہیں ہوئی تھی۔ جون جولائی کے دن چل رہے تھے اور انتہا کی گرمی تھی۔ بارش ہوئی کو چھ مہینے ہو چکے تھے۔جنوری کے پہلے ہفتے میں اچانک ہی ایک گھنٹے کے لئے تھوڑی سی بارش ہوگئی تھی جس نے روہی میں موجودٹوبوں کوتھوڑا پانی مہیا کر دیا تھا۔ٹوبوں میں پانی آہستہ آہستہ خشک ہورہا تھا اوراسی مہینے کے آخر تک روہی کے 90 فیصدٹوبے خشک ہوجاتے تو اس کے بعد ہم لوگ بارش کا انتظار کرنے لگتے۔اگست کے آخری دنوں یاستمبر میں بارش ہوجاتی تھی۔جنوری کے پہلے ہفتے میں ہونے والی بارش کی وجہ سے ہمارے ٹوبے میں ابھی تک پانی موجودتھا۔ورنہ پانی تو جون کا مہینہ شروع ہوتے ہی ختم ہوجاتا ہے۔

جون جولائی اوراگست کے تین مہینے بہت مشکل ہوتے ہیں۔ پانی پوری روہی میں ہی ختم ہوجاتا ہے اورہم لوگوں کواوپر جانے والے دیہی علاقوں کی طرف جانا پڑتا ہے۔ہمیں تب تک ادھر ہی رہنا پڑتا ہے جب تک روہی میں بارش نہیں ہوجاتی اورٹوبوں میں پانی نہیں آجاتا۔گرمیوں کے یہ تین مہینے بہت مشکل سے گزرتے ہیں۔ہم لوگ بالکل خانہ بدوشوں کی طرح مختلف دیہاتوں کے باہر خیمہ لگا کر رہتے ہیں۔ یہ کپاس کا موسم ہوتا ہے اور ہم جس کسان کے ڈیرے پر جانور لیکر بیٹھتے ہیں اس کی فصل کی گوڈی اور سپرے بدلے میں فری کرتے ہیں۔کسانوں کو ہماری مجبوری کا علم ہوتا ہے اس لئے وہ فصلوں میں بھی کام کرواتے ہیں اور ہماری عورتوں سے گھروں میں بھی کام کرواتے ہیں۔

گرمی کے دنوں میں سورج کی شعاعیں سیدھی ریت پر پڑتی ہیں تو ریت تپنا شروع ہو جاتی ہے۔ ریت گرم ہوتی ہے تو پھر پورے روہی کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ جیسے جیسے دن گزرتا جاتا ہے، گرمی بھی بڑھتی جاتی ہے اور شام کے وقت یہ درجہ حرارت اپنے انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت بھی انتہا کی گرمی تھی۔ ہمارے آگے آگے صدر صاحب چل رہے تھے اور ہم سب خاموشی سے ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

''علی بھائی! انہیں پکڑ کر واپس لے جائیں؟'' میرے ساتھ آنے والے چاروں لڑکوں میں سے ایک لڑکے نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں یار! انہیں ایک بار کوشش کرنے دو، جانے دو جہاں تک جانا چاہتے ہیں۔ بوڑھے آدمی ہیں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ ہی چل پائیں گے۔ اتنا بڑا ریگستان ہے، انہوں نے کونسا آدھے گھنٹے میں ریگستان کراس کر لینا ہے؟'' میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا اور ہم سب آہستہ آہستہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

''اوئے لڑکے! میرا پیچھا مت کرو، مجھے جانے دو! تم لوگوں نے مجھے اغوا کرنے کی بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' ہمیں اپنے پیچھے آتا دیکھ کر وہ چیخنے لگے،

''کوئی بات نہیں صدر صاحب! آپ جہاں جانا چاہتے ہیں چلے جائیں، ہم آپ کو کونسا روک رہے ہیں؟'' میں نے تھوڑے تیز لہجے میں کہا اور بھاگتے ہوئے ان کے قریب چلا گیا۔

''مجھے اغوا کر کے کون لایا ہے؟ تم لائے ہو یا پھر کوئی اور ادھر لا کر چھوڑ گیا ہے؟'' انہوں نے بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے گاڑی میں ایک بار دیکھا بھی تھا لیکن پھر بھی شاید پہچاننے میں ناکام رہے تھے۔

''جی! میں ہی آپ کو افغانستان سے اغوا کر کے ادھر لایا ہوں۔'' میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''کیا تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟'' وہ چلتے چلتے رک گئے۔

''نہیں! نہیں سر! میں آپ کو مارنا نہیں چاہتا، میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں، محبت بھی کرتا ہوں۔ آپ ایک عظیم ترین ملک کے عظیم ترین انسان ہیں، میں آپ کو مارنا نہیں چاہتا۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے جی! عزت بھی کرتے ہو اور محبت بھی کرتے ہو تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟ تم نے اتنا بڑا خطرہ مول لیکر مجھے اغوا کیا ہے تو اس کا کوئی مقصد بھی ہوگا؟'' وہ ابھی تک مسلسل چل رہے تھے۔

''کتنے پیسے چاہئیں تم کو میرے تاوان میں؟ یا پھر تمہارا تعلق طالبان یا القاعدہ کے کسی گروپ سے ہے اور میرے بدلے میں اپنے کچھ قیدی رہا کروانے ہیں؟'' انہوں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''صدر صاحب! نہ مجھے پیسہ چاہئیں اور نہ ہی میرا تعلق کسی طالبان یا القاعدہ گروپ سے ہے۔'' ہم دونوں اب ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

''نہ تم مجھے مارنا چاہتے ہو اور نہ ہی پیسہ چاہتے ہو۔۔۔تمہارا تعلق کسی بھی دہشت گرد تنظیم سے بھی نہیں ہے تو پھر مجھے ادھر کیوں اغوا کر کے لائے ہو؟'' انہوں نے بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ان کے چہرے پر اب تھکاوٹ کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

''آپ مجھے تھکے ہوئے نظر آ رہے ہیں، اگر مناسب سمجھیں تو کچھ دیر بیٹھ کر ستا لیتے ہیں؟ کچھ دیر باتیں بھی ہو جائیں گی اور تھکاوٹ بھی اتر جائے گی۔صرف پانچ دس منٹ۔۔۔اس کے بعد پھر چلنا شروع کر دینا۔میں آپ کو روک تو نہیں رہا! آپ جدھر بھی جانا چاہتے ہیں چلے جائیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگے۔

''تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ کسی پولیس یا آرمی سے بھی نہیں ڈرتے ہو؟ یہاں پر کوئی بھی آ سکتا ہے۔'' وہ ابھی تک چل رہے تھے۔

''صدر صاحب! آپ اس وقت صحرا کے بالکل بیچوں بیچ موجود ہیں۔ یہاں سے شہری آبادی کم سے کم بھی 100 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔صحرا میں 100 کلومیٹر کا فاصلہ ایک ہزار کلومیٹر ہوتا ہے اور کوئی بھی انسان اسے عبور نہیں کر سکتا۔آپ جتنا مرضی زور لگا لیں کبھی بھی اس صحرا سے ہماری مرضی کے بغیر باہر نہیں نکل سکتے۔گرمی اور پیاس آپ کو دو دن بھی نہیں جینے دے گی۔ جبکہ اس صحرا کو عبور کرنے کے لئے آپ کو کم از کم 30 دن یعنی ایک مہینہ چاہیے۔ یہ ناممکن ہے اور آپ کبھی بھی یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔'' میں نے ان کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو وہ رک گئے۔

''ٹھیک ہے! میں پہلے رک کر تمہاری بات سن لیتا ہوں پھر آگے کی سوچوں گا۔'' میں انہیں لیکر ایک جھاڑی کے قریب بیٹھ گیا۔

سورج بہت نیچے چلا گیا تھا اور اسی لئے جھاڑیاں بھی اب سایہ فراہم کرنے لگیں تھیں۔ دوپہر کو جب سورج سر پر ہوتا ہے تو ان جھاڑیوں کا سایہ ختم ہو جاتا ہے اور چھاؤں کے لیے کسی بڑے درخت کا سہارہ لینا

پڑتا ہے۔ جبکہ اس وقت عام جھاڑیاں بھی چھاؤں کے لیے کافی تھیں۔

''جی تو لڑکے! اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟ مجھے اغوا کرنے کے پیچھے تمہارے کیا مقاصد ہیں؟'' ہم دونوں ایک جھاڑی کے سائے میں بیٹھ گئے تو وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔

''سر! آپ کو رومن سلطنت، عثمانی سلطنت اور برٹش راج کا پتہ ہے؟'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میں نے ان تینوں تہذیبوں کے بارے میں پڑھا ہے۔'' انہوں نے مختصراً جواب دیا۔

''کیا آپ کو پتہ ہے کہ کتنی بڑی بڑی سلطنتیں تھیں اور آج کے دور کے کون کون سے ممالک ان سلطنتوں کا حصہ تھے؟'' میں نے ایک بار پھر سوال کیا۔

''نہیں! مجھے پوری تفصیل کا تو علم نہیں ہے لیکن پھر بھی میں کافی کچھ جانتا ہوں۔ تمہارے کہنے کا مقصد کیا ہے؟'' اس بار الٹا انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔

''سر! رومن سلطنت میں آج کے 48 ممالک شامل ہیں۔ ترکی کی عثمانی سلطنت میں 23 ممالک جبکہ سب سے جدید ترین برٹش سلطنت میں 58 ممالک شامل تھے۔ انگلینڈ دنیا کے چوبیس فیصد حصے پر حکومت کرتا تھا جبکہ مسلمانوں کی حکومت ایشیا سے لیکر یورپ تک پھیلی ہوئی تھی۔'' میں نے ان کو پوری تفصیل بتائی۔

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔۔۔ یہ سب کچھ مجھے بتانے کا مقصد کیا ہے؟'' وہ ابھی تک میری بات کا مقصد نہیں سمجھے تھے۔

''میں ایسی ہی ایک سلطنت دوبارہ چاہتا ہوں!'' میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ تم پاگل ہو جو آج کے جدید دور میں ایسی ناممکن بات کر رہے ہو؟'' انہوں نے حیرت سے اچھلتے ہوئے کہا۔

''جی سر! میں یہی چاہتا ہوں۔۔۔ ایک بہت بڑی ریاست جو ایشیا سے لے کر امریکہ تک پھیلی ہوئی ہو۔'' میں نے دور آسمان پر ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھتے ہوئے کہا جو آہستہ آہستہ مغرب کی طرف نیچے ہو رہا تھا۔

''او مائی گاڈ! تم واقعی کوئی بہت بڑے بے وقوف ہو۔۔۔انتہا درجے کے جنونی، اب واقعی مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔'' وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور دوبارہ آگے کی طرف سفر کرنے لگے۔

''کیوں سر؟ کیا ایسا ممکن نہیں ہے؟'' میں بھی اٹھ کر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''علی نام ہے میرا! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟'' میں نے انہیں اپنا نام بتایا اور دوبارہ ان سے پوچھنے لگا۔

''نہیں! یہ ناممکن ہے۔ دنیا میں 200 سے اوپر ممالک اور دو ہزار (2000) سے اوپر زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اتنی ہی قومیں اس دنیا میں آباد ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان پر ایک ہی ملک حکومت کرے؟ یہ ناممکن ہے۔'' انہوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''سر! یہ دنیا تباہ ہو رہی ہے، ایک ملک دوسرے ملک کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ اگر اس نفرت پر قابو نہ پایا گیا تو ایک دن سارے ہی مارے جائیں گے۔'' ہمارے سامنے ریت کا ایک اونچا ٹیلہ آ گیا تھا۔ ہم اس کے اوپر چڑھنے کی بجائے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دوسری طرف نکلنے لگے۔

صحرا میں یہی سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے۔ ہم بالکل سیدھا ٹیلہ عبور کرنے کی بجائے نسبتاً کم اونچائی والی جگہ کی طرف جاتے ہوئے ٹیلہ عبور کرتے ہیں۔ اس سے ہماری سمت میں بہت تھوڑی تبدیلی آ جاتی ہے جو آگے جا کر پوری سائیڈ ہی تبدیل کر دیتی ہے۔ صحرا میں ہر طرف ریت ہی ریت بکھری ہوتی ہے اور یہاں پر سمتوں (Direction) کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ آدمی مشرق کی طرف جا رہا ہوتا ہے لیکن ایسے ہی چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کو بچاتا ہوا وہ شمال کی طرف جا نکلتا ہے۔

''سر! ہم میں سے کسی کو تو آگے بڑھ کر کچھ کرنا ہو گا؟ اگر ہم سب ہی ایک دوسرے سے لڑتے رہے تو یہ دنیا ہی ختم ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں علی! جو کچھ تم کہہ رہے ہو ایسا فلموں اور کتابوں میں تو ہو سکتا ہے، خوابوں میں بھی ہو سکتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔ کوئی بھی ملک کسی دوسرے ملک کے زیر نگیں نہیں رہ سکتا۔ آزادی ہی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ دنیا کو بچانے کے چکر میں ہم دنیا ہی تباہ کر بیٹھیں گے۔'' انہوں نے انتہائی سیریس ہو کر کہا۔

''سر! ایک غریب آدمی کے لیے روٹی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ آزادی اور غلامی کا تصور صرف بڑے اور امیر لوگوں کو ہی ہوتا ہے۔ غریب اور بھوکے لوگوں کے لیے صرف دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کے لیے ایک گھر ہی سب سے بڑی حقیقت ہوتی ہے۔'' میں ابھی تک اپنی بات پر قائم تھا۔

''مسٹر علی! اصل لڑائی تو امیر اور پیٹ بھرے ہوئے لوگوں سے ہونی ہے۔ اصل طاقت تو حکمرانوں کے پاس ہوتی ہے اور وہ لوگ کبھی بھی اپنے ہاتھ سے حکومت نہیں جانے دیں گے۔ آزادی اور غلامی کی جنگ لڑنے والے تو یہی بھوکے اور غریب لوگ ہوں گے لیکن ان کو لڑانے والے حکمران ہوں گے۔'' ہمیں گھر سے نکلے ہوئے ایک گھنٹے کے قریب ہوگیا تھا۔ ان کے پاؤں اب لڑکھڑانے لگے تھے۔

''سر! ایک بڑے مقصد کے لیے قربانیاں تو دینی پڑتی ہیں نا؟ ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے۔۔۔ اگر نیت صاف ہوگی تو خدا بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔ وہ ریت پر بیٹھے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی ریت پر بیٹھ گیا۔

''مسٹر علی! تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔۔۔ سیاست اور حکومت کا تمھیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔ یہ آگ ہے آگ، اگر کہیں غلطی ہوگئی تو پوری دنیا ہی جل کر راکھ ہو جائے گی۔'' ریت پر چلتے چلتے تھکاوٹ اور پیاس سے ان کا برا حال ہوگیا تھا اور وہ ریت پر لیٹ گئے۔

''اگر آپ نے کوشش پوری کر لی ہے تو واپس چلتے ہیں؟'' میں نے مزید گفتگو کا ارادہ ترک کر دیا۔

''میں نے اب تک کتنا سفر کیا ہے اور کتنا باقی ہے، کیا تم سچ میں بتا سکتے ہو؟'' انہوں نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

''جی! کیوں نہیں بتا سکتا، ابھی تک آپ نے صرف ایک کلومیٹر کا سفر کیا ہے جبکہ باقی ابھی 99 کلومیٹر کا سفر باقی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں! تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔

''نہیں سر! میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ نے ابھی تک صرف ایک کلومیٹر ہی سفر کیا ہے اور باقی 99 کلومیٹر باقی ہیں۔ ویسے بھی یہ سمت انڈیا کی طرف جاتی ہے اور آپ انڈین بارڈر کی طرف جا رہے ہیں۔ اس طرف اگر آپ کسی طریقے سے صحرا کو عبور بھی کر لیتے ہیں تو آگے انڈین بی ایس ایف (BSF) والے بارڈر پر ہی گولی مار دیتے ہیں۔'' میں نے انہیں ڈراتے ہوئے کہا۔

''اب تم واقعی جھوٹ بول رہے ہو، بغیر تصدیق کے وہ ایسے ہی کسی نہتے آدمی پر کیسے گولی چلا سکتے

ہیں؟'' وہ ابھی تک ریت پر لیٹے سستا رہے تھے۔

''سر جی! یہ یورپ کے کسی ملک کا بارڈر نہیں ہے بلکہ انڈیا اور پاکستان کا بارڈر ہے۔ یہاں سب کچھ چلتا ہے۔آپ کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوا ہے کہ آپ نہتّے ہو۔آپ کے پاس کوئی اسلحہ یا بم بھی نہیں ہے تو بھی کوئی فوجی آپ کے نزدیک آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔وہ آپ کو ایک خودکش بمبار ہی سمجھیں گے۔ بی ایس ایف (BSF) نے نہ مارا تو رینجر والے مار دیں گے۔دس بارہ گھنٹے تک آپ کی لاش بارڈر پر پڑی رہے گی۔ اس کے بعد جب انہیں مکمل تسلی ہو جائے گی کہ کوئی دھماکہ نہیں ہوا ہے تو پھر بم سکواڈ والے ہی آکر آپ کی لاش کو مکمل کلیئر کر کے اٹھائیں گے۔ یہاں انسانیت کی بجائے زمین کی اہمیت ہے۔زمین کے ایک انچ کا ٹکڑا بھی دشمن ملک لیکر نہیں جا سکتا۔انسان چاہے آپ 100 مار کر لے جاؤ کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہوا اور انہیں ہاتھ سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

''کیا ارادہ ہے؟ اب بھی آگے بڑھنا ہے یا واپس جانا ہے؟'' میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لو سر جی! گھر سے جتنا دور جاؤ گے واپسی میں اتنی ہی تکلیف ہوگی۔ یہاں کوئی سواری نہیں ہے جو آپ کو اٹھا کر لے جائے، واپسی بھی آپ کو پیدل ہی جانا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے ایک بار کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ کر دیکھنا ہے،شاید کوئی آبادی نظر آ جائے۔'' انہوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور ایک اونچے ٹیلے کی طرف چلنے لگے۔ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

تقریباً 15 منٹ کی مسلسل چڑھائی کے بعد ہم ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ گئے۔انہوں نے ٹیلے پر چڑھ کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہر طرف ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی۔ وہاں سے بالکل سیدھا نشیب میں ہمارا ٹوبہ (تالاب) اور گھر نظر آ رہے تھے۔

''او مائی گاڈ! پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے سفر کر رہا ہوں اور ابھی تک اتنا ہی دور آیا ہوں؟'' ان کی نظر ٹوبے پر پڑی تو وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''میں نے بولا ہے صدر صاحب! آپ کبھی بھی اس صحرا کو عبور نہیں کر سکتے۔اگر اکیلے یا چوری چھپے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کریں گے تو یقین کریں، آپ مارے جائیں گے۔ہمیں آپ کی ضرورت ہے، آپ کو جان سے مار کر ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا اور نہ ہی ہم برے لوگ ہیں۔'' میں نے ان کا ہاتھ

پکڑتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ! برے لوگ نہیں ہو تو پھر مجھے کیوں اغوا کر کے ادھر لائے ہو؟ پتہ نہیں کتنے لوگ تم نے مجھے اغوا کرنے میں مار دیئے ہوں گے۔ میرے جہاز کو بھی میزائل لگا تھا، شاید وہ بھی سارے مارے گئے ہوں گے۔'' انہوں نے غصے سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

''نہیں سر! وہ سب محفوظ ہیں۔۔۔ان میں سے کوئی بھی نہیں مرا ہے، میں دہشت گرد نہیں ہوں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''پھر بھی مجھے تم لوگوں نے اتنی آسانی سے تو اغوا نہیں کر لیا ہوگا، کچھ نہ کچھ جانی نقصان تو ہوا ہی ہوگا؟'' وہ ابھی تک اپنے لوگوں کے لیے فکر مند ہو رہے تھے۔

''مجھے ابھی تک زیادہ معلومات نہیں ہیں، سافی شہر گیا ہوا ہے وہ واپسی پر پوری تفصیل لے کر آئے گا تو ہی آپ کو بتا سکوں گا۔'' میں نے کہا۔

''پھر بھی تھوڑی بہت تفصیل تو تم کو پتہ ہی ہوگی آخر؟'' انہوں نے اصرار کرنا شروع کر دیا۔

''آپ کو اغوا کرنے کے لیے بہت بڑی جنگ لڑی گئی ہے۔اس میں کم از کم دونوں طرف کے 200 سے زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔سیکورٹی، پولیس اور آرمی کا زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے۔بیس پچیس افراد ہی مرے ہوں گے۔طالبان کا بہت نقصان ہوا ہے، ان کے دونوں گروپ ہی ادھر ختم ہو گئے تھے۔پاک افغان بارڈر پر بھی جنگ ہوئی ہے اور ادھر بھی کچھ نقصان ہوا ہے۔'' میں نے اس بار سچ بولتے ہوئے کہا۔

''لڑکے! تم نے واقعی بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔یو ایس اے (USA) گورنمنٹ کبھی بھی تمہارا کوئی ایک بھی مطالبہ نہیں مانے گی۔'' ان کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''سر جی! آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔یہ میرا اور امریکہ کا معاملہ ہے، آپ بس خاموشی سے تماشہ دیکھو۔'' ہم دونوں آہستہ آہستہ ٹیلے سے نیچے اترنے لگے۔

''کیا بات ہے تمہاری۔۔۔ مجھے ہی تو فکر مند ہونا چاہیے نا؟ امریکہ تمہارے مطالبات نہیں مانے گا تو تم مجھ پر تشدد کرو گے اور ایسے ہی تشدد کرتے کرتے ایک دن مار بھی دو گے؟ ظاہر ہے تمہاری اس رومن سلطنت نے دوبارا بننا تو ہے نہیں۔'' انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''سر جی! آپ کو کوئی یہاں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔آپ ہمارے مہمان ہو اور آپ کو ایک مہمان کی

طرح عزت ملے گی۔'' میں انہیں تسلی دے رہا تھا۔
''اگر تمہارے مطالبات پورے نہ ہوئے تو پھر کیا کرو گے؟ مجھے جان سے نہیں مارو گے؟'' وہ ابھی تک فکر مند ہی تھے۔
''نہیں سر جی! آپ کی زندگی کی میں گارنٹی دیتا ہوں۔ مجھے یہاں آپ کو صرف ایک سال رکھنا ہے۔ اس ایک سال میں اگر میرا کام ہو گیا تو ٹھیک ہے۔۔۔۔ مجھے میری منزل مل جائے گی۔ اگر نہ ہو سکا تو کوئی بات نہیں، میں نے کم از کم کوشش تو کی ہو گی۔ کامیابی اور ناکامی تو اس خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ سب کی محنت کا صلہ دیتا ہے۔'' میں نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''کیا تم مجھے جان سے نہیں مارو گے؟'' وہ چلتے چلتے اچانک رک گئے۔
''جی سر! میں کامیاب ہوتا ہوں یا ناکام، اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہو گا۔ ٹھیک ایک سال بعد میں آپ کو آزاد کر دوں گا۔ آپ ایک سال تک کے لیے ہمارے مہمان ہیں اور ایک سال کے بعد ہم آپ کو امریکن ایمبیسی میں چھوڑ کر آجائیں گے۔'' میں نے اپنے ساتھ آنے والے لڑکوں میں سے ایک سے پانی کی بوتل لی اور اسے ان کی طرف بڑھایا۔ پانی کا گدلا پن پلاسٹک کی بوتل سے باہر نظر آ رہا تھا۔
''یہ کیا ہے، کوئی شربت وغیرہ ہے؟'' انہوں نے بوتل کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پانی میں ریت کی آمیزش کی وجہ سے وہ تھوڑا گہرا کلر دے رہا تھا اور انہوں نے اسے کوئی شربت وغیرہ سمجھا تھا۔
''نہیں سر! یہ کوئی شربت نہیں ہے بلکہ یہ سادہ پانی ہی ہے۔ ریگستان میں پانی اسی رنگ کا ملے گا، اس میں مٹی ہوتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو انہوں نے بوتل کو واپس میرے ہاتھ میں دے دیا۔
''نہیں! میں اسے نہیں پی سکتا۔ مٹی والے پانی سے میں بیمار ہو جاؤں گا، مجھے پینے کے لیے صاف پانی چاہیے۔'' انہوں نے اس پانی کو پینے سے انکار کر دیا۔
''سر جی! یہاں آپ کو ایسا ہی پانی ملے گا۔ ہم سب یہی پانی پیتے ہیں اور کبھی بھی کوئی بیمار نہیں ہوا۔ بے فکر ہو کر پیو، آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔'' میں نے دوبارہ ان کی طرف بوتل بڑھائی۔
''نہیں! میں پیاسا ہی ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے بوتل کو ہاتھ بھی لگانا گوارہ نہ کیا۔
''آپ کی مرضی ہے سر! ابھی نہیں پینا ہے تو بعد میں پی لینا، یہاں پر تو اب یہی دستیاب ہو گا۔ جتنی جلدی عادت ڈال لو گے اتنا ہی آسان ہو گا۔'' میں نے اپنے پیچھے آنے والے باقی لڑکوں پر نظر ڈالی اور صدر

صاحب کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگا۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ہم بھی گاؤں میں پہنچ گئے۔ گاؤں کے صرف دو تین گھروں میں ہی روشنی ہو رہی تھی جبکہ باقی سبھی لوگ اپنے اپنے جھونپڑوں میں چلے گئے تھے۔ یہاں پانی کے ساتھ ساتھ تیل کی بھی کمی تھی، بلکہ اس گاؤں میں تیل تھا ہی نہیں۔ بھیڑوں کے دودھ سے ہم لوگ مکھن اور گھی بناتے تھے۔ یہاں اس علاقے میں دودھ اور گھی وغیرہ بیچا نہیں جاتا تھا۔ گاؤں میں 15 تو گھر تھے اور سبھی کے پاس بھیڑ بکریاں تھیں۔ گاؤں میں دودھ اور گھی وافر مقدار میں تھا لیکن کوئی بھی خریدنے والا نہیں تھا۔

ہمیں نزدیک ترین شہر بہاولپور پڑتا تھا جو یہاں سے 150 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اتنا ہی فاصلہ جیسل میر (Jaisal Mer) کا بھی تھا۔ مگر اس طرف ہم نہیں جا سکتے تھے کیونکہ وہ انڈین علاقہ تھا۔ بہاول پور پنجاب کا سب سے بڑا اور سب سے غریب ترین ضلع ہے۔ یہاں اس شہر میں کوئی فیکٹری، کوئی کارخانہ نہیں ہے۔ چھوٹا سا شہر ہے اور یہاں رہنے والے تقریباً سارے ہی شہری یا تو گورنمنٹ کے سرکاری ملازم ہیں یا پھر بہاولپور کے ہی دیہی علاقوں سے اٹھ کر شہر آئے ہوئے لوگ ہیں۔ بہاولپور میں کالج، یونیورسٹی، میڈیکل کالج اور بہت بڑا ہسپتال ہے۔ یہاں کی ساری شہری آبادی یا تو تعلیم کی غرض سے یہاں آتی ہے (بچے کالج میں پڑھتے ہیں تو والدین بھی بچوں کے ساتھ ہی شہر میں آجاتے ہیں)۔

ہسپتال اور میڈیکل کالج سے یہ مت سمجھیں کہ یہاں تو بہت ترقی ہے۔ یہ ساری سہولتیں پاکستان بننے سے پہلے کی ہیں۔ جب بہاول پور ایک آزاد ریاست تھی اور یہاں نواب حکمران تھے۔ بہاول وکٹوریہ ہسپتال (Bahawal Victoria Hospital) پاکستان کے چند بڑے ہسپتالوں میں سے ایک ہے اور اس کے نام سے ہی آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ انگریزوں کے زمانے میں انگریزوں کے تعاون سے بنا ہے۔ یہ 1876 میں بنایا گیا تھا اور آج اسے بنے ہوئے 140 سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔

بہاول پور کے دو بڑے تعلیمی ادارے صادق ڈین کال (SD College) اور صادق پبلک سکول (Sadiq Public) دونوں پاکستان بننے سے پہلے کے ہیں اور انہیں بھی بنے ہوئے 100 سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ جنوبی پنجاب میں بنا ہوا نہری نظام جسے دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام کہتے ہیں، وہ بھی انگریزوں کا بنایا ہوا ہے۔ میں کوئی طنز نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں صرف اتنا عرض کر رہا ہوں کہ ہم انگریز سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔ مغلوں نے ایک ہزار سال تک ہندوستان پر حکومت کی اور ہمیں شاہی قلعہ، تاج محل

اور لال قلعہ جیسی عمارتیں ہی بنا کر دیں جبکہ انگریز اس علاقے پر صرف 100 سال رہا اور ہمیں ایک مکمل نظام حکومت دے کر گیا۔ آرمی، ائیر فورس اور پولیس کے محکمے اسی انگریز کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان محکموں کی تعداد بھی درجنوں میں ہے جو انگریز اس ہندوستان کو دے کر گئے ہیں۔ پھر بھی ہم لوگ انگریز سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟

بہاولپور چونکہ ایک چھوٹا اور غریب شہر ہے اس لیے یہاں دودھ اور گھی کی کوئی مارکیٹ نہیں ہے۔ یہاں پانچ سات کلو دودھ ہو تو وہ آپ بیچ سکتے ہو لیکن اگر آپ کے پاس 100 کلو سے اوپر دودھ ہو تو پھر اس کو بیچنے کے لیے آپ کو کوئی مارکیٹ ہی نہیں ملے گی۔ اس کے لیے ہمیں بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بہاولپور شہر میں ایک کمپنی تھی جو سستے داموں دودھ خریدتی تھی، جو ہم روزانہ دودھ یہاں لا سکتے۔ صحرا کی گرمی میں دودھ خراب ہو جاتا ہے اس لیے ہم دودھ کو سٹور بھی نہیں کر سکتے اور اس سے مکھن اور گھی بنا لیتے ہیں۔

چونکہ مکھن اور گھی بہاولپور میں کوئی بھی نہیں خریدتا اس لئے مکھن اور گھی ہم گھروں میں ہی استعمال کر لیتے ہیں۔ دودھ اور مکھن کو ہم روٹی کے ساتھ استعمال کر لیتے ہیں۔ گھی کو ہنڈیا میں سالن بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس گھی سے دیے بھی جلائے جاتے ہیں۔ یہاں بجلی وغیرہ نہیں تھی اور مٹی کا تیل بھی بہت مہنگا تھا۔ ہم شہر سے مٹی کا تیل خرید کر نہیں لا سکتے تھے اس لیے مٹی کے تیل کی بجائے یہاں گھی سے چراغ روشن کیے جاتے تھے۔ گاؤں کے تقریباً سبھی لوگ رات ہونے سے پہلے پہلے کھانا وغیرہ کھا کر لیٹ جاتے تھے۔ وہ اپنے سارے کام رات ہونے سے پہلے پہلے کر لیتے تھے اور رات کو ان کو چراغ بھی روشن کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

ہم گاؤں میں پہنچے تو چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں پہنچتے ہی ایک بار پھر پورا گاؤں ہی وہاں پہنچ گیا اور انہیں دیکھنے لگا۔ عریج نے دو چراغ اکھٹے جلا کر جھونپڑے کے اندر رکھ دیئے تھے جبکہ جھونپڑے کے باہر بھی ایک چراغ پڑا ہوا تھا۔ وہ آتے ہی جھونپڑے میں گھسے اور بستر پر گر گئے۔ یہاں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ تین چارپائیاں تھیں، ایک ایک میرے اور عریج کے لئے جبکہ تیسری چارپائی ہم نے صدر صاحب کے لیے بنائی تھی۔ ہم بیری کی لکڑی سے چارپائی کے پائے اور باقی بناتے تھے جبکہ اندر پرانے کپڑوں کو پھاڑ کر ان سے رسیاں بنائی جاتی تھیں اور پھر ان رسیوں سے چارپائی بُنی جاتی تھی۔ جنوبی پنجاب کے تقریباً ہر دوسرے گھر میں آپ کو ایسی ہی چارپائیاں نظر آئیں گی۔

ہمارے مہمان ایک چارپائی پر پڑے ہانپ رہے تھے جبکہ گاؤں کے لوگ باری باری آ کر انہیں دیکھتے اور مجھ سے خیریت پوچھ رہے تھے۔

''علی! مجھے پیاس لگی ہے۔ پلیز! مجھے پانی دو!'' وہ کچھ دیر تک لیٹے رہے تو ان کی تھکاوٹ تھوڑی کم ہوئی اور انہیں پیاس دوبارہ محسوس ہونے لگی۔ میں نے وہی بوتل دوبارہ ان کی طرف بڑھا دی۔

''علی! میں یہ پانی نہیں پی سکتا، مجھے صاف پانی چاہیے۔'' انہوں نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

''سر جی! جس علاقے میں آپ ابھی ہیں یہاں یہ بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ شکر کرو کہ آپ کو یہی پانی مل رہا ہے۔ ورنہ اس ریگستان میں لاکھوں لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں یہ گدلا پانی بھی میسر نہیں ہے۔'' میں نے بوتل ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''یار! میں اس ماحول کا عادی نہیں ہوں، مجھے یہ پانی ہضم نہیں ہوگا۔'' وہ ابھی تک بوتل لینے سے ہچکچا رہے تھے۔

''سر جی! آپ کو یہاں لایا ہی اس لیے گیا ہے تاکہ آپ کو بھی ہم لوگوں کے درد کا احساس ہو۔ دنیا کی 90 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے جبکہ صرف 10 فیصد لوگ ہی خوشحال اور مطمئن ہیں۔ اگر ایک سال ادھر ہمارے ساتھ رہو گے تو آپ کو بھی اندازہ ہو جائے گا۔ سر جی! یہاں زندہ رہنا ہی سب سے بڑی عیاشی ہے۔ ہم لوگ صبح سے شام تک زندہ رہنے کے لیے ہی محنت کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کے پاس تو بنیادی ضرورتیں بھی نہیں ہیں۔ ایک سال ادھر ہمارے ساتھ رہو اور پھر واپس چلے جاؤ۔۔۔ ہمارے ساتھ رہتے ہوئے اگر ہم نے آپ کے ذہن کو بدل دیا تو یہ ہماری فتح ہوگی ورنہ ابھی بہت زندگی باقی ہے، ہم کسی اور مسیحا کی تلاش میں نکل پڑیں گے۔'' انہوں نے ایک نظر میرے چہرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے میرے ہاتھ سے بوتل پکڑی اور اس کا ڈھکن کھول کر منہ سے لگا لیا۔ پہلا گھونٹ بھر کر اسے حلق سے نیچے اتارنا چاہا لیکن وہ ناکام رہے اور انہوں نے اسے زمین پر اگل دیا۔

''نہیں یار! میں اسے نہیں پی سکتا، یہ تو بہت نمکین ہے۔'' انہوں نے بوتل مجھے واپس پکڑاتے ہوئے کہا۔

''یہاں روہی میں زیادہ تر پانی نمکین ہی ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے! میں دوبارا ٹرائی کرتا ہوں، ویسے بھی مجھے بہت پیاس لگی ہوئی ہے۔'' انہوں نے بوتل

واپس پکڑی اور ایک بار پھر چھوٹا سا گھونٹ بھر کر اسے حلق سے نیچے اتارنے لگے اور اس بار وہ کامیاب ہو گئے۔

وہ پانی کا ایک گھونٹ بھرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پانی کے ایک گھونٹ نے ان کی پیاس کی شدت کو مزید بڑھا دیا اور انہوں نے آہستہ آہستہ مزید چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے شروع کر دیئے۔ اگلے دو تین منٹ تک وہ آدھی بوتل پی چکے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر باقی بوتل ان سے لے لی۔

''زیادہ پانی مت پیئیں سر! ابھی آپ پہلی پہلی بار یہ پانی پی رہے ہیں اس لیے آپ کا پیٹ اسے قبول نہیں کرے گا اور آپ کا پیٹ خراب ہو جائے گا۔'' میں نے بوتل کو ڈھکن لگایا اور اسے عرتج کو پکڑا دیا۔

''مجھے اب بہت تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے، میں اب سونا چاہتا ہوں۔ باتھ روم کدھر ہے؟ مجھے ایک بیڈ دے دینا جہاں میں سو سکوں۔'' انہوں نے مجھ سے کہا تو میں انہیں لے کر جھونپڑے سے باہر آ گیا۔ میں انہیں ساتھ لے کر گاؤں سے باہر آ گیا۔ وہاں آ کر میں نے انہیں ایک ٹیلے کی اوٹ میں جا کر بیٹھنے کو کہا۔

''کیا؟ یہاں کوئی باتھ روم نہیں ہے؟ مجھے کھلے میں ہی بیٹھنا پڑے گا؟'' چاند کی سفید روشنی صحرا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

''نہیں! میں یہ نہیں کر سکتا۔ چلو! واپس چلتے ہیں۔'' وہ واپس پلٹ آئے۔

''کوئی بات نہیں سر! آپ کو جب بھی ضرورت ہو مجھے آواز دے دینا، میں چوبیس گھنٹے آپ کی خدمت میں حاضر رہوں گا۔'' میں نے ان سے کہا۔

''علی صاحب! کم از کم ایک ٹائلٹ تو بنوا ہی سکتے تھے نا؟ اس کے لیے کونسی سائنس کی ضرورت ہوتی ہے؟'' انہوں نے غصے سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''سر! یہ سارا ریگستان ہی ٹائلٹ ہے، لوگ کھلے میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں اور ویسے بھی ہمارے پاس پانی نہیں ہے۔ پانی کے بغیر ٹائلٹ نہیں بن سکتا۔'' ہم دونوں واپس گھر آ گئے۔

ریگستان میں دن کو گرم ہوا چلتی ہے جسے ہم لو کہتے ہیں۔ اس سے بچنے کے لئے دوپہر کو اندر کمرے میں لیٹتے ہیں۔ جبکہ رات کو کھلے آسمان تلے لیٹنا آسان ہوتا ہے۔ بارہ بجے تک بہت زیادہ گرمی پڑتی ہے اور حبس انتہائی زیادہ ہوتی ہے۔ اس قدر حبس اور گرمی میں سونا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بارہ بجے کے بعد ریت ٹھنڈی سی ہونا شروع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے درجہ حرارت گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ دن کو جتنی زیادہ گرمی پڑتی ہے

رات کو اتنی ہی سردی ہو جاتی ہے۔ رات کے پچھلے پہر بہت خوشگوار ہوا چلتی ہے اور نیند بھی بہت میٹھی آتی ہے۔ مچھر اور مکھیاں روہی کے اندر بالکل نہیں ہیں۔ اس قدر گرمی میں مچھر اور مکھیاں دونوں مرجاتی ہیں۔ مچھر ہمیشہ کھڑے پانی پر ہی ہوتا ہے اور یہاں انسانوں کے لیے پینے کا پانی نہیں ملتا تو مچھروں کو بیٹھنے کیلئے کہاں ملے گا۔

ہم دونوں گھر پہنچے تو عریج نے چار پائیاں لگا دی تھیں اور کھانا بھی گرم کر دیا تھا۔ روٹی کے ساتھ بھیڑ کا گوشت جسے دیسی گھی میں تیار کیا گیا تھا، بہت مزیدار بنا ہوا تھا۔ ہمارے مہمان نے شروع شروع میں تو کچھ نخرے دکھائے لیکن پھر دو تین نوالے کھانے کے بعد انہیں بھی کھانے کا ذائقہ کافی پسند آیا اور انہوں نے اچھی طرح سیر ہو کر کھانا کھایا۔ یہاں گوشت تو گھر کا ہوتا ہے اس لیے ہر دوسرے دن گوشت ہی پکتا تھا یا پھر دال پکتی تھی۔ سبزیاں صرف شہر سے آتی تھیں اور وہ بہت تھوڑی مقدار میں ہوتی تھیں۔ مہینے میں دو تین بار ہی سبزی پکائی جاتی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم سب اپنی اپنی چار پائیوں پر لیٹ گئے۔ گرمی کا زور ابھی تک ٹوٹا نہیں تھا۔ وہ چار پائی پر لیٹتے ہی پھر چلانے لگے۔ میں نے ایک بڑی پنکھی اُٹھائی اور اس سے انہیں ہوا دینے لگا۔ دیہاتوں میں رہنے والے اس پنکھی سے خوب واقف ہوں گے۔ پاکستان میں بجلی کے جیسے حالات ہیں ان حالات میں تو شاید پورا ملک ہی ہاتھ سے چلنے والی پنکھی سے واقف ہو گا۔

''تم کیا کر رہے ہو؟'' وہ چار پائی پر اٹھ کر بیٹھنے لگے تو میں نے انہیں منع کر دیا۔

''نہیں سر! آپ لیٹے رہیں اور سونے کی کوشش کریں، میں آپ کو ہوا دیتا رہوں گا۔'' میں پنکھی سے انہیں ہوا دے رہا تھا۔

''نہیں! یہ مت کرو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' انہوں نے مجھے منع کر دیا۔

''کوئی بات نہیں ہے سر! آپ ہمارے لیے معزز ہو اور آپ کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔'' میں بدستور انہیں ہوا دے رہا تھا۔

''نہیں یار! یہ واقعی ٹھیک نہیں ہے، عجیب سا غلامی کا تصور لگتا ہے۔ تم بھی میری طرح انسان ہو اور ایسے مجھے ہوا دیتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔'' ان کے اندر سے اچھے انسان کی آواز آئی۔

''بھائی! ادھر مجھے دے دو پنکھی، میں ہوا دیتی ہوں۔'' عریج میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''نہیں عریج! تم آرام سے سو جاؤ، میں انہیں ہوا دیتا رہوں گا۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے بھائی! آپ نے آج کا پورا دن سفر کیا ہے، آپ بہت تھک گئے ہونگے۔ اس لئے آرام کرلیں، میں انہیں پنکھی سے ہوا دیتی رہوں گی۔'' اس نے مجھ سے پنکھی پکڑ لی اور چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھ کر ہوا دینے لگی۔

''یار! تم لوگ کیا کررہے ہو؟ میں ٹھیک ہوں، ایسے میری چارپائی پر بیٹھ کر مجھے ہوا دو گے تو میں کبھی بھی نہیں سوسکوں گا۔'' انہوں نے عریج کو منع کرتے ہوئے کہا۔

''سر جی! آپ آرام سے آنکھیں بند کر کے لیٹ جائیں، ہم مزید آدھے گھنٹے تک ہوا دیں گے۔۔۔ جب سو جاؤ گے تو ہم بھی سو جائیں گے۔'' میں نے آہستگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ میں پچھلے دو دن سے مسلسل جاگتے ہوئے لڑ رہا تھا۔ مجھے گھنٹے دو گھنٹے کی نیند چاہیے تھی تا کہ میں فریش ہو جاؤں۔

''عریج! گھنٹے تک یہ سو جائیں گے تو مجھے اٹھا دینا، میں جاگ جاؤں گا تو پھر تم سو جانا۔'' میں نے عریج سے کہا اور چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ صدر ٹرمپ کو میں اغوا کر چکا تھا، دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور کے سب سے طاقت ور انسان کو اغوا کر کے اس ریگستان میں لانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مجھے ان کی حفاظت کرنی تھی، وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش ضرور کرتے۔

ریگستان بہت خطرناک ہوتا ہے۔ صحراؤں میں بھٹکا ہوا آدمی کبھی بھی زندہ واپس نہیں لوٹتا۔ وہ اگر بھاگنے کی کوشش کرتے تو مجھے ان کو صحرا میں جانے سے روکنا تھا اور اسی لئے میں جاگ کر پہرہ دینا چاہتا تھا۔ پچھلے دو دن سے چلنے والی لگاتار جدوجہد نے مجھے تھکاوٹ سے چور کر دیا تھا۔ میری ایک بار آنکھ لگی تو دوبارہ سافی کے جگانے سے ہی کھلی۔ عریج نے مجھے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مہمان صدر کے سوتے ہی اس نے پنکھی سے ہوا دینا بند کر دیا تھا اور چارپائی پر بیٹھ کر پہرہ دینے لگی تھی۔

سافی میرے سونے کے قریباً تین گھنٹے بعد آیا۔ اس نے آتے ہی مجھے جگا دیا۔ میں نے اس سے شہر کے حالات پوچھے، اس نے بتایا کہ باہر افغانستان میں بالکل جنگ کی سی کیفیت ہے اور اس جنگ کی تپش پاکستان تک آرہی ہے۔ ریگستان سے باہر پورے پاکستان میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ پاکستان آرمی اور پولیس نے پورے ملک کو جام کیا ہوا تھا اور ایک ایک گاڑی اور آدمی کو روک روک کر تلاشی لے رہے تھے۔ بہاولپور سے یہاں تک آتے ہوئے وہ دو بار راستے میں چیک ہوا تھا۔

''ویڈیو اپ لوڈ ہوگئی ہے؟'' میں نے آہستگی سے اسے پوچھا۔
''جی علی بھائی! ویڈیو اپ لوڈ ہوگئی ہے اور وہ اس وقت ہر چینل پر دکھائی جارہی ہے۔ میں نے موبائل پر کچھ ویڈیو ڈاؤن لوڈ کی ہیں۔'' اس نے جیب سے موبائل نکال کر مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔
ویڈیو میں نے بہت پہلے سے بنا دی تھی اور اٹلی میں راشد کے پاس تھی۔ یہ صدر ٹرمپ کے بغیر تھی اور اس میں صرف ان کے اغوا کی تصدیق اور خطابات بنائے گئے تھے۔ راشد کو جیسے ہی اسد نے اوکے کی رپورٹ دی اس نے ویڈیو کو اپ لوڈ کر دیا۔ اس نے بازار سے ایک نیا موبائل خریدا اور ایک جعلی جی میل اکاؤنٹ بنایا اور اس جی میل اکانٹ سے ویڈیو اپ لوڈ کر دی۔ اٹلی میں کیفے ٹیریا/ کافی شاپ میں فری انٹرنیٹ ہوتا ہے اور اس کی رینج بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی بھی آدمی کافی شاپ کے باہر کھڑا ہو کر انٹرنیٹ استعمال کرسکتا ہے۔ اس نے ویڈیو کو اٹالین اخبار کو بھیجا تھا اور موبائل کو ایک نالے میں پھینک دیا۔ ہم نے اپنی طرف آنے والا ہر راستہ بند کر دیا تھا۔
''جنرل مائیک کے بیٹے کی بھی کوئی خبر لگی ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں علی بھائی! اس کی کوئی خبر نہیں لگی ہے۔ CNN یا BBC پر شاید لگی ہو لیکن اس کا مجھے علم نہیں ہے۔۔۔ مجھے انگلش کی سمجھ نہیں آتی۔ لیکن پاکستانی میڈیا پر جنرل مائیک یا اس کے بیٹے کی کوئی خبر نہیں ہے۔''
جنرل مائیک کو بلیک میل کرنے کے لئے ہم نے اس کے بیٹے کو استعمال کیا تھا۔
یہاں روہی میں ایک خاص قسم کی جھاڑی ہوتی ہے جس کا کانٹا انسان کو مکمل طور پر مفلوج کر دیتا ہے۔ یہ بہت نایاب جھاڑی ہے جو صرف ادھر روہی میں ہی پائی جاتی ہے اور اس کے بارے میں صرف مقامی چرواہے ہی جانتے ہیں۔ مجھے اس جھاڑی کا پتہ چلا تو میں نے اس کے کانٹے کا لیبارٹری ٹیسٹ کروایا لیکن حیرت انگیز طور پر کچھ بھی نہیں نکلا۔ اس کا کانٹا جب کسی انسان یا جانور کو چبھویا جاتا ہے تو اسی وقت اس آدمی کا پورا جسم مفلوج ہو جاتا ہے اور اسے دنیا کا کوئی بھی علاج ٹھیک نہیں کرسکتا۔ اسی درخت کی جڑوں کو نکال کر کھانے سے بندہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ میں نے وہی کانٹا اٹلی میں طلحہ کو بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ اس جھاڑی کی جڑوں کو نکال کر اسے گرینڈ کر کے اس کا پانی نکال لیا تھا اور پانی کو بھی کانٹے کے ساتھ بھیجا تھا۔
جنرل مائیک کا اکلوتا بیٹا سترہ سال کی عمر کا ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ وہ بہت اچھا فٹ بالر تھا اور میلان شہر کی ٹیم کی طرف سے کھیلتا تھا۔ طلحہ ایک مہاجر کیمپ میں رہتا تھا۔ میلان فٹ بال کلب نے ایک

دوستانہ میچ ان مہاجرین کے ساتھ کھیلا تو طلحہ بھی یہ فٹ بال میچ کھیل رہا تھا۔ اس نے کھیل کھیل کے دوران ہی وہ کانٹا جنرل مائیک کے بیٹے کو چبھو دیا تھا اور وہ وہیں سے سیدھا ہسپتال چلا گیا۔ اٹلی اور پورے یورپ کے ڈاکٹروں نے سرتوڑ کوشش کر لی لیکن وہ ان کے بیٹے کو صحت یاب نہ کر سکے۔ طلحہ کو کانٹے چبھوتے ہوئے راشد نے اس کی موبائل سے ویڈیو بنا لی تھی اور وہ ویڈیو میرے پاس پاکستان بھیج دی تھی۔ میں نے اس ویڈیو کو بلگرام ائیر بیس کے اندر پہنچایا اور جنرل مائیک کو دکھا کر اسے بلیک میل کیا۔

جنرل مائیک نے ہی ہمیں ائیر بیس کے اندر کی ساری انفارمیشن دی تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو بچانے کے لئے اس نے ہمیں کچھ انفارمیشن دی تھی۔ اصل میں وہ بھی طاقت کے زعم میں مارے گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ امریکی صدر کے طیارے ائیر فورس ون کو کوئی بھی میزائل ہٹ نہیں کر سکتا۔ اس لئے انہوں نے بھی پوری انفارمیشن دے دی تھی اور دھوکے میں مارے گئے تھے۔ میں نے طلحہ کو بول دیا تھا کہ جیسے ہی امریکی صدر اغوا ہو جائیں، وہ جھاڑی کی جڑ سے نکلنے والے پانی کو جنرل مائیک کے بنگلے کے سامنے والے پارک کے کسی درخت کے نیچے دوائی کی شیشی میں رکھ کر ان کے گھر فون کر کے بتا دے۔ وہ ادھر سے آ کر اٹھا لیں گے۔

’’علی بھائی! کیا واقعی ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے؟‘‘ سافی نے دور آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’نہیں سافی! یہ ناممکن ہے۔۔۔ ہم سو فیصد کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ دنیا کا غریب سے غریب ملک بھی آزاد رہنے کے لئے جدوجہد کرے گا۔ کوئی بھی ملک غلام رہنا پسند نہیں کرتا، اس لئے یہ ناممکن ہے۔‘‘ میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

’’بھائی! اگر ہمارا مقصد ہی پورا نہیں ہوتا تو پھر اتنا رسک لینے کی کیا ضرورت تھی؟ میں شہر کے حالات دیکھ کر آیا ہوں۔۔۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے پورے ملک میں ہی جنگ لگ گئی ہو۔‘‘ اس کے لہجے سے مجھے گھبراہٹ نظر آ رہی تھی۔

’’سافی بھائی! بات کامیابی یا ناکامی کی نہیں ہے، بات مقصد کی ہے۔ ہمارا مقصد نیک ہے اور اس کا کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور ہو گا۔ آج نہیں تو دس سال یا بیس سال بعد سہی لیکن اثر ضرور ہو گا۔ دنیا ون ورلڈ ضرور بنے گی۔ شاید اس ون ورلڈ کو ہم نہ دیکھ پائیں لیکن ہماری آنے والی نسلیں ضرور اس ون ورلڈ میں سانس لیں

گی۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''علی بھائی! آپ بہت لمبا سوچتے ہو۔۔۔بالکل ٹھیک کیا ہے آپ نے!'' وہ بھی میرے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''لمبا سوچنا پڑتا ہے۔۔۔ہم دنیا کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں سافی بھائی!'' میں نے زور سے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر مارا اور اسے لے کر گھر آ گیا۔عریج ابھی تک جاگ رہی تھی۔

''سافی بھائی! میں آپ کے لئے بھی کھانا لگا دیتی ہوں؟'' وہ سافی کو دیکھ کر اٹھنے لگی لیکن سافی نے اسے منع کر دیا۔

''نہیں عریج! رہنے دو، کھانا میں شہر سے ہی کھا کر آیا ہوں۔''

''پھر بھی بھائی! تھوڑا سا کھانا کھا لیتے؟'' عریج نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں مکمل پیٹ بھر کر آیا ہوں اور ہاں! تمہارے لئے بھی کچھ لے کر آیا ہوں۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چاکلیٹ کے دو بڑے بڑے پیکٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

''او بھائی! آپ بہت اچھے ہو۔'' وہ چاکلیٹ لے کر بچوں کی طرح خوش ہونے لگی۔

عریج کو چاکلیٹ بہت پسند تھی۔ہم غریب لوگ تھے اور ہم نے اپنی پوری زندگی میں کبھی چاکلیٹ نہیں دیکھی تھی۔ابو جب نمبردار کے کھیتوں میں کام کرتے تھے تو عریج اور امبر امی کے ساتھ نمبردار کے گھر چلی جاتیں تھیں۔نمبردار کی بیوی ان سے گھر کی صفائی اور دیگر دوسرے کام کروا لیتی تھی۔امی اور دونوں بہنیں چلی جاتیں تھیں اور صفائی وغیرہ کے بدلے میں نمبردار کی بیوی پرانے کپڑے یا کچھ رقم وغیرہ بھی دے دیتی تھی۔ ان کا ایک دور کا رشتے دار یورپ کے کسی ملک میں رہتا تھا۔وہ چھٹی پر پاکستان آیا تو ہمارے گاؤں میں آیا تھا۔وہی چاکلیٹ لے کر آیا تھا اور اس میں سے تھوڑا سا حصہ عریج کو ملا تھا۔عریج وہیں سے چاکلیٹ کی دیوانی ہو گئی تھی۔

جب ہم وانا میں تھے تو میں سپیشل عریج کے لئے چاکلیٹ لے کر جاتا تھا۔جاسم بھی اس کے لئے چاکلیٹ خریدتا تھا۔جاسم کے چلے جانے کے بعد اب اس کی جگہ سافی نے سنبھال لی تھی اور وہ جب بھی شہر جاتا تھا، واپسی پر اس کے لئے چاکلیٹ ضرور لے کر آتا تھا۔چاکلیٹ کے علاوہ عریج کو کتابیں پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔سافی اس کے لئے ہر بار ایک دو ناول ضرور لے کر آتا تھا۔

''سافی بھائی! اس بار کوئی کتاب نہیں لے کر آئے؟'' وہ سافی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

''نہیں! اس بار میں اس طرف گیا ہی نہیں ہوں، مجھے دوسرے بہت سے کام تھے۔'' اس نے کہا تو عریج کے چہرے پر تھوڑی افسردگی آ گئی۔

''کوئی بات نہیں بھائی! میرے پاس پہلے ہی کافی کتابیں ہیں، میں ان کو ہی پڑھ لوں گی۔'' وہ اندر کی طرف جانے لگی تو سافی نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

''کدھر جا رہی ہو؟'' سافی کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ آئی۔

''ویسے ہی اندر جا رہی ہوں۔ میں ادھر چادر بچھا کر نیچے سو جاتی ہوں، آپ باہر سو جائیں۔'' اس نے کہا۔

ہمارے گھر میں تین ہی چارپائیاں تھیں اور وہ میرے، عریج اور ہمارے نئے امریکی مہمان کے لئے تھیں۔ اب چونکہ سافی بھی ادھر آ گیا تھا تو عریج اندر کمرے میں زمین پر ہی سو جاتی۔

''نہیں! تم رہنے دو۔۔۔ ہم دونوں بھائی ایک ہی چارپائی لے لیتے ہیں، ویسے بھی ایک نے سونا ہے اور دوسرے نے پہرہ دینا ہے۔'' سافی نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے، ابھی ہوا چلنے لگی ہے۔۔۔ اندر کمرے میں بھی سویا جا سکتا ہے یا پھر میں باہر ہی چادر بچھا لیتی ہوں۔'' عریج کا ہاتھ ابھی تک سافی کے ہاتھ میں ہی تھا۔

''کتاب کا تم نے دوسری بار نہیں پوچھا ہے؟''

''کیا۔۔۔؟ کیا آپ واقعی کوئی کتاب نہیں لائے یا پر مذاق کر رہے ہیں؟'' عریج نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی بہن کے کام کی بجائے کسی دوسرے کام کو اہمیت دیں؟ میں سب سے پہلے تمہارا ہی کام کرتا ہوں اور اس کے بعد باقی دوسرے کام ہوتے ہیں۔ ہم دونوں کی ایک ہی تو بہن ہے۔۔۔ بہت چھوٹی سی بہت پیاری سی!'' سافی نے مسکراتے ہوئے کہا تو عریج کا چہرہ کھل اٹھا۔

''سچ بھائی! آپ کتاب لائے ہو؟'' اس کی معصوم شوخی لوٹ آئی تھی اور اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

''جی جی! بالکل لے کر آیا ہوں۔'' سافی نے کہا۔

''کونسی کتاب ہے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''آجاؤ! ٹرک میں پڑی ہے، خود ہی دیکھ لینا۔'' وہ اسے لے کر باہر چلا گیا۔ میں اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا اور انہیں باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

ٹرک ہمارے جھونپڑے کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ ٹھیک دو منٹ بعد ہی مجھے عریج کی ایک تیز چیخ سنائی دی اور پھر اس کے بعد اس کی چیخیں مسلسل بڑھنے لگیں۔ میں نے جلدی سے چارپائی چھوڑی اور بھاگتا ہوا باہر آ گیا۔ مجھے چاند کی سفید روشنی میں ٹرک کے پیچھے عریج نظر آ گئی جو سافی سے لپٹی چیخیں مار رہی تھی۔ میں ان کے پاس پہنچا تو سافی نے موبائل کی لائیٹ ٹرک کے اندر ماری اور اندر کا منظر دیکھ کر میں بھی دنگ رہ گیا۔ ٹرک میں کھانے پینے کے سامان کے علاوہ کتابوں کا ایک بہت بڑا بنڈل پڑا ہوا تھا۔ شہر میں سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکانیں ہوتی ہیں۔ سافی ادھر سے ہی سستے داموں دو تین کتابیں ہر دفعہ لے کر آتا ہے۔ اس بار وہ پوری کی پوری دکان ہی خرید لایا تھا۔ ٹرک کے اندر کم از کم بھی پانچ سو سے اوپر کتابیں اور ڈائجسٹ پڑے ہوئے تھے۔ عریج اس پورے بنڈل کو دیکھ کر ہی پاگل ہو گئی تھی۔

پچاس افراد پر مشتمل اس چھوٹے سے گاؤں میں صرف پانچ چھ لڑکیاں ہی اس کی ہم عمر تھیں اور یہاں روہی میں سارا دن اسے کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ سافی اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میرے شہر جانے کے بعد وہ ان کے ساتھ ان کے گھر میں ہی رہتی تھی۔ سافی اور اس کے والد تو روہی میں بھیڑ بکریاں چرانے چلے جاتے تھے اور صبح کے گئے رات کو ہی واپس آتے تھے۔ پیچھے عریج اور سافی کی والدہ ہی ہوتی تھیں۔ گھر میں چار لوگوں کا کھانا بنانے میں کونسا ٹائم لگتا تھا۔

سافی کی والدہ بہت اچھی خاتون تھیں اور وہ عریج کو کوئی بھی کام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ وہ سارا دن یا تو دوسری لڑکیوں کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی یا پھر پڑھتی رہتی تھی۔ گاؤں میں میرے، عریج اور سافی کے علاوہ اور کوئی بھی پڑھا لکھا نہیں تھا۔ ہم تینوں میں سے صرف عریج کو ہی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا بلکہ جنون تھا۔ جبکہ میں اور سافی صرف وقت گزارنے کے لئے کبھی کبھی کوئی کتاب پڑھ لیتے تھے۔ وہ کتابوں کے اتنے بڑے ذخیرے کو دیکھ کر ہی پاگل ہو گئی تھی۔ مجھے وہاں دیکھ کر اس نے سافی کو چھوڑا اور مجھ سے لپٹ گئی۔

''علی بھائی! سافی بھائی بہت اچھے ہیں۔'' وہ اٹھارہ سال کی ہو گئی تھی لیکن اس کا بچپن ابھی تک نہیں گیا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کی موت نے اسے بہت تکلیف دی تھی۔ طالبان نے اس کا معصوم بچپن چھین لیا تھا۔ وہ کچھ عرصے کے لئے تو مسکرانا بالکل ہی بھول گئی تھی لیکن میری اور سافی کی بے لوث محبت اسے

واپس زندگی کی طرف لے آئی تھی۔ اس کا بچپن بھی لوٹ آیا تھا، وہ اب کھلکھلا کر مسکراتی تھی اور اس کی مسکراہٹ سے روہی میں بھی بہار آجاتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی اسے ماضی کے حادثات یاد آتے تھے تو اس کی شوخی غائب ہوجاتی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے، اب گھر چلو! یہ کتابیں اب کہیں بھی نہیں جائیں گی۔ صبح میں ساری کتابیں گھر لا دوں گا، پھر پڑھتی رہنا!'' میں نے اسے بازو سے پکڑا اور گھر لے آیا۔

سافی نے پیچھے ٹرک کا دروازہ بند کیا اور ہمارے پیچھے پیچھے گھر آ گیا۔ میں نے عرتج اور سافی کو سونے کا کہا اور خود جاگ کر پہرہ دینے لگا۔ وہ دونوں سو گئے تو میں بھی صحن میں پڑی ہوئی ایک پیڑھی پر بیٹھ کر رات گزارنے لگا۔ صبح پانچ بجے کے قریب مہمان صدر نیند سے بیدار ہو گئے تو میں انہیں لے کر دوبارہ باہر ٹیلوں کے پیچھے لے آیا۔ اس بار وہ بغیر کوئی عذر کئے نیچے چلے گئے اور تھوڑی دیر لگا کر واپس آ گئے۔

''مسٹر علی! تمہارے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ ہے؟'' وہ میرے قریب آئے اور انہوں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''نہیں سر! یہاں اس گاؤں میں کسی کے پاس بھی کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ کیوں کیا بات ہے؟'' میں نے الٹا ان سے سوال کیا۔

''کچھ نہیں! ویسے ہی پوچھا ہے۔ اگر پستول ہوتا تو ادھر ہی مار دیتے، ویسے بھی تو میں نے ادھر رہتے رہتے دو چار دنوں میں مر ہی جانا ہے۔۔۔ ابھی مار دو!'' انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے آپ کو یہاں تک لانے کے لئے بہت محنت کی ہے۔ اتنی آسانی سے آپ کو کہاں مرنے دیں گے؟'' میں انہیں تسلی دینے لگا۔

''چلو، یہ تو اب آپ کی مرضی ہے کہ آپ ہمیں کب تک زندہ رکھتے ہو۔'' وہ بالکل مایوس نظر آ رہے تھے۔

''سر! ابھی تو آپ کو صرف ایک ہی رات ہوئی ہے، آپ نے یہاں پورا سال گزارنا ہے۔۔۔ اتنی جلدی مایوس نہیں ہوتے!'' میں انہیں لے کر واپس گھر آ گیا۔

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی اب نظر آنے لگی تھی اور فجر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ ابھی دن نکلنے میں کافی وقت

تھا۔ میں نے انہیں دوبارہ سو جانے کا کہا تو وہ چارپائی پر لیٹ گئے۔ دوسری طرف میں نے عریج کو اٹھایا اور خود نماز پڑھنے لگا۔ میرے نماز سے فارغ ہونے تک سافی بھی اٹھ گیا تھا۔ عریج نے دہی نکال دیا تو اس نے دہی سے ہی ناشتہ کرلیا۔ پھر ہم دونوں نے مل کر عریج کی کتابوں کو ایک سائیڈ پر کیا اور ٹرک سے کھانے پینے کا سامان نیچے اتارنے لگے۔ چونکہ ٹرک نے اگلے مہینے تک ادھر ہی رہنا تھا اس لئے کتابوں کو ہم نے ٹرک کے اندر ہی رہنے دیا۔ وہ ادھر سے ہی اپنی پسند کی کتابیں لے کر جا سکتی تھی۔ ہمارے سامان نیچے اتارنے تک گاؤں والے بھی پہنچ گئے۔ سافی نے کاپی نکالی (کاپی کے اوپر گاؤں والوں کا سامان لکھا ہوا تھا) اور وہ ایک ایک کر کے لوگوں کو ان کا مطلوبہ سامان دینے لگا۔ لوگوں کو ان کا سامان دیتے دیتے ہمیں دس بج گئے۔ اس دوران ہمارے مہمان صدر بھی اٹھ گئے اور ناشتہ کئے بغیر ہی ادھر آ گئے۔ عریج نے انہیں ناشتے کا بولا لیکن انہوں نے منع کر دیا تھا۔

دس بجے تک ہم نے گاؤں والوں کو ان کا سارا سامان دے دیا۔ ابھی صرف ان کا حساب کتاب کرنا تھا جو دوسرے دن ہونا تھا۔ سافی پہلے سے گاؤں والوں کی بھیڑ بکریاں لے کر جاتا تھا اور انہیں منڈی میں لے جا کر بیچتا تھا۔ وہ سارے جانور ایک ہی مخصوص بیوپاری کو بیچتا تھا۔ یہاں سے جتنے بھی جانور جاتے تھے ان کے وہاں وہ بیوپاری دو گروپ بناتا تھا۔ ایک اچھے جانوروں کا گروپ جن کی قیمت کچھ زیادہ ہوتی تھی جبکہ دوسرے گروپ کی قیمت کچھ کم ہوتی تھی۔ سب جانوروں کو وہ تھوک کے ریٹ کے حساب سے ہی لیتا تھا۔ وہی بیوپاری سافی کو گندم، دالیں اور چاول وغیرہ بھی خرید کر دیتا تھا۔ جبکہ دیگر چھوٹی چھوٹی چیزیں سافی خود شہر سے خرید لیتا تھا۔ سافی کے پاس ایک کاپی تھی جس میں پورے گاؤں کا حساب کتاب لکھا ہوتا تھا۔

روہی کے بالکل درمیان میں موجود یہ چھوٹا سا گاؤں شاید دنیا کا پرامن ترین گاؤں تھا جہاں کوئی لڑائی نہیں ہوتی تھی۔ لڑکے یا لڑکیوں کی عمر جب پندرہ سولہ سال سے اوپر ہو جاتی تو ان کی شادیاں کر دی جاتیں تھیں۔ یہاں شادیاں گاؤں میں ہی ایک دوسرے کے ساتھ کر دی جاتی تھیں۔ دنیا کی ساری لڑائیاں زن، زر اور زمین پر ہوتی ہیں اور یہاں یہ تینوں چیزیں ہی نہیں تھیں۔ شادیاں پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہو جاتیں اور زمین یہاں کسی کی بھی نہیں تھی۔ پوری روہی ان کے سامنے تھی اور وہ جتنا مرضی بڑا گھر بنا سکتے تھے۔ باقی پیسے کی بات ہو تو وہ یہاں صرف کاغذ کے ٹکڑے تھے۔ وہ صرف جانور دیتے تھے اور اس کے بدلے میں خوراک لیتے تھے۔ پیسوں کے حساب کتاب کا ان کو کچھ بھی پتہ نہیں تھا اور وہ سب کچھ سافی ہی کرتا تھا۔

سافی سے پہلے ہمارے ٹوبے سے کوئی دس کلومیٹر دور ایک اور ٹوبہ تھا۔ وہاں سے خوراک جانوروں کے بدلے میں لی جاتی تھی۔ روہی میں خشک سالی آئی تو اس ٹوبے پر آباد گاؤں والے دوسری طرف چلے گئے اور ان کی جگہ پر سافی شہر سے سامان لے کر آنے لگا۔ اب یہاں ہمارے گاؤں سے نزدیک ترین ٹوبہ کوئی پندرہ کلومیٹر دور تھا۔ وہ نسبتاً بڑا ٹوبہ تھا اور اس کی آبادی بھی دو سو سے اوپر تھی۔

گاؤں والوں کا سارا سامان دینے کے بعد ہم نے جیک کی مدد سے ٹرک کو اوپر اٹھایا اور پکڑی کے بڑے بڑے بلاکوں کو ٹرک کے نیچے رکھ کر اسے اوپر اٹھایا اور اس کے چاروں ٹائر کھولنے لگے۔ یہاں ٹائروں کو کھول کر اندر جھونپڑے میں رکھنا بہت ضروری تھا۔ باہر گرمی اور لو کی وجہ سے ٹرک کے ٹائر خراب ہو جاتے تھے اور ان کی ہوا نکل جاتی تھی۔ پلاسٹک کے ٹائروں پر جب مسلسل دھوپ پڑتی ہے تو وہ بھرے بھرے سے ہو جاتے ہیں اور دوبارہ ہوا بھرنے کی صورت میں پنکچر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے انہیں محفوظ رکھنے کے لئے جیسے ہی ٹرک گاؤں میں پہنچتا ہے تو اس کے ٹائر نکال کر انہیں اندر جھونپڑے میں رکھ لیا جاتا ہے۔ اگلے مہینے جب دوبارہ جانا ہوتا ہے تو پھر لگا لئے جاتے ہیں۔

ہم اس کام سے فارغ ہوئے تو واپس گھر آ گئے۔ دھوپ بڑھنے کی وجہ سے گرمی اپنے پورے زوروں پر پہنچ چکی تھی۔ گرمی کے بڑھتے ہی صدر صاحب کی برداشت ایک بار پھر جواب دینے لگی۔ انہیں نہانے کے لیے پانی چاہیے تھا لیکن پانی یہاں نہانے کے لیے دستیاب نہیں تھا۔ ہمارا ٹوبہ خشک ہو رہا تھا اور اس کے اندر پانی بہت کم رہ گیا تھا۔ اگلے دس بارہ دنوں تک وہ مکمل طور پر خشک ہو جاتا تو اس کے بعد ہمیں 10 کلومیٹر دور ایک دوسرے ٹوبے پر جانا پڑتا اور وہاں سے پانی لانا پڑتا۔ ابھی پانی بہت کم تھا، صرف ہمارے اور جانوروں کے پینے کے لیے ہی پانی موجود تھا۔ جانوروں کو بھی ہم دو دو دن کے وقفے کے بعد ڈبوں کی مدد سے پانی پلاتے ہیں۔ ایک بھیڑ کے لیے ایک چھوٹا ڈبہ۔۔۔ صرف اتنا ہی پانی پلایا جاتا تھا۔ بھیڑ بکریاں روہی میں جو جھاڑیاں کھاتی تھیں ان میں بھی پانی کی بہت کم مقدار ضرور ہوتی ہے، اس لیے ان کا گزارہ ہو جاتا ہے۔

ایک بار بارش ہو جاتی تو اگلے سات آٹھ مہینوں تک سب کو پیٹ بھر کر پانی ملتا تھا۔ ابھی خشک سالی کا موسم تھا اور سبھی کو پانی صرف ضروریات پوری کرنے کے لیے ہی دیا جاتا ہے۔ یہاں نماز پڑھنے کے لیے وضو بھی پانی کی بجائے ریت سے کیا جاتا تھا جسے تیمّم کہا جاتا ہے۔ صبح صدر نے گھر میں آتے ہی ایک بار پھر چلّانا

شروع کر دیا۔ گاؤں والے سارے ان کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ انہیں انگریزی میں گالیاں دیتے ہوئے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ انگریزی کسی کو سمجھ نہیں آتی تھی اس لیے سبھی گالیاں سن کر بھی خوش ہو رہے تھے۔

''علی ۔۔۔! علی ۔۔۔! مجھے بہت گرمی لگ رہی، میں اس صحرا میں مر جاؤں گا۔۔۔ پلیز! مجھے واپس چھوڑ آؤ!'' وہ مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے پاس آ گئے۔

''سوری سر! یہ ناممکن ہے، میں آپ کو واپس نہیں کر سکتا۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، اگر واپس نہیں کر سکتے تو پلیز! مجھے جان سے مار دو، میں یہاں اس ریگستان میں نہیں رہ سکتا۔۔۔ تم مجھے گولی مار دو۔'' انہوں نے میرا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ آہستہ آہستہ اس ماحول کے عادی ہو جائیں گے، تھوڑا حوصلہ رکھیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں! مجھے حوصلہ نہیں چاہیے، یہ ماحول اور گرمی میری برداشت سے باہر ہے۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ تم لوگ یہاں کیوں رہ رہے ہو؟ پاکستان بہت بڑا ملک ہے۔۔۔ تم یہاں سے باہر نکل کر کسی اچھی جگہ پر بھی جا کر رہ سکتے ہو؟'' انہوں نے اپنے سامنے کھڑے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر جی! یہ سب کچھ کہنا بہت آسان ہے لیکن اگر اس پر عمل کرنا چاہو تو یہ ناممکن ہے۔ پاکستان کی آبادی 21 کروڑ ہے اور ساری کی ساری آبادی ہی نوکریاں ڈھونڈ رہی ہے، سب کو کام کی تلاش ہے۔ یہاں سے باہر نکلیں گے تو ہمیں کام کون دے گا؟ جگہ کون دے گا؟ کھانا کون دے گا؟ یہ امریکہ یا یورپ نہیں ہے جہاں کام نہیں ہے تو حکومت کی طرف سے سوشل امداد ملتی ہے اور بوڑھوں کو پنشن ملتی ہے۔ یہاں 50 سال سے اوپر کسی کی عمر ہو جائے تو اسے پورے ملک میں کہیں بھی نوکری نہیں ملے گی۔ ایسے میں یہ لوگ کہاں جائیں گے؟ یہاں تکلیف ہے، سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن پھر بھی پیٹ بھرنے کے لیے روٹی مل جاتی ہے۔ حکومت کا کام لوگوں کو اٹھانا نہیں ہوتا ہے بلکہ انہیں سہولت دینا ہوتا ہے۔ ہماری بھیڑ بکریاں ملک کی معیشت میں استعمال ہوتی ہیں۔ ہم شہر سے سامان خریدتے ہیں تو اس پر ٹیکس دیتے ہیں۔ جب گورنمنٹ ٹیکس لے رہی ہے تو بدلے میں ہمیں کیا دے رہی ہے؟ کیا امریکہ اور یورپ میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے؟'' میں نے لیکچر دینے کے انداز میں پوری تقریر کر ڈالی۔

''مسٹر علی! مجھے ابھی تک تمہارے مقصد کی سمجھ نہیں آئی۔'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے

کہا۔

''اچھا! آجاؤ، اندر جھونپڑے میں بیٹھ کر آپ کو دکھاتا ہوں کہ میرا مقصد کیا ہے۔'' میں انہیں لے کر اندر جھونپڑے میں آ گیا۔ باہر گرم لو چلنے لگی تھی اور اس سے چہرے جھلس رہے تھے۔ کمرے میں آتے ہی میں انہیں لے کر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور جیب سے موبائل نکال کر اسے آن کرنے لگا۔ عزیج اور سافی بھی ہمارے ساتھ اندر آ گئے۔

''سر جی! کیا آپ تیار ہو ہمارے مطالبات دیکھنے کے لیے؟'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے آگے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے مطالبے والی ویڈیو نکالی اور اسے پلے کر دیا۔ ویڈیو میں ایک نوجوان نقاب پہنے زین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھوں پر دستانے جبکہ آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔

''گڈ مارننگ امریکہ اور یورپ! جبکہ میرے اسلامی ممالک کو اسلام وعلیکم! دنیا میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات کی وجہ سے آج پوری دنیا ہی ڈپریشن اور خوف کا شکار ہے۔ یورپ اور امریکہ والے ہم مسلمانوں کو اس سارے خون خرابے کا ذمہ دار مانتے ہیں۔ اس بات میں کچھ سچائی بھی ہے، ہم مسلمان واقعی اپنے مذہب میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ مذہب کی اصل تعلیمات کو ہی بھول گئے ہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتا۔ ہمارا مذہب اسلام ایک انسان کی موت کو پوری انسانیت کی موت کہتا ہے۔ ہم لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو بھلا دیا ہے اور اقتدار کے بھوکے چند بھیڑیوں نے اس کا فائدہ اٹھا کر دہشت گردی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ہم مسلمان دہشت گرد نہیں ہیں۔

مسلمانوں نے آج سے 14 سو سال پہلے (جب دنیا میں کوئی قانون نہیں تھا اور ہر طرف موت کا رقص ہوتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے قبیلے سینکڑوں سالوں تک ایک دوسرے سے معمولی معمولی باتوں پر لڑتے رہتے تھے) کو اکٹھا کیا اور انہیں مہذب دنیا کی تعلیم دی، مہذب معاشرے میں رہنے کے لیے قوانین بنائے اور ان قوانین کو ریاست میں لاگو کیا۔ مسلمانوں کی یہ ریاست مدینہ سے باہر نکلی اور پھیلتے پھیلتے اس کی سرحدیں فرانس سے جا کر لگنے لگیں۔ سعودی عرب سے لیکر سپین تک اور انڈیا اور پاکستان سے لیکر افریقہ کے آخری ملک نائیجریا (Nigeria) تک مسلمانوں کی سلطنت تھی۔ اس ریاست میں بادشاہ سے لے کر ایک چرواہے تک سب برابر تھے۔ قانون سب کے لیے ایک جیسا تھا۔ ریاست ملک کے اندر بسنے والے ایک ایک فرد کی

جان اور مال کی حفاظت کی ذمہ دار تھی۔ مسلمانوں نے چھوٹے چھوٹے قبیلوں اور ملکوں کو اکٹھا کر کے ایک بڑی اور پُرامن ریاست کی بنیاد ڈالی۔ دنیا میں امن وامان اور دہشت گردی سے نجات صرف اسی صورت ممکن ہے جب دنیا میں ایک ہی قانون ہو جو پوری دنیا پر لاگو ہو۔

یورپ اور امریکہ ایشیا اور افریقہ کے بڑے بڑے ملکوں کو توڑ کر ان کے چھوٹے چھوٹے ملک بنانے میں دلچسپی لیتا ہے اور اسی وجہ سے دنیا میں دہشت گردی ہو رہی ہے۔ بڑے ملکوں کے اندر علیحدگی پسند تحریکیں چلتی ہیں جو دہشت گردی کا باعث بنتی ہیں۔ روس نے کرایمیا (یوکرائن کا ایک علاقہ) پر قبضہ کر کے اسے اپنا حصہ بنایا تو پورا یورپ اور امریکہ اس کے خلاف ہو گیا۔ عراق نے کویت پر قبضہ کر کے اسے اپنا 24 واں صوبہ بنایا تو امریکہ کویت کی مدد کے لیے سعودی عرب میں آ کر بیٹھ گیا۔ آج کا مہذب معاشرہ ملکوں کو پھلنے پھولنے اور اکٹھا ہونے سے تو روکتا ہے جبکہ ٹوٹنے کی حمایت کرتا ہے۔ انڈیا پاکستان کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے جبکہ پاکستان انڈیا کی علیحدگی پسند تحریکوں کی سپورٹ کرتا ہے۔ اگر کل کو انڈیا یا پاکستان کا کوئی حصہ الگ ہو کر علیحدہ ملک بنتا ہے تو یہی یورپ والے سب سے پہلے اسے علیحدہ ملک تسلیم کریں گے۔ ملکوں کے اندر اسی وجہ سے دہشت گردی پھیلتی ہے۔ علیحدگی پسند تحریکیں دہشت گردی کا گڑھ بن چکی ہیں۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ میرے قبضے میں ہے اور اسے رہا کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اقوام متحدہ میں یہ قانون پاس ہو کہ اس دنیا میں آج کے بعد کسی بھی نئے ملک کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ مختلف ریاستیں اور علاقے ریفرنڈم یا ووٹ کی صورت میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں شامل تو ہو سکتی ہیں لیکن علیحدہ ملک نہیں بن سکتیں۔ دو ملک مل کر ایک تو بن سکتے ہیں لیکن ٹوٹ کر تین نہیں بن سکتے۔ اس سے دنیا میں موجود سبھی علیحدگی پسند تحریکیں ختم ہو جائیں گی۔ میری دوسری شرط یہ ہے کہ افغانستان میں موجود ایک طویل جنگ کا خاتمہ ہو۔ پاکستان کی کم از کم ایک لاکھ فوج افغانستان کے اندر جائے اور نیٹو افواج کے ساتھ مل کر پورے افغانستان کو اسلحہ فری ملک بنائے۔

پاکستان آرمی دنیا کی سب سے بہترین اور پروفیشنل فوج ہے۔ یہ پچھلے تیس سال سے دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑ رہی ہے۔ اسے اس جنگ کا پورا تجربہ ہے اور مجھے امید ہے کہ پاکستان آرمی زیادہ سے زیادہ تین مہینے کے اندر اندر پورے افغانستان کو اسلحے اور بارود سے پاک کر دے گی۔ افغانستان کے اس فارمولے کے تحت باقی ملکوں کو بھی اسلحے سے پاک کیا جا سکتا ہے۔ میری تیسری شرط۔۔۔صومالیہ دنیا کا

سب سے غریب ترین ملک ہے۔ یہاں کی 100 فیصد آبادی ہی بھوک سے مر رہی ہے۔ یہاں پیدا ہونے والے بچے کو بھی پیٹ بھر کر کھانا کھانے اور زندہ رہنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ امریکہ صومالیہ میں اپنی فوج لیکر آئے اور یہاں بھی ایک ریفرنڈم ہو۔ امریکہ کے علاوہ کینڈا، جرمنی، روس یا چائنہ۔۔۔غرضیکہ کوئی بھی دوسرا ملک صومالیہ کا الحاق اپنے ساتھ کرنا چاہے یا اسے اپنے ملک کا حصہ بنانا چاہےتو وہ بھی اس ریفرنڈم کا حصہ بنے اور صومالی عوام جس ملک میں جانا چاہے چلی جائے۔ 20 سال کا تجرباتی الحاق ہو اور اسے بعد میں مستقل ہو جائے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ مما لک آگے بڑھیں اور باقی غریب ملکوں کو اپنے مما لک میں شامل کر کے دنیا کو جنت بنائیں۔ میری چوتھی اور آخری شرط انڈیا کے متعلق ہے۔ برما (Myanmar) میں لاکھوں کی تعداد میں روہنگیا مسلمان بستے ہیں۔ یہ روہنگیا مسلمان دنیا کی سب سے مظلوم ترین قوم ہیں جن پر برما کی حکومت مظالم ڈھاتی رہتی ہے۔ انڈین گورنمنٹ برما کی حکومت سے روہنگیا مسلمانوں کے حقوق کی بات کرے اور اس کے تحفظ کے لیے کام کرے۔ اگر برما کی حکومت ان مظلوموں کو انصاف اور شہریت دے دیتی ہے تو ٹھیک ہے بصورتِ دیگر وقت آ گیا ہے کہ برما کو بھی ویسی ہی تکلیف دی جائے جو وہ پچھلے 50 برسوں سے ان مظلوم روہنگیا مسلمانوں کو دے رہا ہے۔ روہنگیا مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت انڈیا بڑی آسانی سے کرسکتا ہے۔ میری یہی چار شرائط ہیں۔

(1) اقوام متحدہ میں بل پاس ہو جس کے تحت کوئی بھی نیا ملک وجود میں نہ آ سکے۔

(2) افغانستان کے اندر پاکستان کی ایک لاکھ فوج آپریشن کرے اور پورے افغانستان کو اسلحہ فری ملک بنایا جائے۔

(3) صومالیہ کے اندر امریکی افواج تعینات ہوں اور یہاں دنیا کے ترقی یافتہ مما لک کے ساتھ الحاق کے لیے ریفرنڈم ہو۔

(4) انڈیا روہنگیا مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری اُٹھائے اور برما سے مسلمانوں کے فریق کی حیثیت سے بات چیت کرے۔

یہ چاروں نارمل سی شرطیں ہیں اور امریکہ ان شرائط پر عمل درآمد کروا کر اپنے صدر کو آزاد کروا سکتا ہے۔ امریکی صدر میرے قبضے میں ہے اور بہت حفاظت کے ساتھ انہیں رکھا گیا ہے۔ جیسے ہی میری شرطیں پوری ہو جائیں گی میں ان کو چھوڑ دوں گا۔ آخر میں میں امریکی اور نیٹو افواج کے مرنے والے فوجیوں کے اہل خانہ

سے معذرت کرتا ہوں جو اس کارروائی میں مارے گئے۔ مجھے ان کی موت پر بہت افسوس ہے۔ وہ سب ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں شہید ہو گئے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کے خاندان والوں کو صبر عطا فرمائے۔ والسلام اور گڈ بائے! تمام ناظرین سے میری گزارش ہے کہ میں دنیا کو بچانے کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں، مجھے امید ہے لوگ میرا ساتھ دیں گے۔

''اوہ مائی گاڈ! تم واقعی اس دنیا سے باہر کی مخلوق ہو، تمہاری ایک بھی شرط نہیں مانی جائے گی۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔'' ویڈیو ختم ہوئی تو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے صدر صاحب ایکدم اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''سر! کوشش کرنا تو میرا حق بنتا ہے نا؟ کامیاب ہونا یا ناکام ہونا تو بعد کی بات ہے۔'' میں بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''نہیں علی! یہ کوشش نہیں بلکہ یہ پاگل پن ہے۔ تمہاری پہلی شرط تو شاید مان لی جائے کہ اقوام متحدہ میں یہ بل پاس ہو جائے گا۔ آخری انڈیا والی بھی شاید مان لی جائے لیکن باقی دونوں شرائط ناممکن ہیں۔'' انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''سر! باقی دونوں شرطیں بھی اتنی مشکل نہیں ہیں۔'' میں نے ان سے کہا۔

''نہیں علی! مشکل نہیں ناممکن بولو، پاکستان 80ء کی دھائی سے افغانستان کے اندر جنگ لڑ رہا ہے اور اس جنگ کے اثرات ابھی تک پاکستان میں نظر آتے ہیں۔ پاکستان ابھی تک اس جنگ سے باہر نہیں نکلا۔ پاکستان کبھی بھی اپنی فوج افغانستان میں لے کر نہیں جائے گا۔ پاکستانی عوام اور فوجی ادارہ میرے اغوا کو امریکی سازش سمجھے گا۔ پاکستان کو انڈیا اور اسرائیل دونوں سے خطرہ ہے۔ اگر ایک لاکھ آرمی افغانستان میں جنگ لڑتی ہے تو پیچھے پاکستان میں کچھ بھی نہیں بچتا۔ امریکی اور نیٹو افواج جو افغانستان میں لگی ہوئی ہیں پاکستان کو ان سے بھی خطرہ ہوگا۔ نہیں! یہ ناممکن ہے۔ ہم پاکستان پر زور نہیں ڈال سکتے، چائنہ اور روس دونوں پاکستان کی مدد کے لیے آگے آجائیں گے۔ اس کے علاوہ ترکی اور عرب ممالک بھی پاکستان کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ پاکستان اکیلا نہیں ہے۔ ہمیں پاکستان کے ساتھ ساتھ کم از کم 20 بیس اور ممالک کا پریشر بھی برداشت کرنا ہوگا۔ یہ ناممکن ہے۔'' انہوں نے ناممکن کا لفظ دوسری دفعہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، لیکن تیسری شرط صومالیہ والی شرط پر کسی کو کیسا اعتراض ہوگا؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''صومالیہ والی شرط پاکستان والی شرط سے بھی زیادہ کڑی اور خطرناک ہے۔ وہ ایک مسلمان ملک ہے

جبکہ چین، جاپان، جرمنی، روس یا کینڈا وغیرہ سبھی عیسائی ممالک ہیں۔ باقی اسلامی ممالک اعتراض کریں گے۔" وہ دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"سر!اس کے لیے سعودی عرب اور ترکی جیسے ترقی یافتہ ممالک بھی تو ہیں، وہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرسکتا ہے؟" میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"نہیں! امریکی شہریت اور پاسپورٹ دنیا کی سب سے طاقت ور ترین چیزیں ہیں۔ ریفرنڈم ہو تو امریکہ ہی آگے آئے گا۔ جسے دوسرے ترقی یافتہ ممالک ظاہری طور پر تو مان لیں گے لیکن خفیہ طور پر مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے لگیں گے اور آزادی اور غلامی کے تصور کو ہوا دیں گے تو دنیا میں امن کی بجائے مزید دہشت گردی بڑھے گی۔ ایک مسلمان پر عیسائی حکومت نہیں کرسکتا۔" انہوں نے کہا۔

"اچھا! ایک مسلمان پر عیسائی حکومت نہیں کرسکتا تو امریکہ میں جو 50 لاکھ مسلمان رہ رہے ہیں۔۔۔ جو ٹوٹل آبادی کا چھ (6) فیصد ہیں اور انڈیا میں 25 کروڑ مسلمان ہیں، ان ملکوں میں آزادی کا تصور کدھر ہے؟ کیا امریکہ اور جرمنی میں بسنے والے مسلمان غلام ہیں؟ کیا پاکستان سے ویزے لگا کر جو لاکھوں مسلمان یورپ اور امریکہ جاتے ہیں وہ وہاں غلام بننے کے لیے جاتے ہیں؟ جب ہم اپنی جان اور مال کو خطرے میں ڈال کر امریکہ جانے کی کوشش کرسکتے ہیں تو پھر امریکہ کیوں نہیں ہمارے پاس آسکتا؟" میں ان سے سوال کرنے لگا۔

"مسٹر علی! یہ سب کچھ صرف فلموں اور خوابوں میں ہی اچھا لگتا ہے، حقیقت اس سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ اس دنیا میں امریکہ اکیلا ہی سپر پاور نہیں ہے اور بھی بہت سی قومیں ہیں جو ہماری مخالفت میں اٹھیں گی۔ امریکہ اکیلا پوری دنیا سے نہیں لڑسکتا۔ آپ کو امریکہ کے علاوہ پاکستان کے وزیر اعظم کو بھی اغوا کرنا چاہیے تھا۔" وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

"علی بھائی! وہ واقعی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کی لگائی ہوئی چاروں شرطیں بہت مشکل ہیں اور ان پر کوئی ملک عمل نہیں کرے گا۔" عریج میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"کون کون سی شرطیں۔۔۔ کوئی مجھے بھی بتائے گا؟" سافی بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اسے انگلش زبان نارمل سی ہی آتی تھی اس لیے وہ ہماری گفتگو کو نہ سمجھ سکا۔ میں نے اسے مختصر کر کے ساری تفصیل بتا دی۔

"واقعی علی بھائی! یہ بہت مشکل شرطیں ہیں، آپ کو اپنے رویّے میں تھوڑی لچک دینی چاہیے تھی۔"

ساقی نے بھی عریج اور ٹرمپ کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ صدر ٹرمپ کمرے سے باہر گئے تھے اور باہر موجود لوگوں کو دیکھ کر واپس آ گئے۔

''سافی بھائی! مجھے معلوم ہے کہ امریکہ ان شرائط کو نہیں مانے گا۔ یہ شرائط اتنی مشکل نہیں ہیں لیکن پھر بھی سپر پاور ممالک ایک دوسرے کی مخالفت کی وجہ سے انہیں پورا نہیں ہونے دیں گے۔'' میں نے ساقی سے کہا۔

''بھائی! اگر یہ ناممکن ہے تو پلیز آپ کوئی اور مطالبات رکھ لیتے، جو آسان ہوتے اور ان پر عمل بھی ہو سکتا؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''میں صرف دنیا کو ایک بہتر آئیڈیا دینا چاہتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ اس پر ابھی عمل نہیں ہوگا لیکن آنے والے وقتوں میں یہ سب کچھ ہوگا۔ دنیا کو اس چیز کی ضرورت ہے اور ایک دن پوری دنیا میں ایک ہی قانون نافذ ہوگا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور دوبارہ صدر ٹرمپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''سر جی! کیا ارادہ ہے؟ ایک ویڈیو بنانی ہے تاکہ اسے امریکیوں کو پہنچایا جا سکے اور وہ تیزی سے کام کریں۔'' میں نے ان سے ویڈیو بنانے کا پوچھا۔

''جی ضرور! ہم آپ کے قیدی ہیں اور یہاں پر آپ کا ہی حکم چلے گا۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے انہیں ایک کاغذ پکڑایا جس پر ایک چھوٹا سا پیغام لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کیمرے کے اوپر آ کر یہ بیان پڑھ کر سنانا تھا۔ ان سب چیزوں سے فارغ ہو کر میں کمرے سے باہر آ گیا۔ مجھے اس ویڈیو کو ایک ہفتے کے بعد شہر میں جا کر اپ لوڈ کرنا تھا۔ وہ بھی ایمرجنسی کی صورت میں ہی اپ لوڈ کرنا تھی۔ اگر امریکیوں کو یقین نہ آتا کہ صدر صاحب محفوظ ہیں اور ایک ہفتے تک وہ عوامی رائے عامہ ہموار کرتے اور میرے مطالبات کے سلسلے میں کچھ کرتے تو میں ویڈیو کو اپ لوڈ کر کے انہیں یقین دلا دیتا کہ صدر صاحب بالکل محفوظ ہیں اور وہ ان کی رہائی کے لیے میرے مطالبات پر عمل کرتے۔ میں ایک ہفتے تک حالات کا جائزہ لیتا اور پھر اس ویڈیو کو اپ لوڈ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتا۔ ابھی تو باہر ہر طرف سیکورٹی بہت سخت تھی۔ میں بہاولپور یا ملتان دونوں میں سے کسی بھی شہر میں جا کر ویڈیو اپ لوڈ نہیں کر سکتا تھا۔ روہی سے دور بہت دور امریکہ کے پورے ہیڈ کوارٹر میں اس وقت نائب صدر اور CIA کے چیف بیٹھے ہوئے ویڈیو دیکھ رہے تھے۔ ہیڈ کوارٹر میں اس وقت ان دونوں کے علاوہ 5 اور بھی افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سارے مختلف خفیہ

ایجنسیوں کے افسران تھے۔ ان میں ایک نائب صدر بھی بیٹھے ہوئے تھے جو اس وقت امریکی صدر ٹرمپ کے بعد امریکہ کے عارضی صدر بن گئے تھے۔ ویڈیو ختم ہوئی تو CIA کے چیف جنرل ہیری کھڑے ہوئے اور نائب صدر اولیور جان (Oliver John) کو بریفنگ دینے لگے۔ ان کی 10 منٹ کی مختصر بریفنگ کے بعد سارے افسران ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرنے لگے۔ نائب صدر جان نے ان سے کچھ منٹ گفتگو کی اور CIA چیف جنرل ہیری سے مخاطب ہوئے۔

''جنرل صاحب! یہ بات تو طے ہے کہ اغوا کندگان کی شرائط نا قابل عمل ہیں۔ امریکہ سپر پاور ضرور ہے لیکن ان مطالبات کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔۔۔ ہم ان کے مطالبات نہیں مان سکتے۔'' نائب صدر جان نے باقی سینئر افسران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی سر! آپ ٹھیک کہتے ہیں، یہ مطالبات بہت حساس قسم کے ہیں اور امریکہ ایسے کسی بھی مطالبے کو نہیں مان سکتا۔'' ایک سینئر افسر نے صدر کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''جنرل ہیری! آپ نے صدر صاحب کی بازیابی کے لیے کوئی پلان یا لائن آف ایکشن تیار کیا ہے؟'' نائب صدر جان نے سوال کیا۔

''جی سر! ہم صدر صاحب کی بازیابی کے لیے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہے ہیں، صدر صاحب کے اغوا کے تانے بانے سوئیزرلینڈ، اٹلی، افغانستان اور پاکستان میں جڑے ہوئے ہیں۔ ان چاروں ملکوں میں ہماری انٹیلی جنس نظر رکھے ہوئے ہے۔ اگر کوئی پیش رفت ہوتی ہے تو میں آپ کو اس کی خبر دیتا رہوں گا۔'' CIA کے چیف نے صدر سے کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ مجھے اس پورے آپریشن کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ دیتے رہیں۔'' صدر کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

''جی سر! میں برابر آپ کو رپورٹ کرتا رہوں گا۔'' CIA کے چیف صدر کے سامنے مؤدب کھڑے تھے۔

''ٹھیک ہے، مجھے اپنی سیکورٹی ایجنسیوں پر پورا یقین ہے اور ہم اس بحران سے جلد باہر آ جائیں گے۔ آپکو کسی قسم کی مدد چاہیے تو مجھے بتا دیں!'' صدر نے پوچھا۔

''سر! آپ کو اقوام متحدہ میں پہلا مطالبہ پورا کرنے کے لیے قرارداد لے کر چلے جانا چاہیے جبکہ

پاکستان اور صومالیہ کا ایک دورہ بھی کر لینا چاہیے۔ اس سے انہیں حوصلہ ملے گا کہ ہم ان کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے کوشش کر رہے ہیں اور وہ صدر صاحب کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ آپ مطالبات کو پورا کرنے کا اظہار ضرور کریں اور باقی ملکوں کے ری ایکشن دیکھیں۔ اس سے ہمیں بھی تھوڑا موقع مل جائے گا اور ہم اغوا کاروں تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔'' CIA چیف نے صدر صاحب کو آئندہ کا لائحہ عمل بتایا جس کی منظوری صدر نے دے دی اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔ سارے افسران نے صدر صاحب کو کھڑے ہو کر سیلوٹ کیا اور ان کے جانے کے بعد دوبارہ اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''جنرل صاحب! صدر صاحب کو اغوا کرنے کے لیے بہت بڑی رقم کا استعمال کیا گیا ہے۔ آپ پتہ کریں کہ یہ رقم کہاں سے آئی تھی اور کہاں کہاں استعمال ہوئی ہے۔ اتنی بڑی رقم بائی ہینڈ (By Hand) ٹرانسفر نہیں ہوسکتی، اس کے لیے لازمی بینکوں کا سہارا لیا گیا ہوگا۔'' CIA کے چیف نے باقی افسران کو مختلف کام بتائے اور ان کی میٹنگ برخاست ہوگئی۔

CIA اور FBI نے بڑی تیزی سے کام کیا اور ان ایجنٹوں نے سوئس بینک کے اکاؤنٹ بھی معلوم کر لیے جن سے رقم ٹرانسفر ہوتی رہی تھی۔ اسی اکاؤنٹ سے انہوں نے دوسرا اکاؤنٹ بھی تلاش کر لیا اور ایک مہینے کے اندر اندر وہ چوہدری شہباز تک پہنچ گئے۔ میں نے چوہدری شہباز کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ وہ میڈیا کے اوپر آ کر اغوا برائے تاوان کا اقرار کریں تا کہ اگر کل کو ہم اس رقم سے کوئی بڑا کام کریں تو ان پر کوئی آنچ نہ آئے۔ انہوں نے اس چیز سے بچنے کے لیے دوسرے دن ہی ایک پریس میٹنگ بلا کر ساری تفصیل بتا کر ملک کی سیکورٹی ایجنسیوں کو الرٹ کر دیا تھا کہ وہ اغوا کرنے والے گروپ کا پیچھا کریں اور ان کو ڈھونڈیں۔ پاکستانی ایجنسیوں نے زیادہ چھان بین نہیں کی تھی اور کیس وہیں ختم ہو گیا تھا۔ اب امریکی اہلکاران تک پہنچے تو پرانا سارا کیس دوبارہ کھل گیا۔ انہوں نے امریکی اہلکاروں کو اپنے اغوا کی پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔ چونکہ یہاں سے ہم نے ہر کام خفیہ رہ کر کیا تھا اس لیے امریکی ایجنسی یہاں تک پہنچ کر پھر ناکام ہوگئی۔ انہیں چوہدری شہباز سے کچھ بھی کام کی معلومات نہ مل سکیں۔

امریکی ایجنٹ لاہور کی بلیک مارکیٹ میں اسلحہ اور بارود کا کام کرنے والے لوگوں کو تلاش کرنے لگے۔ وہ ان لوگوں کو تلاش کر رہے تھے جنہوں نے اسد کو بارود اور مختلف قسم کا اسلحہ فراہم کیا تھا۔ دوسری طرف امریکی CIA ان افغان طالبان تک بھی پہنچ گئی تھی جنہوں نے ہم سے معاملات طے کئے تھے۔ امریکی CIA کا

جال انتہائی تیز رفتاری سے ہمارے گرد تنگ ہو رہا تھا۔ CIA کا چیف اٹلی، سوئس، افغانستان اور پاکستان چاروں ملکوں میں کام کر رہا تھا۔ اس کے ایجنٹ ایک ایک چیز کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے اقوام متحدہ میں نئے بننے والے ملکوں کے خلاف بل پاس کروالیا تھا۔ ملکوں کے چھوٹے چھوٹے علاقے ایک ملک سے دوسرے ملک میں شامل تو ہو سکتے تھے لیکن علیحدہ ملک نہیں بن سکتے تھے۔

حکومت برطانیہ نے عرب ممالک کو مختلف چھوٹے چھوٹے ممالک میں تقسیم کرنے پر معذرت کی۔ صومالیہ کے اندر امریکی آرمی کے دس ہزار کے قریب فوجی آ گئے۔ انڈیا کی آرمی نے بھی برما کا گھیراؤ کر لیا اور برما کے ساتھ روہنگیا مسلمانوں کے حقوق کی بات چیت ہونے لگی۔ جرمنی، کینیڈا اور امریکہ روہنگیا کے مظلوم لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دینے لگا۔ یہ ممالک برما کے مہاجر کیمپوں سے ان لوگوں کو لے کر جانے لگے۔ انڈین آرمی برما کے بارڈر کو مصروف رکھنے لگی۔ انڈین گورنمنٹ نے ان مطالبات پر سب سے زیادہ توجہ دی اور انڈین پارلیمنٹ کے اندر بھی بحث ہوئی۔ پارلیمنٹ میں ہی یہ فیصلہ ہوا کہ وہ برما کو بھی نہتے اور کمزور لوگوں پر ظلم نہیں کرنے دیں گے۔ انڈین گورنمنٹ اور میڈیا برما کو جنگ کی دھمکیاں بھی دینے لگا۔

برما ایشیا کے غریب ترین ملکوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کی فوج بھی صرف گھر کی شیر تھی۔ وہ صرف اپنے ملک میں رہنے والے نہتے شہریوں سے لڑ سکتی تھی۔ انڈیا جیسے بڑے دیو سے واسطہ پڑا تو فوراً ہی گھٹنے ٹیک دیے اور روہنگیا مسلمانوں کی رجسٹریشن اور شہریت دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

میرے دو مطالبات پورے ہو گئے تھے لیکن باقی دو مطالبات ناممکن تھے۔ صومالیہ کے معاملے پر کچھ ممالک کو اعتراض تھا۔ صومالین گورنمنٹ بھی اس کے حق میں نہیں تھی۔ خود امریکہ کے اندر بھی کچھ لوگ اس معاملے کی مخالفت کر رہے تھے۔ پاکستان والا معاملہ تو بالکل ہی الٹ ہو گیا تھا۔ پاکستان نے واضح انکار کر دیا تھا کہ وہ افغانستان کے اندر اپنا ایک بھی فوجی نہیں اتارے گا۔ پاکستان نے پہلی افغان جنگ میں اپنا بہت نقصان کروالیا تھا اس لیے اس بار وہ اس آگ میں کودنے سے گریز کر رہا تھا۔ امریکن کانگرس کے اہلکار پاکستان کو منانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہمارے لوگ بالکل نہیں جا رہے تھے۔ ملک کی ساری سیاسی جماعتیں اور فورسز افغان جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر رہی تھیں۔

ان سب چیزوں کے علاوہ ایک اچھا کام ہوا تھا وہ یہ کہ ملک کو اسلحہ فری بنانے کے لیے آرمی حرکت میں آ چکی تھی۔ سب سے پہلے کراچی سے آغاز کیا گیا تھا اور پورے کراچی میں اسلحے پر بین لگا دیا گیا تھا۔ آرمی

نے پورے کراچی سے اسلحہ اکٹھا کر لیا تھا اور اب آرمی، رینجر اور پولیس مل کر پورے کراچی میں اسلحے کی تلاش میں چھاپے مار رہے تھے۔ اسلحہ برآمد ہونے کی صورت میں جیل تھی۔ گورنمنٹ نے ابھی تک سزا کی مدت نہیں بتائی تھی لیکن صرف اسلحہ برآمد ہونے کی صورت میں جیل بھیج دیا جاتا تھا۔ سزاؤں کا فیصلہ آپریشن کے بعد کیا جانا تھا۔ کراچی کی جیلیں بھر چکی تھیں اور ابھی لوگوں کو حیدرآباد اور بدین میں رکھا جا رہا تھا۔

دوسری طرف ہمارے گاؤں میں ٹرمپ صاحب ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ ہو چکے تھے۔ شروع شروع کے دنوں میں انہوں نے کافی تنگ کیا تھا۔ دوبار بھاگنے کی بھی کوشش کی لیکن بروقت پتہ چل جانے کی صورت میں بچاؤ ہو گیا۔ ایک بار تو نزدیک سے ہی پکڑے گئے جبکہ دوسری بار وہ پورے 24 گھنٹے تک غائب رہے تھے۔ وہ گاؤں سے بہت دور نکل گئے تھے۔ صحرا کی گرمی اور پیاس نے انہیں بارہ چودہ گھنٹے میں ہی بے بس کر دیا تھا اور وہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے۔

پانی کی کمی سے انہیں ڈی ہائیڈریشن ہو گیا اور وہ صحرا میں ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ہمیں وہ 24 گھنٹے بعد ملے تو ان کے اندر بالکل تھوڑی سی زندگی رہ گئی تھی۔ وہ موت کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ شاید خدا نے ابھی ان کی موت نہیں لکھی تھی اس لیے وہ اس صورتحال سے بچ نکلے۔ ہم انہیں واپس گاؤں لیکر آ گئے۔ ڈی ہائیڈریشن کی وجہ سے وہ کافی کمزور ہو گئے تھے۔ اگلے ایک ہفتے تک شہر سے ان کا اٹھنا بھی محال ہو گیا۔ ان نازک دنوں میں عرتج نے ان کی مدد اور دیکھ بھال کی۔ عرتج ایک ہفتے تک لگاتار ان کی تیمارداری کرتی رہی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی ان کی صحت سے غافل نہیں ہوتی تھی۔ میں عرتج کو روکتا بھی تھا لیکن اس نے میری ہر بات سے انکار کر دیا تھا۔

''بھائی! یہ آدمی دنیا کا سب سے طاقت ور ترین آدمی ہے، اس کے ہاتھ میں طاقت اور اقتدار ہے۔ یہ انسانیت کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اگر ہم لوگ اس سے نفرت کریں گے تو یہ ساری زندگی ہم راجھستانیوں سے نفرت ہی کرے گا۔ میں اور آپ دونوں یہ نہیں چاہتے، مجھے ان سے محبت کرنی ہے۔ ہم لوگوں نے انہیں بتانا ہے کہ ہم ان سے محبت کرتے ہیں۔ یہ محبت کو محسوس کرے گا تو اسے انسان اور انسانیت سے بھی محبت ہو گی جبکہ نفرت سے صرف نفرت ہی ملتی ہے۔ محبت کی زبان سے اسے جو بھی سمجھائیں گے یہ اسے سمجھے گا بھی اور اس پر عمل بھی کرے گا۔'' عرتج ابھی صرف 18 سال کی نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کی سوچ بہت اوپر تھی۔

طالبان کی دہشت گردی نے اس کا بچپن چھیننے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن وہ ناکام رہے تھے۔اب وہ معصوم بھی تھی اور اسے دنیا میں جینے کا انداز بھی آ گیا تھا۔عریج نے جس محبت سے ان کی خدمت اور دیکھ بھال کی تھی، اس کا اثر بھی ٹرمپ پر ہوا تھا اور وہ بھی عریج سے محبت کرنے لگے تھے۔انہوں نے آہستہ آہستہ ہمارے معاشرے کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔اگلے دو مہینے تک نہ صرف وہ اچھی خاصی ہماری زبان بھی بولنے لگے تھے بلکہ گاؤں کے نوجوان لڑکے اب انگریزی بھی بولنے لگ گئے تھے۔وہ اب ہمارے ساتھ روہی میں بھیڑیں بھی چرانے لگ گئے تھے۔بھاگنے کی دوبارہ ناکام کوشش کے بعد اب انہوں نے بھاگنا بالکل ترک کر دیا تھا۔پہلے دس دن میں ہی ہمارے ٹوبے کا پانی ختم ہو گیا تھا اور ہمیں پانی کے لیے دور دراز کے علاقے کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ایک مہینے تک ہم پانی کی تلاش میں کبھی ایک ٹوبے پر جاتے اور کبھی دوسرے ٹوبے پر۔۔۔صدر ٹرمپ کی وجہ سے ہم شہر کی طرف نہیں جا سکتے تھے۔ہم آباد علاقوں کی بجائے روہی میں ہی گھومتے رہے۔ہمیں پوری روہی میں کہیں بھی پانی نہیں ملتا تھا۔جانور پیاس سے مرنے لگے تو جانوروں کو منڈی لے جا کر بیچنے کا ارادہ کیا۔کمزور جانوروں کو علیحدہ کر کے منڈی لے جانے لگے تو ٹرمپ نے ہی مشورہ دیا کہ وہ واپسی پر پلاسٹک کے بڑے بڑے کین خرید کر ان میں پانی لے کر آئیں۔پلاسٹک کے کین زیادہ مہنگے نہیں ہوتے ہیں اور ان میں پانی کو پورے سال کے لیے بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ٹوبے میں پانی سورج کی گرمی سے بخارات بن کر اُڑتا ہے تو زمین بھی پانی جذب کر جاتی ہے۔ہمیں پورے ٹوبے کا 20 فیصد ہی پانی ملتا تھا جبکہ باقی سارا ضائع ہو جاتا تھا۔ٹرمپ بزنس مین تھے اور انہوں نے ہی ہمیں مشورہ دیا کہ ہم اگر ایک بار پلاسٹک کے کین خرید لیں اور ان میں پانی سٹور کرنے لگیں تو ہم اسی ٹوبے کا 80 فیصد پانی استعمال کر سکتے ہیں۔

”علی صاحب! خدا نے انسان کو بہت ذہین بنایا ہے۔یہ آج مریخ تک پہنچ چکا ہے اور اس سے بھی آگے جانے کی تیاری کر رہا ہے۔جبکہ آپ لوگ ابھی تک ریگستان میں ہی مر رہے ہو۔امریکہ کے اندر بھی ریگستان ہے۔۔۔آپ کے پاس تو بہت چھوٹا سا ریگستان ہے اور آپ لوگ پانی کے ایک ایک قطرے کے لیے مر رہے ہوتے ہو لیکن امریکہ میں 3 لاکھ مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل ریگستان ہے۔یہ آپ کے پورے ملک کے رقبے سے آدھا ہے۔ہمارے پاس اتنا بڑا ریگستان ہے لیکن وہاں کوئی پیاس سے نہیں مرتا۔یہ آپ لوگ ہی ہو جو آنکھیں بند کر کے کسی مسیحا کا انتظار کرتے رہتے ہو اور خود کچھ نہیں کرتے۔سب کچھ ہی حکومت

نہیں کرتی بلکہ آپ کو خود بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔'' وہ اچھا خاصہ لیکچر دے رہے تھے۔

میں بھی اس دن سافی کے ساتھ ہی شہر گیا اور ہم نے شہر سے کوئی پچاس کے قریب کین خریدے اور اس کے ساتھ ساتھ اتنی ہی تعداد میں پلاسٹک کے بڑے بڑے ڈرم بھی لے لئے۔ پلاسٹک کے کین 25 لیٹر کی گنجائش والے تھے جبکہ ڈرم 200 لیٹر کی گنجائش والے تھے۔شہر میں بلدیہ کی طرف سے پانی سپلائی کیا جاتا تھا۔ یہاں سے پانی کے بڑے بڑے ٹینکر بھر کر آگے روہی لے جائے جاتے تھے تاکہ روہی والوں کی مدد کی جائے۔اس کے علاوہ یہاں سے آگے جانے کے لیے فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی پانی لیتی تھیں۔ یہ صرف ایک حکومتی منصوبہ تھا کیونکہ گورنمنٹ نے فنڈ دیے ہوئے تھے۔سب کچھ ٹھیک ٹھاک حالت میں تھا لیکن کوئی بھی آگے روہی میں پانی لیکر نہیں جاتا تھا۔

ملک کی حالت اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ 90 فیصد سرکاری ملازم بے ایمانی کرتے ہیں۔گورنمنٹ پیسے دیتی ہے اور اس پیسے کو کھانے کے لیے معمولی سے معمولی ملازم سے لیکر اعلیٰ ترین افسر تک سبھی لوگ منہ کھول لیتے ہیں۔ جو جتنے بڑے عہدے پر ہوتا ہے اسے اتنا ہی حصہ ملتا ہے۔ یہاں بھی یہی حالت تھی۔روہی کے لیے فنڈ دینے والا وزیر تک اپنا حصہ کھاتا تھا تو نیچے والوں کو کیسے روک سکتا تھا۔ یہاں سب کچھ موجود تھا۔۔گاڑیاں تھیں، پانی تھا اور ڈرائیور بھی تھے لیکن روہی میں پانی نہیں تھا۔ڈرائیور ہفتے میں ایک چکر لگاتے تھے۔وہ روہی کے اندر جانے کی بجائے پانچ دس کلومیٹر تک ہی جاتے تھے اور ادھر کے لوگوں کو ہی پانی دے کر آجاتے تھے۔جبکہ اصل روہی تو 50 کلومیٹر کے بعد شروع ہوتی تھی جو آگے انڈیا کے بارڈر تک جاتی تھی۔ یہاں پر رینجر کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں ہوتا تھا۔

ہم دونوں فائر بریگیڈ کے دفتر پہنچے اور ان سے پانی مانگا تو وہ ہمیں ایک بہت بڑی پانی کی ٹینکی کے پاس لے آئے۔انہوں نے ایک بڑا پائپ ہمیں پکڑایا جسے لیکر میں ٹرک کے اندر چلا گیا۔انہوں نے پیچھے سے پانی کھولا تو ہم دونوں جلدی جلدی ڈرموں اور کینوں میں پانی بھرنے لگے۔دو گھنٹے لگا کر ہم نے پانی بھرا اور اس دوران تقریباً سارے ہی ملازموں کی گالیاں کھائیں۔وہ ہمیں پانی لینے سے منع نہیں کر سکتے تھے لیکن گالیاں تو بحر حال دے سکتے تھے۔ہم نے انہیں دفتر کے ٹھنڈے ماحول سے اُٹھایا تھا اور باہر گرمی میں لے کے آئے تھے۔اب وہ ہمیں جلدی سے ختم کرنے کا کہہ رہے تھے۔دو گھنٹے تک ہم نے پانی بھر لیا تو ہم نے رسیوں کی مدد سے مضبوطی سے ڈرموں کو باندھا اور آہستہ آہستہ گھر جانے لگے۔ہم صبح صبح روہی سے چلے تھے اور شام

ہونے سے پہلے پہلے ہم نے سارا کام ختم کر کے واپس پہنچ گئے۔

گاؤں والے پانی دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئے۔ ہم نے سبھی گھروں کو تین تین ڈرم اور تین تین کین دیئے اور باقی بچ جانے والے کین ہم نے رکھ لیے۔ دوسرے دن سافی پھر شہر گیا اور اس بار کھانے پینے کا سامان لیکر آ گیا۔ ہمارے گاؤں میں بارش سے پہلے ہی بہار آ گئی تھی۔ ہم نے سب سے پہلے جانوروں کو تھوڑا تھوڑا پانی پلایا اور پھر خود بھی پانی سے سیراب ہو گئے۔ پہلی بارش اگست کا مہینہ نکالنے کے بعد ستمبر کے دوسرے ہفتے میں جا کر ہوئی۔ تب تک ہم دو دو ڈرم خالی کر چکے تھے۔ بارش سے ہم نے وہ ڈرم دوبارہ بھر کر سٹور کر لئے۔ ٹوبہ بارش کے پانی سے فل ہو چکا تھا۔ اب ہم ٹوبے سے ہی پانی نکال کر استعمال کر سکتے تھے۔

سافی بارش سے اگلے ہی دن پھر شہر چلا گیا تھا اور مزید 50 ڈرم لیکر آ گیا تھا۔ اب ہمارے پاس 100 ڈرم ہو گئے تھے جن کے پانی سے ہم چھ مہینے نکال سکتے تھے۔ اب چھ مہینے ہم ٹوبے کا پانی استعمال کرتے اور اگلے چھ مہینے ڈرموں میں سٹور کیا ہوا پانی استعمال کرتے۔ ٹرمپ کو ہمارے ساتھ رہتے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ نومبر کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ گرمی کا زور ختم ہو گیا اور ہلکی ہلکی سردی شروع ہو گئی تھی۔ انہوں نے ہمارے معاشرے کو قبول کر لیا تھا۔ یہ سب کچھ عریج کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا۔ اس کے دوستانہ لہجے نے انہیں گاؤں والوں سے محبت کرنا سکھا دیا تھا۔

گاؤں کے لوگ بھی اب ٹرمپ کے دوست بن گئے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی مونچھیں گاؤں والوں کی طرف بڑھا لیں تھیں اور وہ بھی اب ایک لمبی سی پگڑی سر پر پہننے لگے تھے۔ اب صرف ان کا سفید رنگ ہی انہیں ہم لوگوں سے جدا کرتا تھا۔ باقی ان کا حلیہ بالکل روہیلوں (روہی میں بسنے والے باشندوں کو روہیلے کہا جاتا ہے) جیسا ہو گیا تھا۔ عریج چوبیس گھنٹے ان کے ساتھ چپکی رہتی تھی اور ان سے امریکہ کی کہانیاں سنتی رہتی تھی۔ اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ عریج کو امریکہ اور امریکہ میں بسنے والے لوگ اچھے لگنے لگے تھے۔ جبکہ ٹرمپ کو روہی میں بستے لوگ اچھے لگنے لگے تھے۔ اب انہیں اتنی زبان آ گئی تھی کہ وہ ہماری مدد کے بغیر گاؤں کے کسی بھی فرد سے بات کر سکتے تھے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی سرائیکی میں لوگوں سے بات کر سکتے تھے۔ پورے گاؤں والے ان کی زبان کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ دوسری طرف برما کا معاملہ مکمل طور پر حل ہو چکا تھا۔

صومالیہ میں ابھی تک معاملات جوں کے توں ہی چل رہے تھے۔ صومالیہ میں امریکہ، روس اور چین تینوں ملک کام کر رہے تھے اور تینوں ہی صومالیہ کا الحاق اپنے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ جرمنی اور کینڈا ابھی یہی

چاہتے تھے لیکن طاقت کی دوڑ میں وہ بہت پیچھے تھے۔ سعودی عرب کو پیشکش کی گئی تھی لیکن سعودی عرب نے انکار کر دیا تھا۔ اسے صومالیہ کے معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ افغانستان کے معاملے میں پاکستان کی پالیسی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان امریکہ کا ہر قسم کا دباؤ برداشت کر گیا تھا لیکن اپنی فوج کو افغانستان میں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ کراچی اور سندھ میں اسلحہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ سندھ کے کچے کا علاقہ بھی اسلحے سے پاک ہو گیا تھا اور سندھ کے حالات بالکل ٹھیک ہو گئے تھے۔

آرمی اب پنجاب میں آپریشن کر رہی تھی اور یہاں سے اسلحہ اٹھا کر لیا گیا تھا۔ اب فورسز اسلحے کی تلاش کے لیے دیہاتوں میں چھاپے مار رہی تھیں۔ KPK اور گلگت میں ابھی اسلحہ پر پابندی نہیں لگی تھی لیکن اسلحے کی تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اسلحے کی خرید وفروخت ختم ہو گئی تھی۔ حکومت پنجاب سے فارغ ہونے کے بعد اس طرف رخ کرتی۔ سب سے آخری نمبر بلوچستان کا تھا۔ امریکہ اور نیٹو کے فوجی افسران سندھ اور کراچی کے دورے کر رہے تھے اور یہاں کا اسلحہ فری علاقہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر میں پاکستان آرمی کے طریقہ کار پر لگی ہوئی تھیں اور وہ بھی افغانستان میں آپریشن شروع کر چکے تھے۔ پاکستان نے افغانستان کی بجائے شام میں فوج بھیجنے کی حامی بھر لی تھی۔

CIA والے یورپ میں موجود چاروں ٹرکوں تک پہنچ چکے تھے۔ سب سے پہلے طلحہ پکڑا گیا تھا۔ طلحہ کی ویڈیو فوٹیج انہوں نے میلان سے حاصل کر لی تھی۔ فٹ بال کے میچ میں بہت سے لڑکے موبائل سے ویڈیو بنا رہے تھے۔ انہی میں سے ایک لڑکے کی ویڈیو میں طلحہ کو سوئی مارتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا اور وہاں سے طلحہ کو تلاش کرنے لگے۔ پانچویں مہینے میں جا کر وہ طلحہ کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر ایک مہینے کے اندر اندر ہی وہ یورپ میں چاروں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسد پاکستان میں ہی تھا اور اس کے رابطے چاروں سے تھے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو فون کیا کرتے تھے۔ CIA والے فون کے ذریعے اسد تک پہنچ گئے لیکن اسد ان کو داؤ دے کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے موبائل اور شناختی کاغذات وہیں پھینکے اور راولپنڈی سے لاہور چلا گیا۔

لاہور میں میں نے اسد کے لیے جعلی نام سے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بنوایا تھا اور اسی پاسپورٹ پر بحریہ ٹاؤن میں ایک دو کمروں کا مکان بھی خرید لیا تھا۔ یہ میں نے ایمرجنسی کے لیے رکھا تھا اور اس کا میرے اور اسد کے علاوہ اور کسی کو بھی پتہ نہیں تھا۔ اسد بھاگ کر لاہور آ گیا اور اس مکان میں رہنے لگا۔ اس نے ایک

بارہی اکٹھا کھانے پینے کا سامان خریدا اور مکان کے اندر بیٹھ گیا۔CIA والے آگے بڑھتے بڑھتے ایک بار پھر بند گلی میں پہنچ گئے۔ انہیں مزید آگے بڑھنے کے لیے کوئی اور راستہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ آہستہ آہستہ سردیاں بھی گزر گئیں اور بہار کا موسم آگیا۔ مارچ کا پہلا ہفتہ آیا تو اس وقت تک صدر ٹرمپ کو ہمارے پاس آئے ہوئے 8 مہینے ہو گئے تھے۔ ان آٹھ مہینوں میں اب وہ ہماری زبان پوری طرح سمجھ گئے تھے۔ وہ انگلش لہجے میں سرائیکی بولنے لگے تھے۔ میرے چاروں مطالبات کے اندر چھپے ہوئے تمام رازوں کو جان گئے تھے۔ ون ورلڈ کے نظریے کو وہ بھی دل سے مان گئے تھے۔ بہار کے موسم میں روہی میں بھی بہار آجاتی ہے۔ صبح کو اوس پڑتی ہے اور اس سے روہی میں پھول کھلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم تینوں شام کے وقت کھانا کھا کر تالاب کے کنارے آکر بیٹھ گئے۔

''سرجی! آپ کا ایک سال اب پورا ہونے والا ہے، پھر آپ واپس اپنے ملک چلے جاؤ گے۔'' میں نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''انکل! آپ ہم سب کو چھوڑ کر چلیں جائیں گے؟'' عریج بھی ان کی دوسری طرف بیٹھ گئی۔

''ہاں بیٹا! جانا تو پڑے گا، اگر میں یہاں سے واپس امریکہ نہیں جاؤں گا تو اس دنیا کو ختم ہونے سے کیسے بچاؤں گا؟'' انہوں نے عریج کو اپنے نزدیک کرتے ہوئے کہا۔

''جی انکل! بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے۔۔۔آپ کو واپس تو جانا ہی ہوگا لیکن میں آپ کے بغیر بہت اداس ہو جاؤں گی، مجھے آپ کی صورت میں اپنے ابو نظر آتے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں اچانک پانی آگیا۔

''اوئے نہیں! رونا مت، تم بہت پیاری ہو۔۔۔ میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گا۔'' انہوں نے عریج کو رونے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

''سرجی! میں سوچ رہا ہوں کہ اگلے مہینے ہی آپ کو واپس چھوڑ آؤں۔۔۔تالاب میں پانی ختم ہو گیا ہے اور اگلے مہینے سے خشک سالی شروع ہو جائے گی، میں اس بار آپ کو پریشان نہیں ہونے دوں گا۔۔۔گرمی بھی بہت بڑھ جائے گی۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! میں اب بہت مضبوط ہو گیا ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے میں ایک دن میں دس دس قسم کی گولیاں کھاتا تھا اور اب دیکھ لو کوئی بھی گولی یا دوائی نہیں کھاتا اور میری صحت بھی بہت اچھی ہو گئی ہے۔ میں

اپنے آپ کو چالیس سال کا محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں اس خشک سالی اور گرمی کو دیکھ کر ہی جاؤں گا، ویسے بھی اب امریکی تو مجھے بھول ہی گئے ہوں گے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"واقعی! امریکی میڈیا اور پوری دنیا کے میڈیا سے ان کا ذکر بالکل ختم ہو گیا تھا۔کبھی کبھی کوئی ایک آدھ خبر لگ جاتی تھی۔ باقی مزید کچھ بھی نہیں تھا لیکن صرف CIA اور FBI پوری جانفشانی سے انہیں ڈھونڈنے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اب بھی انہیں تلاش کر رہے تھے۔

"نہیں سر! میرے خیال میں اب بہت ہو گیا ہے، میں اگلے مہینے ہی آپ کو واپس آپ کی ایمبیسی چھوڑ آؤں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"علی بھائی! ایک کی بجائے دو مہینے تو کرلو، ابھی تو گرمی آنے میں پورے دو مہینے باقی ہیں۔" عریج نے جلدی سے کہا۔

"نہیں عریج! بہت دیر ہوگئی ہے، اب انہیں جلد سے جلد گھر واپس جانا چاہیے۔ان کی امریکہ میں ایک بیوی ہے اور بچے بھی ہیں اور وہ بھی تو ان کو یاد کر رہے ہوں گے۔۔۔ جب ہمارا کام ہو گیا ہے تو پھر ہم انہیں یہاں کیوں رکھیں؟" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی! جیسے آپ کہتے ہو۔کیا ہم ان سے ملنے کے لیے ان کے پیچھے امریکہ جا سکتے ہیں؟" وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں ہاں! کیوں نہیں، تم جب مرضی امریکہ آ جاؤ مجھے خوشی ہوگی۔ جب تم لوگ امریکہ میں مجھے ملنے آؤ گے تو میں بھی تم سے ملنے کے لیے یہاں آیا کروں گا اور اپنے بیٹے کو بھی لیکر آؤں گا۔ وہ بھی تم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوگا۔" انہوں نے جلدی سے جواب دیا۔

"علی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں عریج کو بھی ساتھ لے جاؤں، وہ ادھر امریکہ میں میرے ساتھ دو تین مہینے رہے گی اور پھر واپس آ جائے گی؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں سر! یہ ممکن نہیں ہوگا۔۔۔آپ ایک بار امریکہ چلے جائیں تو پھر دو تین مہینے کے بعد میں اسے بھی آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ ویزا تو آپ دلوا ہی دو گے نا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں یار! ایک ویزے کی کیا بات کرتے ہو، میں سب کے لیے ویزا بنوا دوں گا اور سب کو ہی یہاں سے لے جاؤں گا۔تم سب ادھر میرے پاس رہنا!" وہ پر جوش انداز میں بولے۔

''نہیں سر! ہم میں سے کوئی بھی امریکہ نہیں جائے گا۔ ہم یہیں اسی ملک میں رہیں گے اور اسی ملک کی مٹی کو سونا بنائیں گے۔ عریج کا شوق ہے امریکہ دیکھنے کا۔۔۔ آپ صرف اسی کا ویزا بنوا دینا!'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''علی صاحب! عریج میری بیٹی ہے اور بیٹیوں کیلئے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ محبت ہی سب سے بڑا ویزہ ہوتی ہے اور مجھے اس لڑکی سے بہت محبت ہے۔'' ان کی آواز میں محبت جھلک رہی تھی۔

''اچھا انکل! کتنی محبت ہے آپ کے دل میں؟'' عریج نے ان کی گردن سے جھولتے ہوئے کہا۔

''عریج بیٹا! اس محبت کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ یہ جو روہی دیکھ رہی ہو، اس روہی میں جتنی ریت ہے اور اس ریت میں جتنے ذرے ہیں، میں ان ذروں سے بھی زیادہ آپ لوگوں سے محبت کرتا ہوں۔ میں پیدا تو امریکہ میں ہوا ہوں، صدر بھی اسی ملک کا ہوں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے یہ روہی ہی میرا وطن ہو۔ ایسے لگتا ہے جیسے میں امریکی ٹرمپ نہیں راجھستانی ٹرمپ ہوں۔'' وہ خاموشی سے اٹھے اور اندر کمرے میں چلے گئے۔

اگلے ہفتے سافی بھیڑوں کو لیکر بہاول پور شہر گیا اور پکڑا گیا۔ CIA والے اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسد کو بھی پکڑ لیا تھا۔ اسد بہت مضبوط نوجوان تھا لیکن CIA کی مار کے آگے نہ ٹھہر سکا۔ CIA والوں نے اس پر بہت تشدد کیا۔ CIA کے تشدد نے اسے منہ کھولنے پر مجبور کر دیا اور اس نے ان کو بتا دیا کہ وہ مجھے کیسے جانتا تھا۔ جب میں ملٹری ہسپتال میں تھا، مجھے طالبان نے گولیاں ماری تھیں اور میں نیم جان ملٹری ہسپتال میں تھا تو وہیں اسد کی مجھ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسے وانا میں ہونے والی سزا کا پتہ چل گیا تھا اور وہ میری بہادری سے متاثر ہو کر مجھے اپنے ساتھ ملانے آیا تھا۔

ان پانچوں لڑکوں میں سے صرف اسد ہی مجھے جانتا تھا جبکہ باقی کسی کو بھی میرے ماضی کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اسد نے تشدد سے مجبور ہو کر وانا آپریشن کا بتایا تو CIA والوں کو اس سے آگے بڑھنے سے کوئی نہ روک سکا۔ انہوں نے ملٹری ہسپتال سے میری پوری تفصیلات نکال لیں۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں بہاولپور سے ہوں تو انہوں نے اسد کو ہلاک کر دیا۔ تشدد کی وجہ سے اسد بے کار ہو چکا تھا اور وہ اسے عدالت میں لے کر نہیں جا سکتے تھے۔ عدالت تشدد کا پوچھتی تو CIA کی بدنامی ہوتی، اس لیے انہوں نے اسے وہیں مار دیا۔ میرے باقی ساتھی جو کہ یورپ میں پکڑے گئے تھے انہیں بھی CIA والوں نے مار دیا تھا۔ شاید دنیا کی تقریباً ساری ہی خفیہ ایجنسیاں ایسے ہی کام کرتی ہیں۔ عدالتوں میں صرف وہی کیس آتے ہیں جو ملکی لیول کے

ہوتے ہیں اور جن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ انٹرنیشنل جرائم میں ہمیشہ ایجنسیاں عدالتوں کے چکروں میں پڑنے کی بجائے ایجنٹوں کو ماورائے عدالت ہی مار دیتی ہیں۔ عدالتوں کو جرم ثابت کرنے کے لیے ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ ایسے دہشت گردی کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

CIA والے بہاولپور آ گئے اور وہاں انہوں نے نمبردار کو پکڑ لیا۔ یہ وہی نمبردار تھا جن کے کھیتوں میں میرے والد کام کرتے تھے۔ میں ابو کی موت کے بعد کبھی اس گاؤں میں گیا ہی نہیں تھا۔ CIA نے میرے سکول کا ریکارڈ نکالا اور وہاں سے ایک ایک لڑکے سے پوچھ گچھ کرتے کرتے وہ آخر کار سافی تک پہنچ گئے۔ انہیں روہی میں سافی کے گاؤں کا نہیں پتہ تھا اس لیے وہ بہاولپور میں ہی اس کا انتظار کرنے لگے۔ جیسے ہی سافی بہاولپور پہنچا، پکڑا گیا۔ ساقی زیادہ سخت جان ثابت نہ ہوا، CIA کے ایک گھنٹے کے تشدد نے ہی اسے سب کچھ بتانے پر مجبور کر دیا اور وہ انہیں لے کر روہی کی طرف چل پڑا۔ امریکی سیٹلائٹ روہی کے ایک ایک چپے کو سرچ کرنے لگی۔

سافی کے ٹرک کے ساتھ پاکستان آرمی کا ایک دستہ بھی روہی میں آیا جس میں 50 کے قریب سپاہی اور 20 گاڑیاں تھیں، اس کے علاوہ پانچ ڈرون طیارے بھی تھے۔ ٹرک کو CIA کا ایک ایجنٹ چلا رہا تھا اور سافی اسے راستہ بتا رہا تھا۔ ٹرک میں CIA کے پانچ ایجنٹ بیٹھے ہوئے تھے جبکہ پیچھے مزید پانچ کمانڈوز دو گاڑیوں میں آ رہے تھے۔ پاکستان آرمی کے بھی سبھی کمانڈوز ہی تھے جو سپیشل سروسز گروپ (SSG) سے تھے۔ جیسے ہی ٹرک گاؤں کے نزدیک پہنچا وہ ابھی دس کلومیٹر گاؤں سے دور ہی تھا جب ایک امریکی سیٹلائٹ کو گاؤں نظر آ گیا۔ میں اور صدر صاحب گھر کے باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ امریکی سیٹلائٹ نے فوکس کیا تو انہیں صدر ٹرمپ نظر آ گئے۔ انہوں نے فوراً ہی پیچھے CIA کو اطلاع دی اور ڈرون تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ انہوں نے صدر کی حفاظت کو پہلے یقینی بنانا تھا۔ ہم دونوں اس چیز سے بے خبر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

''سر! مجھے آپ کو اس دفعہ ہی بھیج دینا چاہیے تھا، ہم دونوں سافی کے ساتھ ہی چلے جاتے اور میں آپ کو اسلام آباد ایمبیسی چھوڑ آتا۔ ایسے ہی ایک مہینہ اور رکے رہے ہیں۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں یار! اگلے مہینے چلا جاؤں گا، مجھے زیادہ جلدی نہیں ہے۔'' انہوں نے لاپرواہی سے

کہا۔

''نہیں سر! اچھا ہوتا کہ آپ واپس چلے جاتے، پتہ نہیں کیوں اب میرا دل بہت گھبرانے لگا ہے۔ آپ کی حفاظت بہت ضروری ہے، خدانخواستہ اگر کسی دشمن کو آپ کی خبر لگ گئی تو سب کچھ ہی ختم ہو جائے گا۔'' میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں، یہاں کس نے آنا ہے؟ چاروں طرف ریت ہی ریت ہے۔۔۔ اس ریت کو پار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔'' انہوں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو انہیں فضا میں ڈرون نظر آ گیا۔

''اوہ! یہ تو ڈرون ہے۔۔۔'' وہ ابھی اتنا ہی کہہ سکے تھے کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور میرے بازو کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ CIA والوں نے ہمیں تلاش کر لیا تھا۔ میں گولی کے زور سے پلٹ کر گرا اور فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ میں ڈونلڈ ٹرمپ سے دور ہو کر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اوپر سے اس وجہ سے ہٹ کر رہے تھے کہ میں ان کیساتھ کھڑا تھا۔ وہ مجھے مار کر صدر کو محفوظ کر کے آپریشن شروع کرنا چاہتے تھے۔ میں دوسری طرف بھاگنے لگا لیکن صدر ٹرمپ نے میری ٹانگ پکڑ کر مجھے زمین پر گرایا اور فوراً میرے اوپر لیٹ گئے۔

''سر! آپ دور ہو جائیں!'' میں نے چیختے ہوئے کہا۔

''نہیں! تم خاموشی سے میرے نیچے لیٹے رہو، اوپر ڈرون کھڑا ہے۔۔۔ تم ایک انچ بھی اپنی جگہ سے باہر ہوئے تو مارے جاؤ گے۔ اب بھاگ کہ تم نہیں جا سکتے، آرام سے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو! میں تم کو بچا لوں گا۔'' وہ چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔

''نہیں سر! آپ کے ساتھ جڑے ہونے کی وجہ سے وہ مجھے آپ کے لیے خطرہ سمجھیں گے۔'' میں انکے نیچے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پانچوں ڈرون طیارے بالکل نیچے آ گئے تھے اور وہ ہمارے اوپر چکر لگا رہے تھے۔

''علی! خدا کے لیے آرام سے لیٹے رہو، جب تک میں تمہارے اوپر ہوں وہ تمہیں فائر نہیں مار سکتے۔ آرمی والے پیچھے ہی ہوں گے، تب تک تم میرے نیچے ہی رہو۔'' وہ مجھے نیچے سے نکلنے نہیں دے رہے تھے۔

''ٹھیک ہے سر! میں آرام سے لیٹا رہتا ہوں۔'' میں نے آہستگی سے کہا اور سمٹ کر لیٹ گیا۔ میں نے اپنے بازو اور ٹانگیں سمیٹ لیں تھیں تاکہ اوپر سے وہ میرے اوپر صحیح لیٹ سکیں۔ میرے جسم کا

کوئی بھی خالی حصہ ڈرون کو نظر آ جاتا تو وہ فائر کر دیتا۔ میں سمٹ کر لیٹا تو وہ سیدھا میرے اوپر لیٹ گئے۔ انھوں نے منہ آسمان کی طرف کر لیا اور ہاتھوں کے اشارے سے ڈرون کو دور جانے کا اشارہ کرنے لگے۔ اسی وقت شور سن کر عریج بھی جھونپڑی سے باہر آ گئی۔

''عریج اندر جاؤ! باہر خطرہ ہے۔'' صدر ٹرمپ نے چیختے ہوئے کہا۔

عریج کو بات سمجھنے میں بہت دیر ہو گئی، ڈرون نے ایک برسٹ فائر کیا جو اس کی ٹانگوں میں لگا اور وہ فوراً زمین پر گر گئی۔ اسی وقت سافی کا ٹرک سامنے آ کر رکا اور سافی دروازہ کھول کر ہماری طرف بھاگا۔ وہ ابھی دو تین قدم ہی ہماری طرف اٹھا سکا تھا جب ایک ڈرون کے برسٹ نے اسے وہیں زمین پر گرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے جسم میں ایک ساتھ کم از کم 10 گولیاں داخل ہوئیں اور اس بیچارے کو دوسرا سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوا۔ مجھے اس کی بجائے عریج کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ عریج سافی کے بالکل سامنے کھڑی ہوئی تھی اور اس نے سافی کو گولیاں لگتے اور نیچے زمین پر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ روہی کی ریت اس کے خون سے سرخ ہو گئی تھی۔ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی فائرنگ کی آواز سن کر گھروں سے باہر آئے اور پھر ہمیں دیکھ کر ہماری طرف بڑھے لیکن اس بار امریکی CIA کے کمانڈوز نے فائرنگ شروع کر دی اور ہماری طرف بڑھنے والے پہلے چار آدمی زمین پر گر کر تڑپنے لگے۔ باقی لوگ ابھی پیچھے تھے، انھوں نے پہلے چار لوگوں کو گرتے ہوئے دیکھا تو وہ فوراً واپس بھاگنے لگے۔ اب کی بار کسی نے بھی فائرنگ نہ کی، وہ صرف لوگوں کو صدر کے نزدیک آنے سے روک رہے تھے۔ اس وقت جو بھی صدر ٹرمپ کے نزدیک آنے کی کوشش کرتا وہ اسے بلا دریغ گولی مار دیتے۔

''اوئے فائرنگ بند کرو! یہ سب میرے دوست ہیں۔'' صدر ٹرمپ نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

''سر! انگلش میں بات کرو!'' وہ سرائیکی نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ گھبراہٹ کی وجہ سے انگلش کی بجائے سرائیکی میں کہہ رہے تھے جبکہ آگے CIA والوں کو سرائیکی کی بجائے صرف انگلش آتی تھی۔

''فائرنگ بند کرو، یہ میرا حکم ہے! یہ سب میرے دوست ہیں۔'' اس بار انھوں نے انگلش میں چیختے ہوئے کہا۔ پوری فورس نے پوزیشن لے لی تھی۔

''سر کیا آپ ٹھیک ہیں؟'' ایک اہلکار کی آواز سنائی دی۔

''ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔تم میں سے کوئی بھی اب گولی نہیں چلائے گا۔ یہ سب نہتے ہیں اور

میرے دوست ہیں۔'' ٹرمپ نے واپسی جواب دیا۔

''ٹھیک ہے سر! آپ آرام سے اٹھ جائیں اور ہماری طرف آئیں۔'' اہلکاروں نے ابھی تک پوزیشن لی ہوئی تھی۔

''نہیں! تم میں سے ایک آدمی پہلے یہاں آئے اور اسے اپنی حفاظتی تحویل میں لے، یہ میرا دوست ہے اور میں اسے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم میں سے کوئی بھی اب گولی نہیں چلائے گا۔'' وہ ابھی تک میرے اوپر لیٹے ہوئے تھے۔ دوسری طرف سے ایک CIA اہلکار آگے آیا تو انہوں نے مجھے اس کے حوالے کیا اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پوری فورس نے صدر کو سلیوٹ کیا۔

''سر! آپ خیریت سے تو ہیں نا؟'' ایک سینئر اہلکار نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے مختصر جواب دیا اور تیزی سے عریج کی طرف بڑھ گئے۔

''عریج بیٹا! تم ٹھیک تو ہونا؟'' انہوں نے عریج کا سر اٹھا کر اسے اپنی گود میں رکھ لیا۔

''جی انکل! میں ٹھیک ہوں، آپ سافی بھائی کو دیکھیں۔۔۔ انہوں نے سافی بھائی کو مار دیا ہے۔'' عریج نے روتے ہوئے کہا۔

''کوئی میڈیکل کی ٹیم ہے؟'' وہ عریج کے زخموں کو دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ آرمی کے دستے کے ساتھ ایک ڈاکٹر اور دو نرس بھی ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر میری اور عریج کی مرہم پٹی کی۔ سافی اور دوسرے چاروں لوگ مارے جا چکے تھے۔ انہیں کسی بھی میڈیکل ہیلپ کی ضرورت نہیں تھی۔ فورس کے پیچھے پیچھے دو ہیلی کاپٹر بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے ہم سب کو اس میں سوار کرایا اور اسلام آباد آ گئے۔ صدر کا خصوصی طیارہ ایئر فورس ون وہاں پہنچ چکا تھا۔ ہمارے اسلام آباد پہنچتے ہی انہوں نے ہمیں طیارے میں سوار کرایا اور ہم سب بغیر ویزے کے امریکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمارے پیچھے آرمی والوں نے سارے گاؤں والوں کو گرفتار کر لیا لیکن چونکہ وہ سب امریکی صدر سے ناواقف تھے اور امریکی صدر نے بھی ان کی بے گناہی کا اقرار کیا تو پاکستان گورنمنٹ نے انہیں ایک ہفتے بعد ہی بے گناہ قرار دے کر چھوڑ دیا۔ امریکی صدر دوبارہ منصب صدارت پر فائز ہو گئے۔ انہوں نے امریکی عدالت میں ہم دونوں کو معاف کر دینے کی درخواست کی۔ وہ سارا جرم مرنے والے سافی پر ڈال رہے تھے تاکہ میں اور عریج دونوں چھوٹ جائیں لیکن CIA کی رپورٹوں نے مجھے مجرم ثابت کر دیا۔ عریج بھی اس معاملے میں بے قصور ثابت ہوئی

اور اسے رہا کر دیا گیا۔ جبکہ مجھے صدر کو اغوا کرنے اور افغانستان میں امریکہ اور نیٹو افواج پر حملہ کرنے اور انہیں مارنے کے جرم میں 36 سال کی سزا ہوئی۔ خصوصی عدالت سے میرے واشنگٹن ڈی سی کی سنٹرل جیل میں منتقلی کے آرڈر ملے جبکہ عریج وائٹ ہاؤس چلی گئی۔ صدر ٹرمپ نے اسے قانونی طور پر (Adapt) اڈاپٹ کرلیا۔ اب وہ قانونی طور پر ان کی بیٹی تھی اور اسے امریکی پاسپورٹ بھی مل گیا۔ مجھے جیل میں آئے ہوئے ایک مہینہ ہوگیا تھا جب اچانک وہ اور عریج مجھے ملنے جیل آ گئے۔

''سر آپ کو ادھر نہیں آنا چاہیے تھا، میڈیا والے آپ کے بارے میں غلط خبریں شائع کریں گے۔'' میں نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے علی! مجھے میڈیا سے ڈر نہیں لگتا، تم دونوں میرے بچے ہو اور دنیا کا کوئی بھی قانون بچوں سے ملنے پر پابندی نہیں لگاتا۔ میں ہر مہینے تم سے ملنے آتا رہوں گا۔

''جی بھائی! ہم سب آپ سے ملنے آتے رہیں گے۔'' اس بار اس کے بیٹے نے جواب دیا۔ وہ بھی عریج کے ساتھ ہی آیا ہوا تھا۔ ہم سب کوئی آدھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد وہ واپس جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

''علی! تمہاری قربانیاں ضائع نہیں جائیں گی۔ یہ جو تم 36 سال کی سزا کاٹ رہے ہو، یہ بھی ضائع نہیں جائے گی۔ جب تم 36 سال کے بعد رہا ہو کر باہر آؤ گے تو امریکہ کا رقبہ 98 لاکھ مربع کلومیٹر سے بڑھ کر 5 کروڑ مربع کلومیٹر تک چلا جائے گا۔ دنیا 208 ممالک سے کم ہو کر چالیس پچاس ممالک تک ہی رہ جائے گی۔ پاسپورٹ اور ویزہ بھی ختم ہو جائے گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔۔۔ یہ ڈونلڈ ٹرمپ کا وعدہ ہے۔ ایک سرائیکی ٹرمپ کا وعدہ ہے۔ اس بار وہ سرائیکی میں بولے تھے۔ ''سرائیکی ٹرمپ'' ان کے دو الفاظ نے مجھے میری زندگی کا مقصد سمجھا دیا تھا۔

ختم شد